# بلونت سنگھ

کے

## شاہکار افسانے

بلونت سنگھ

# بلونت سنگھ
# کے
# شاہکار افسانے

گوشہ ادب

جناح روڈ۔کوئٹہ (پاکستان)

فون:92-081-843229 فیکس:92-081-837672

E-mail- goshaeadab@yahoo.com

goshaeadab@hotmail.com

یہ کتاب 2000ء میں

**گوشہء ادب**۔کوئٹہ

سے شائع کی گئی

اہتمام۔منصور بخاری

# فہرست



## افسانے

# سوانحی خاکہ

بلونت سنگھ جون ۱۹۲۱ء میں چک بہلول ضلع گوجرانولہ (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم وہیں گاؤں کے کریسنٹ پریپریٹری اسکول میں ہوئی۔ ان کے والد سردار لال سنگھ دہرہ دون کے ملٹری کالج میں لکچرر تھے، کچھ برسوں کے بعد بلونت سنگھ ان کے پاس چلے گئے اور وہیں کیمبرج پریپریٹری اسکول دہرہ دون سے انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بلونت سنگھ نے انٹرمیڈیٹ جمنا کرسچین کالج الٰہ آباد سے کیا، اور ۱۹۴۲ء میں بی۔اے۔ کی ڈگری الہ آباد یونی ورسٹی سے حاصل کی۔ بی۔اے۔ کرنے کے بعد وہ کچھ مدت لاہور میں رہے، جہاں مولانا صلاح الدین احمد، راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر سے ان کی ملاقاتیں رہیں۔ اسکول کے زمانے ہی سے بلونت سنگھ نے لکھنا شروع کر دیا تھا، لیکن "ساقی دہلی" میں پہلا افسانہ "سزا" شائع ہوتے ہی ادبی حلقوں میں مشہور ہو گئے، اور اس کے بعد باقاعدگی سے لکھنے لگے۔ ان کے افسانوں کے پہلے مجموعے لاہور سے شائع ہوئے، تقسیم سے پہلے ہی وہ اردو کے ایک اہم افسانہ نگار کی حیثیت سے نمایاں ہو چکے تھے۔

آزادی کے بعد جولائی ۱۹۴۸ء میں بلونت سنگھ پبلی کیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات و نشریات، حکومت ہند کے رسائل "آجکل"، "بساطِ عالم" اور "نونہال" کے ادارتی عملے سے وابستہ ہو گئے، لیکن یہ ملازمت ڈھائی سال کے بعد جنوری ۱۹۵۰ء میں ختم ہو گئی جس کا دلچسپ احوال بلونت سنگھ نے اپنے رپورتاژ "عہدِ نو میں ملازمت کے تیس مہینے" میں قلم بند کیا ہے۔ اسی زمانے میں ان کے

والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد وہ مستقل طور پر الہ آباد منتقل ہو گئے اور میر گنج میں طوائفوں کے چوبارے کے سامنے والد کے قائم کردہ "امپیریل ہوٹل" چوک الہ آباد کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ مگر ان کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گزرتا تھا، اور وہ ہوٹل کو اتنی توجہ نہ دے سکے جس کی ضرورت تھی۔ نتیجتاً چند برس کے اندر انھوں نے ہوٹل فروخت کر دیا اور نیتاجی نگر میں اپنی والدہ کے ساتھ رہنے لگے۔ جس زمانے میں انھوں نے ہوٹل کا کام شروع کیا، ان کی پہلی شادی ہوئی، کچھ مدت تک وہ اسے نبھاتے رہے، بالآخر طلاق ہو گئی۔ تقریباً بیس اکیس برس بعد انھوں نے دوسری شادی اپنی پسند سے کی۔ ان سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔ بیوی ایک مقامی کالج میں پڑھاتی ہیں۔

بلونت سنگھ بچپن ہی سے سیر و تفریح اور آوارہ گردی کے لیے مشہور تھے۔ گھر سے کئی مرتبہ بھاگے اور پکڑ کر پھر اسکول میں بٹھائے گئے۔ موسیقی اور مصوری سے بھی لگاؤ تھا۔ بانسری خوب بجاتے تھے۔ نہایت بذلہ سنج، خوش مزاج اور خوش باش شخص تھے۔ الہ آباد میں ان کا شروع کا زمانہ جب وہ کئی عمدہ کہانیاں اور ناول لکھ چکے تھے، بہت ٹھاٹھ باٹ کا زمانہ تھا۔ اوپیندر ناتھ اشک نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ بلونت سنگھ خاصے خود پسند اور سناب تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ بظاہر ہنسی مذاق کرتے اور سوقیانہ لطیفے سناتے، لیکن اصلاً وہ انٹی سوشل تھے، لوگوں سے بہت کم ملتے جلتے تھے۔ "وہ منجھلے قد اور دوہرے جسم کے گورے چٹے، تندرست و توانا، بے حد خوبصورت انسان تھے۔ اکیلے پکچر دیکھتے، اور تو اور سول لائنز کے کافی ہاؤس میں اکیلے کافی پیتے تھے۔ صبح کو بغیر پوری طرح سجے دھجے وہ کسی سے نہیں ملتے تھے۔ جن دنوں ہوٹل چلاتے تھے، انھوں نے ایک بڑا السیشین کتا پال رکھا تھا۔ باہر نکلتے تو پورے رکشا پر اپنے تنومند جسم کے ساتھ پھیل کر بیٹھتے اور پیروں میں السیشین کتا لیٹا رہتا۔ سول لائنز اور گرد و نواح کے علاقے میں وہ رکشا پر اسی شان سے آتے جاتے نظر آ جاتے تھے۔"

بلونت سنگھ بڑے سے بڑے اعزاز کے مستحق تھے، لیکن ان کی زندگی میں صرف تین ایوارڈ انھیں ملے، اتر پردیش سرکار کا ادبی ایوارڈ، بھاشا وبھاگ حکومت پنجاب کا ادبی ایوارڈ اور پنجاب ہی سے شرومنی ساہتیہ کار ایوارڈ۔

دوسری شادی کے بعد بلونت سنگھ کو زندگی کی زیادہ بہاریں دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ غالباً انھیں انتڑیوں کی تکلیف تھی جو کینسر میں بدل گئی۔ رفتہ رفتہ نحیف و نزار ہو کر وہ اپنی اصل کا نقش موہوم رہ گئے۔ شکر کی تکلیف پہلے سے رہی ہو گی۔ اس کا اثر آنکھوں پر ہوا اور بینائی تقریباً زائل ہو گئی۔ آخر میں

انھوں نے سر کے بال کٹوادیے اور داڑھی بھی ترشوادی۔ ۲۷ مئی ۱۹۸۶ء کو الہ آباد میں انتقال ہوا۔
اگلے دن جب ارتھی اٹھائی گئی تو اردو، ہندی کے ادیبوں میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا، اور نہ ہی کسی اخبار رسالے نے بلونت سنگھ کی موت کی خبر نمایاں طور پر شائع کی۔
اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں مجموعی طور پر بلونت سنگھ کی تصانیف کی تعداد چالیس سے زائد ہے۔ انھوں نے بائیس ناول اور تقریباً تین سو کہانیاں شائع کیں۔

# جگا

ماجھا کے علاقہ میں بھیکن ایک چھوٹا سا اور غیر معروف گاؤں تھا۔ مشکل سے سو گھر ہوں گے، زیادہ تر سکھوں کی آبادی تھی۔ یہاں کی ایک بات عجیب تھی۔ وہ یہ کہ بعض اوقات یہاں کوئی غیر معمولی طور پر حسین لڑکی وجود میں آتی۔ جس کے ساتھ کسی نوجوان مرد کے عشق کی داستان اس قدر پر رومان ہوتی کہ سسی پنوں، سوہنی مہیوال اور ہیر رانجھے کے قصے بھی مات ہو جاتے تھے...... اور اب کے قرعہ گرنام کور کے نام پڑا تھا۔

گرنام کے حسن نے آس پاس کی بستیوں کے نوجوانوں میں ایک ہل چل سی مچا دی تھی۔ وہ ایک گڑیا کے مانند تھی، چینی کی مورت۔ چلتی تو اس سبک رفتاری کے ساتھ کہ نقش قدم معدوم، سرمگیں اور بدمست آنکھیں ایسے گناہ کی دعوت دیتی تھیں کہ جس سے بہتر ثواب کا تصور ذہن میں نہ آتا تھا، لیکن ابھی وہ معصوم تھی، شباب کی آمد آمد تھی اور وہ ایک بے فکر اور پر شباب دوشیزہ کی پر زور حس کو ابھی اس طرح محسوس کرتی تھی جیسے خاموش اور پر سکون سے میں کہیں دور سے شہنائی کی اڑتی ہوئی آواز سنائی دے جاہے، ابھی وہ مردوں کے اشاروں اور کنایوں کا مطلب نہ سمجھتی تھی۔ وہ اپنی مسکراہٹ ہر کسی کو پیش کر دیتی، وہ سب سے ہنس کر بات کر لیتی، ابھی اس میں پندار حسن پیدا

نہ ہوا تھا، اس لیے جو بھی شخص اس سے بات کر لیتا یہی سمجھتا کہ گرنام اس سے محبت کرتی ہے......
ایک مرتبہ تو شنگارا سنگھ نے اعلانیہ نوجوانوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا کہ وہ گرنام کو بھگا لے جائے گا۔ اس وقت دلیپ سنگھ ادھر سے گزرا تو دوسروں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو دلیپ سنگھ بھی گرنام کے عاشقوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے سن پایا تو حالات خطرناک صورت اختیار کر لیں گے، اس پر شنگارا سنگھ نے زبردست قہقہہ لگایا اور دلیپ کے پیچھے کھڑے ہو کر بکرا بلا دیا، اس پر دلیپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا، اس نے خشمگیں نظروں سے شنگارے کی طرف دیکھا اور کڑک کر بولا۔ ''تو نے بکرا کیوں بلایا ہے۔''

شنگارے نے تہبند کس لیا اور خم ٹھونک کر مقابلے پر آن کھڑا ہوا۔ دلیپ کی آنکھیں قہر برسار ہی تھیں، قریب تھا کہ دونوں جوان باہم گتھ جائیں مگر سب نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ آخر کہاں تک؟ ایک خونی پل پر دونوں کا مقابلہ ہو گیا۔ دلیپ کا ٹخنہ اتر گیا۔ اور دلیپ کی لاٹھی کی ایک ہی ضرب سے شنگارے کا جبڑا ٹوٹ گیا، جان تو بچ گئی۔ مگر صورت بگڑ گئی۔ اس دن سے سب کو کان ہو گئے اور اب دلیپ کے جیتے جی گرنام کا دعویدار پیدا ہونا ناممکن تھا۔

رات بھیگ چکی تھی، چاند جوبن پر تھا، گاؤں پر ایک پر اسرار خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آجاتی یا اس وقت رہٹ کی چرخی کے پاس ایک جنگلی بلا بیٹھا دم ہلا رہا تھا اور نہایت انہماک کے ساتھ میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔

یہ رہٹ اروڑیوں کے پاس گاؤں کے باہر کی طرف تھا۔ ساتھ ہی پیپل کا ایک بہت بڑا درخت جس پر ایک جھولا پڑا تھا، چونکہ بیلوں کو ہانکنے والا کوئی تھا نہیں، جی چاہتا چل دیتے جی چاہتا ٹھہر جاتے، اس وقت خاموشی سے کھڑے سینگ ہلا رہے تھے۔

اتنے میں سانڈنی سوار ایک سکھ مرد پیپل کے نیچے آکر رکا۔ اس نے سانڈنی کو نیچے بٹھانا چاہا۔ سانڈنی بلبلا کر مچلی اور پھر دھپ سے بیٹھ گئی۔ پنجاب کے دیہاتوں میں چھ فٹ اونچا نوجوان کوئی خلاف معمولی بات نہیں، مگر اس مرد کے کاندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے، ہاتھوں اور چہرہ کی

رگیں ابھری ہوئی، آنکھیں سرخ انگارہ، ناک جیسے عقاب کی چونچ، رنگ سیاہ، چوڑے اور مضبوط جبڑے، سر ایسے دکھائی پڑتا تھا جیسے گردن میں سے تراش کر بنایا گیا ہو، جوڑے پر رنگ برنگ کی جالی، جس میں سے تین بڑے بڑے پھندنے نکل کر اس کی سیاہ داڑھی کے پاس لٹک رہے تھے، کانوں میں بڑے بڑے مندرے، کالے رنگ کی چھوٹی سی پگڑی کے دو تین بل سر پر، بدن پر لانبا کرتا اور مونگیا رنگ کا دھاری دار تہبند اس کی ایڑیوں تک لٹکتا ہوا۔ گریبان کا تسمہ کھلا ہوا اور اس کے سینے پر کے گھنے بال نمایاں، اور پھر اس کے ہاتھ میں ایک تیز اور چمکدار چھوی۔

آتے ہی اس نے بیلوں کو دھتکارا اور وہ چلنے لگے، اس نے جوتے اتارے، تہبند کو اوپر اٹھایا، اور اپنے موٹے کڑے کو پیچھے ہٹا پانی کی جھال کی طرف بڑھا۔ پہلے اس نے منہ ہاتھ دھویا، زور سے کھانسا، اور پھر پانی پینے لگا۔

جب وہ پگڑی کے شملے سے منہ پونچھنے لگا تو ایک نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ لڑکی نے پانی بھرنے کے لیے گھڑا جھال کے نیچے کیا۔ اس کی گوری کلائی پر کی کالی کالی چوڑیاں ایک چھن کی آواز کے ساتھ یک جا ہو گئیں۔ گلابی رنگ کی شلوار، چھینٹ کا گھٹنوں تک کا کرتا، سر پر دھانی رنگ کی ہلکی پھلکی اوڑھنی، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں، جب اس نے اپنا نازک ہونٹ دانتوں تلے دبایا، گھڑے کو ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا کر کولھے پر رکھا تو اس کی کمر میں ایک دلنشیں خم سا پیدا ہو کر رہ گیا۔

مرد نے پہلے ایک پاؤں اُولو سے باہر نکالا اور اسے جھٹک کر جوتا پہن لیا پھر اس نے اپنے دوسرے پاؤں کو جھٹکا دیا اور دوسرا جوتا بھی پہن لیا۔ تب وہ اپنی چھوی ہاتھ میں لیے ہوئے اروڑی پر جہاں کہ ایک سفید مرغی کے بہت سے پر پڑے تھے، کھڑا ہو گیا۔ پاس ہی کسی کے گھر کی کچی دیوار تھی، جس پر اُپلے رکھے تھے، جب لڑکی دیوار کے قریب سے گزرنے لگی تو مرد نے چھوی سے ایک اپلا نیچے گرا دیا۔ جو لڑکی کے پاؤں کے پاس جا گرا۔ اس وقت اجنبی مرد نے اس کے پاؤں دیکھے جیسے سپید سپید کبوتر، تلوؤں کی ہلکی گلابی رنگت ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ پاؤں ابھی ابھی گلاب کی کلیوں کو روند کر چلے آرہے ہوں...... لڑکی نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، شاید اس نے اسے محض ایک راہ گیر سمجھا تھا، مگر اس کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر اس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں

قتلے سوکھنے کے واسطے لٹک رہے تھے۔

صحن سے گزر کر بوڑھا باپو اجنبی کو دروازہ سے باہر چھپر کے نیچے لے گیا۔ تھوڑی سی جگہ کے تینوں طرف ایک کچی دیوار اٹھا دی گئی تھی۔ سوکھے ہوئے اپلے جو جلانے کے کام میں آسکتے تھے اسی جگہ رکھے جاتے تھے۔ یہاں پر ایک چارپائی ڈال دی گئی۔ چار خانوں والا ایک کھیس اور اجنبی کے دل کی طرح سخت ایک عدد تکیہ اس پر رکھ دیا گیا۔

گرنام نے کپاس کی چھڑیوں کا ایک گٹھا تنور میں پھینکا اور خود آٹا گوندھنے لگی۔ جس وقت وہ تنور میں روٹیاں لگانے لگی تو اس کی اوڑھنی سر سے کھسک گئی۔ اس کی لانبی چوٹی کے رنگ برنگ کے پھندنے اس کی پنڈلیوں تک لٹک رہے تھے۔ دہکتے ہوئے تنور کی روشنی اس کے حسین چہرہ پر پڑ رہی تھی......اور اجنبی چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

شلغم کی ترکاری، ایک کٹورے میں شکر گھی، ڈیلوں کا اچار، دو بڑی بڑی پیاز کی گٹھیاں، اور آٹھ چوڑی چوڑی روٹیاں تھال میں رکھ کر گرنام اس کو دے آئی۔

جب اجنبی نے اونچے سر میں تین چار ڈکاریں لیں اور بڑے زور شور کے ساتھ منہ میں انگلی پھیر کر کلی کی تو گرنام کو معلوم ہو گیا کہ وہ کھانا ختم کر چکا ہے۔

وہ برتن اٹھانے لگی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی کپڑے اتار رہا ہے۔ جب اس نے تہبند اتارا اور اسے جھاڑ کر تکیہ کے قریب رکھنے لگا تو سونے کا ایک کنٹھا نیچے گر پڑا، گرنام ٹھٹک کر واپس جانے لگی تو اجنبی نے آہستہ سے پوچھا "گرنام بس جا رہی ہو کیا؟"

گرنام حسب معمول اپنے دلفریب طفلانہ انداز سے مسکرائی، اور اوڑھنی سنبھالتے ہوئے آگے جھک کر آہستہ سے بولی "سب لوگ سو جائیں تو میں آؤں گی۔"

اجنبی دور کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شریہہ اور ببول کے پیڑ سیاہ دیوؤں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ ٹنڈ منڈ بیریوں پر بیوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے۔

ایسے سنسان وقت میں، تاروں بھرے آسمان تلے، کسی دور افتادہ رہٹ سے کسی نوجوان کی مسرت انگیز گانے کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔

باگے وچ کیلا ای
نکل کے مل بالو!
ساڈے ونجھنے دا ویلا ای
نکل کے مل بالو!

اتنے میں گرنام دبے پاؤں، شلوار کے پائنچے اٹھائے، نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے، چپکے چپکے قدم ناپتی ہوئی آئی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں میں گھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔
اجنبی نے بہت سے سونے کے زیورات اور موتیوں کے ہار نکالے۔ قریب تھا کہ گرنام کے منہ سے حیرت اور مسرت کے مارے ایک چیخ نکل جاتی۔ مگر اجنبی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

گرنام بہت دیر تک مینا کی طرح چہکتی رہی، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ مگر اس کا دھیان زیورات کی طرف تھا۔ آخر کار اس نے اپنی باتوں سے آپ ہی اکتا کر ایک گہری سانس لی اور تکان زدہ آواز میں بولی۔
"کیوں تم یہ زیورات کہاں سے لائے ہو...... میرے خیال میں تم جیب کترے تو نہیں ہو۔ مجھے جیب کتروں، چوروں اور ڈاکوؤں سے سخت نفرت ہے۔ وہ جھٹ سے گلا دبا کر آدمی کو مار ڈالتے ہیں" اور یہ کہہ کر گرنام اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے خلا میں گھورنے لگی۔ جیسے کوئی سچ مچ کا قاتل اس کا گلا دبانے کو آ رہا ہو۔
"مت گھبراؤ۔ تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ بھلا میرے ہوتے ہوئے تم کو کس بات کا خطرہ؟ اٹھو یہاں میرے پاس چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔"
گرنام اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اجنبی کے چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا تہ دل سے مطمئن ہو کر کہنے لگی۔ "تم بہت اچھے ہو...... یہ زیورات تو تم اپنی بیوی کے لیے لائے ہو گے نا؟"

"ہاں۔"

گرنام نے اپنی ہتھیلی پر رخسار رکھتے ہوئے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"تمہاری بیوی کیسی ہے؟"

"مگر میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"اچھا تو ہونے والی بیوی کے لیے لائے ہو؟"

اجنبی نے اپنی داڑھی کے کھردرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری بیوی کون بنے گی۔ بنے گی بھی یا نہیں؟"

گرنام نے اپنی دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر اپنی آنکھوں کو جلد جلد جھپکاتے ہوئے، ناک ذرا سکیڑ کر بھولے پن سے کہا۔ "ہاں تم کالے ہو ذرا۔"

اجنبی کے سینہ میں جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا۔

مگر گرنام نہایت سنجیدگی سے کسی گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی، شاید وہ اجنبی کے لیے بیوی حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی۔

"یہ زیور تم لے لو۔"

گرنام نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا "پھر تم اپنی بیوی کو کیا دو گے؟"

اجنبی کو کچھ نہ سوجھا۔ لڑکھڑاتی زبان سے بولا۔ "پھر میں تم سے لے لوں گا۔"

گرنام کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ تالی بجا کر بولی۔ "میں ان کو اپلوں میں چھپا دوں گی...... کبھی کبھی رات کو اچھے اچھے زیورات پہن کر کھیتوں میں جایا کروں گی۔

کچھ دیر سکوت کے بعد اجنبی نے کہا۔ "گرنام تم بھی تو مجھ کو کچھ دو۔"

گرنام نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ "میرے پاس کیا ہے؟"

"کچھ بھی ہو۔"

گرنام چہرہ سے ہاتھ ہٹا کر کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنے گلے سے کوڑیوں اور خربوزہ کے رنگ برنگ کے بیجوں کا ہار اتار کر اجنبی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنے اس حقیر تحفہ کو دیکھ کر جھینپ

سی گئی اور اس کے رخسار دہکنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد گرنام نے ایک انگشتری اٹھا کر کہا۔ "یہ میری انگلی میں پہنا دو۔ دیکھوں کیسی لگتی ہے۔"

اجنبی نے اپنے کالے کالے میلے کچیلے لمبے چوڑے ہاتھوں میں گرنام کا کنول سا ہاتھ لیا۔ گرنام نظریں جھکائے بچوں کی سی سادگی اور انہماک کے ساتھ انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی زلفوں نے اس کے رخساروں کا ایک بڑا حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اجنبی وارفتگی کے عالم میں اس کے خوبصورت سیپوں جیسے پپوٹوں پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ جب وہ اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا۔ تو اس کی اپنی انگلیاں لرزنے لگیں، اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے اس کی چار چار انگل چوڑی کلائیوں کی کل طاقت کشید کی جا رہی ہو۔

گرنام چونکی اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی "ماں کھانس رہی ہے...... اب میں جاتی ہوں۔"

اجنبی اپنے خواب سے چونکا۔

گرنام نے آگے جھک کر نقرئی آواز میں پوچھا "جاؤں کیا؟"

اجنبی کی اجازت لے کر وہ زیورات کی پوٹلی بغل میں دبائے جھٹ اندر چلی گئی۔

علی الصبح گاؤں کے مویشی رات بھر کی گرمی سے گھبرا کر جوہڑ میں گھس پڑے۔

اجنبی جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ گرنام نے اسے ایک باسی روٹی پر مکھن، اور چھنا لسی کا دیا۔ اور جب اجنبی کپڑے پہن کر تیار ہوا تو گرنام رونے لگی۔ اجنبی نے آہستہ سے کہا: "روتی کیوں ہو؟"

"تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ تم مت جاؤ۔"

اجنبی ہنس پڑا "میں پھر آؤں گا۔"

باپو کو آتے دیکھ کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔

باپو اجنبی کو رخصت کرنے کے لیے کچھ دور تک اس کے ساتھ گیا۔ اس نے اجنبی سے پوچھا

"کیا میں اپنے معزز مہمان کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟"

"ہاں۔" اجنبی نے اپنی تیز نظریں اس کے چہرے پر گاڑ کر جواب دیا۔ پھر اس نے اپنے دھوپ میں چمکنے والے گنڈاسے کی طرف فخریہ انداز سے دیکھتے ہوئے مزید کہا: "اور تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اگر میرے نام ' کر' پنے یا بیگانے کسی سے بھی کیا تو تمہارے اور تمہارے خاندان کے سب افراد کے خون سے مجھے ہاتھ رنگنے پڑیں گے۔"

بوڑھے کا چہرہ فق ہو گیا۔

اجنبی سانڈنی پر سوار ہو گیا، اور مہار کو جھٹکا دے کر اپنی بھاری آواز میں بولا "آج رات جگا ڈاکو تمہارا مہمان تھا۔"

جگا ڈاکو، اصلی نام سردار جگت سنگھ ورک وہ خوفناک شخص تھا جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ قتل، غارت گری، ظلم، لوٹ مار اس کے ہر روز کے مشاغل تھے۔ لڑکپن اور شباب خون کی ہولی کھیلنے میں ہی گزر گیا۔ بہت سی زمین کا مالک تھا۔ بڑے بڑوں پر ہاتھ صاف کرتا تھا، غریب خوش تھے، اس کے خلاف گواہی دینے کا کوئی شخص حوصلہ نہ کر سکتا تھا۔ اب تیس برس سے اوپر سن تھا۔ موت کے ساتھ کھیلتا ہوا سو جاتا، اور موت کا مذاق اڑاتا ہوا جاگ اٹھتا۔ محبت، حسن، شفقت، نیکی وغیرہ کا اس کے نزدیک کچھ بھی مفہوم متعین نہ تھا۔ دور دور تک اس کی دھوم تھی۔ علاقہ بھر اس سے تھراتا تھا، اس کا دل پتھر، بازو آہن، غصہ قیامت، دہن شعلہ...... وہ قہر تھا۔

لوگوں نے اس کے نام پر کئی گانے بنا لیے تھے۔ نوجوان جھوم جھوم کر ان کو گایا کرتے تھے۔ ایک واقعہ کا ذکر یوں ہوتا تھا:

پکے پل تے لڑائیاں ہوئیاں، پکے پل تے
پکے پل تے لڑائیاں ہوئیاں تے چھویاں دے کل ٹٹ گئے...... جگیا

یا پھر لائل پور میں اس نے ایک زبردست ڈاکہ ڈالا تھا۔ اور بچ کر واپس بھی آ گیا تھا۔ اس کا ذکر

یوں ہوتا تھا ۔

جھگے ماریا لایل پور ڈاکہ، جھگے ماریا

جھگے ماریا لایل پور ڈاکہ، تے تاراں کھڑک گیاں آپے

اس کی طویل، تاریک اور ہیبت ناک شبِ حیات میں ایک تارا طلوع ہوا جس نے اس کی نظروں کو خیرہ کر دیا۔ اور وہ تارا تھی...... گرنام!

گرنام بے چاری نادان چھوکری، اسے عشق و محبت کا پتہ ہی نہ تھا۔ اسے لوگ کنکھیوں سے دیکھتے وہ ہنس دیتی، اس کے جذبہ پندار حسن و شباب کو کسی نے بھی صحیح طور پر متحرک کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ ابھی اس کو اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ دیدہ و دانستہ شکار کھیلتے، بسملوں کا تڑپنا دیکھے، اور اس لذت سے محظوظ ہو جو کہ صیادوں کے لیے مخصوص ہے۔ وہ بھولی بھالی سادہ رو چھوکری یہ جانتی ہی نہ تھی کہ وہ شاہین جس کو زخمی کرنے کے لیے پنجاب کے شہزور نوجوانوں کی کمانیں ٹوٹ چکی تھیں، اور جس پر جو بھی تیر پھینکا جاتا تھا وہ اسے چھو کر اور کند ہو کر زمین پر گر پڑتا تھا، وہی شاہین اس کے تیر غلط انداز کا شکار ہو کر نیم بسمل اس کے پیروں کے پاس پڑا تھا۔ اور وہ تیر قدرت نے اس کی پلکوں میں پنہاں کر کے رکھ چھوڑا تھا۔

رات کی تاریکیوں میں جگا ان کے ہاں آتا اور سپیدۂ سحر کے نمودار ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو جاتا۔ اس نے خود کو نیک متمول زمیندار ظاہر کیا۔ باپو کے علاوہ گھر کے سبھی افراد اس کو دھرم سنگھ کے نام سے جانتے تھے۔ گرنام کی کشش اسے کھینچ لاتی تھی۔ اس کے دل میں ایک خلش سی رہتی تھی کہ وہ اس فرشتہ کو اپنانے سے پہلے خود کو کیوں کر اس کے قابل بنائے، اس نے کبھی بھی اس سے محبت جتلانے کی کوشش نہیں کی، وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں کر اس کا آغاز کرے، وہ سوچتا تھا کہ نامعلوم اس کے اظہار محبت کرنے پر گرنام کیا رویہ اختیار کر لے۔ وہ اس کے پاس بیٹھی چہکتی رہتی تھی اور وہ مبہوت سا بیٹھا سنا کرتا۔ کبھی کبھی اس کو خود سے نفرت ہونے لگتی۔ صورت تو اس کی پہلے ہی مکروہ تھی۔ مگر اس کی سیرت پر تو شیطان دامن میں منہ چھپاتا تھا۔ گرنام تھی کہ اس نے کبھی

بھی اس سے اظہار نفرت نہ کیا۔ وہ نہایت مہر و محبت کے ساتھ اس سے پیش آتی۔ اگر وہ اسے اپنے قریب بیٹھنے کے لیے کہتا تو وہ اس کے قریب ہی بیٹھ جاتی، اگرچہ اس نے آج تک اس کو چھونے کی جرأت نہ کی تھی۔ گرنام کی فرشتہ سیرتی اس کے دل میں دھڑکا پیدا کر دیتی تھی اس کا ملکوتی جمال اس کا سر نگوں کر دیتا تھا۔ صرف اس کے دل کی بے چینی اور ضمیر کی ملامت بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے نہایت حیرت سے سنا کہ :

جگے نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے۔

ڈیڑھ برس کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔

جگا صبح شام پاٹھ کرتا، غریبوں کو کھانا کھلاتا پلاتا، دان کرتا، گوردوارے میں جا کر سیوا کرتا، ہر کسی سے نرمی اور حلیمی سے گفتگو کرتا۔

اس نے باپو کی منت کی کہ گرنام کور کی شادی اس کے ساتھ کر دی جائے۔ اس نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے۔ اور جو کچھ اس نے لوٹا وہ سب بڑی توند والوں کا تھا۔ غریبوں کی کمائی کا ایک پیسہ اس کے پاس نہ تھا۔ وہ اپنی بہت سی زمین اور روپیہ ان کو دینے کو تیار تھا۔ اور باپو کو وہ ہمیشہ بزرگ سمجھ کر اس کی خدمت کرے گا۔ لیکن گرنام کو یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ وہ جگا ڈاکو تھا۔ اور نہ ہی اسے فی الحال اس بات کا علم ہونے پائے کہ اس کی شادی کس سے ہونے والی ہے کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ اس کو چاہتی تھی اور جب وہ اپنے پریتم کو یک بیک اپنا خاوند دیکھے گی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی۔

نیک باپو نے سب کچھ منظور کر لیا۔

جگا بھیکن سے چودہ کوس پرے رہتا تھا۔ اس کی آمد و رفت کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے اس اجنبی کو کبھی کبھار ان کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ کیونکہ اول تو وہ آتا ہی کبھی کبھار تھا اور دوسرے وہ راتوں رات واپس بھی چلا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کا بہانہ کر دیتا تھا۔ جگے کو دنیا جانتی تھی، مگر اس کو کوئی نہ پہچانتا تھا۔

جسگے کو شادی کی منظوری مل ہی چکی تھی، اب وہ چاہتا تھا کہ گرنام کی زبان سے بھی اس عشق کا اقرار کروا لے، خواہ اسے یہ نہ بتلایا جائے کہ اس کا ہونے والا خاوند وہی تھا۔

ایک دن بعد از غروب آفتاب وہ بھیکن میں داخل ہوا۔ گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ گرنام ساتھ والے گاؤں میں جولاہوں کو سوت دینے کے لیے گئی ہوئی تھی۔

جسگے نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ اس نے پگڑی کو ذرا کج کیا۔ شملہ کو ذرا اور بلند کیا، اور پھر اس نے سب کی نظریں بچا کر چراغ میں سے سرسوں کا تیل ہتھیلی پر الٹ لیا۔ پھر وہ مونچھوں کو بل دیتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا پانچ چھ فرلانگ تک چلا گیا۔

ہر طرف دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ چاند کی ملگجی روشنی میں وہ ایک بھوت کی مانند دکھائی پڑتا تھا۔ دور سے ایک صورت دکھائی دی، اسے غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا، کوئی عورت تھی۔ اور یقیناً وہ تھی بھی گرنام۔

جگا اصیل مرغ کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔

گرنام قریب آتے ہی مسکرا دی۔ لیکن مسکراہٹ میں کچھ متانت جھلکتی تھی۔ سر پر ایک بھاری گٹھڑی تھی۔ ''میری تو گردن ٹوٹ گئی۔''

''اس گٹھڑی میں کیا بھر لائی ہو؟'' یہ کہتے ہوئے جسگے نے ایک ہاتھ سے یہ من بھر بوجھ اس کے سر پر سے یوں اٹھا لیا جیسے کوئی دو سال کے بچے کو ٹانگ پکڑ کر اٹھا دے۔

''اپلے...... اور ہوتا کیا؟'' گرنام نے اپنی پتلی سی ناک سکیڑ کر کہا۔ ''آ رہی تھی، رستہ میں اپلے چننے لگی۔ یہاں تک کہ شام اسی میں ہو گئی۔''

دونوں کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

آج جسگے نے گرنام کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے لگے۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹیوں اور ساگ کا تصور اسے بے چین کیے دیتا تھا۔ کبھی تو اس کے دل میں آتا کہ سارا بھید کھول دے اور کبھی سوچتا کہ ہرگز نہ بتائے۔ آخر کار اس سے رہا نہ گیا کیونکہ گرنام کچھ افسردہ سی ہو رہی تھی۔ ''گرنام!''

یہ کہتے کہتے رال اس کی داڑھی پر ٹپک پڑی۔ اس نے اپنی آستین سے پونچھا اور پھر بولا "گرنام! تم کو ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں۔"

گرنام نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے میں مصروف تھی۔ اور گہری سوچ میں تھی۔ اگرچہ وہ پہلے سی شوخ اور الھڑ نہ رہی تھی۔ مگر چونکہ جگے سے کافی مانوس تھی۔ اس لیے اس سے زیادہ شرماتی بھی نہیں تھی۔

جگے کو کچھ الجھن سی ہونے لگی۔ اس نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا۔ "کیوں گرنام کس سوچ میں ہو؟"

گرنام پہلے تو چونکی۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا۔ "میں بہت پریشان ہوں...... میں بہت دن سے چاہتی تھی کہ تم کو سب حال سناؤں لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"شرم آتی تھی۔" گرنام نے جھینپ کر جواب دیا۔

جگا کچھ کچھ تاڑ گیا۔ زیر مونچھ مسکرایا۔ "ارے مجھ سے شرم کیسی؟"

گرنام چپ رہی۔

جگا کھسک کر اس کے قریب ہو گیا۔ اس کے بار بار اصرار کرنے پر گرنام نے بتایا۔ "وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ شادی تو سبھی کی ہوتی ہے۔"

گرنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھراتی ہوئی آواز میں بولی "وہ کسی روپیہ پیسہ والے شخص سے میرا بیاہ کرنا چاہتے ہیں۔ جسے میں نے دیکھا بھی نہیں۔ مگر میں اور کسی سے......"

یہ کہہ کر وہ رو پڑی۔

جگے نے اپنے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے شملہ کو چھو کر دیکھا کہ وہ نیچے تو نہیں جھک گیا۔ پھر اس نے سینہ پھلا کر کہا "نہیں گرنام نہیں۔ جس کو تم چاہو گی اسی سے تمہاری شادی ہو گی۔ میں باپو کو خود سمجھاؤں گا...... ہاں تو...... مگر وہ ہے کون؟"

جگے کی آنکھیں مارے خوشی کے چمک رہی تھیں۔

گرنام نے اس کے سینہ پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج اسے اس کے چوڑے شانوں اور صندوق جیسے سینہ کو چھو کر گو تسکین حاصل ہو رہی تھی۔

جگا گھبرا گیا۔ اس نے اس کو چمکارا اور دلاسا دیا اور پھر اس شخص کا نام پوچھا۔

گرنام نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر رک گئی...... اور زور زور سے رونے لگی۔ جگے نے تسکین دی تو وہ بولی "تم ضرور میری مدد کرو گے، ان سب کے ہاتھوں سے سخت بیزار ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ اس کا نام......"

جگے کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"اس کا نام ہے دلیپ...... دلیپ سنگھ۔"

جگے کو سانپ نے ڈس لیا۔

اس کا چہرہ یکایک بھیانک ہو گیا۔

"دلیپ سنگھ اس کا نام ہے۔" گرنام نے دُہرایا۔

جگے کی مونچھیں لٹکنے لگیں۔

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ جسم کے رونگٹے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ گردن کی رگیں پھول گئیں...... گرنام نے حیرت سے اس کی طرح دیکھا۔

"گھر جاؤ۔" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"مگر......" گرنام متانت سے بولی۔

"تم فوراً واپس چلی جاؤ۔" اس نے کرخت لہجہ میں گرج کر کہا۔ گرنام چپ چاپ حیرت کے ساتھ اٹھی اور گٹھڑی سر پر رکھ کر گھر کی طرف چل دی۔ جگا اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ بھیانک ہوتا جارہا تھا۔ عقاب کی چونچ نما ناک سرخ ہو گئی۔ آنکھیں خون آلود ہو کر رہ گئیں اور چہرے سے بربریت ٹپکنے لگی...... معاً اس نے خنجر نکالا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دانت پیستے ہوئے آہستہ سے بولا "دلیپ سنگھ......؟"

موت کا فرشتہ دلیپ سنگھ کے سر پر منڈلانے لگا۔

خونی پل علاقہ بھر میں مشہور تھا۔

یہ پل ایک چھوٹی سی نہر پر واقع تھا۔ نہر کے دونوں کناروں پر شیشم کے بہت ہی گھنے پیڑ تھے۔ وہاں نہ تو سورج کی دھوپ پہنچ سکتی تھی۔ اور نہ ہی چاند کی چاندنی۔ پُل بڑے بڑے اور بھدے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے نیچے صرف ایک کوٹھی تھی اور پانی دو حصوں میں تقسیم ہو کر بہتا تھا۔ رات کے وقت یہ دو بڑے بڑے منہ، ایسے دکھائی پڑتے تھے جیسے دو منہ والا کوئی دیو، انسانوں کو ہڑپ لینے کے لیے منہ کھولے بیٹھا ہو یا جیسے کسی مرد کی دو بڑی بڑی آنکھیں جس کی پتلیاں کوے نوچ کر کھا گئے ہوں۔

پاس ہی ایک قبرستان تھا۔ اور کچھ فاصلہ پر مرگھٹ۔ رات کے وقت کوئی شخص ادھر سے گزرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس پل پر اتنے قتل ہو چکے تھے کہ اس کا نام ہی "خونی پل" رکھ دیا گیا تھا۔ نوجوان لڑکیاں اور بچے تو دن کے وقت بھی اکیلے ادھر نہ آتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہاں ایک سر کٹا سید رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا سر تو پل کے نیچے دلدوز چیخیں مارا کرتا۔ اور وہ خود بلا سر کے نہایت اطمینان کے ساتھ قبرستان میں ٹہلا کرتا تھا۔

نصف رات گزر چکی تھی۔

دلیپ سنگھ شہر سے واپس آ رہا تھا۔ چھوٹے سے گدھے پر دو بوریوں میں سامان تھا۔ وہ سنار کا کام بھی کرتا تھا اور پنساری کی دکان بھی۔ اس کی اپنی تیار کردہ گلقند خوب بکتی تھی۔

وہ نوجوان تھا۔ خوش رو و خوش وضع۔ مسیں ابھی بھیگ ہی رہی تھیں۔ گالوں اور ٹھوڑی پر بالکل چھوٹے چھوٹے بال جیسے زعفران۔ آنکھیں، شربت سے لبریز کٹورے۔ سر پر اس وقت لنگی باندھے ہوئے تھا، اس کا ایک چھوٹا سا شملہ نیچے کی جانب لٹکتا ہوا اور دوسرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا۔ الغوزے خوب بجاتا تھا۔ جب رانجھا ہیر کی شادی کے بعد اس کے ہاں بھیک مانگنے کے لیے جاتا ہے تو اس واقعہ کو وارث کی ہیر سے بڑی دردناک لے میں گایا کرتا تھا بلکہ اس میں تو دور دور تک اپنا ثانی نہ

رکھتا تھا۔

دلیپ طاقتور اور دلیر نوجوان تھا۔ مگر خونی پل کا نظارہ اور پھر اس کے ساتھ وابستہ خونی روایات اس جگہ کو اور بھی بھیانک بنا دیتی تھیں۔ رات کی تاریکی میں، شیشم کے گھنے درختوں کے تلے نہر کے سسک سسک کر بہنے والے پانی کی آواز سن کر اس کے دل کو کوفت سی ہونے لگی...... اس نے ذرا بلند آواز میں "چھبی" گانا شروع کر دیا۔ تاریکی اور خاموشی میں اپنی آواز سن کر اس کو تسکین ہوئی۔

اس کا گدھا پل پر سے پار ہو چکا تھا۔ وہ عین پل کے درمیان تھا۔ دل میں شاداں تھا کہ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ معاً پیچھے سے اسے اپنی گردن میں کسی تیز شے کی چبھن محسوس ہوئی اور جیسے کوئی اس کے کرتے کو پکڑے پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہو...... اس نے گھوم کر دیکھا۔

ایک دیو ہیکل مرد پل کی دیوار پر سے اچکا ہوا تھا، اس نے اپنی چھوی پیچھے سے اس کی قمیض میں اڑا دی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

"تم کون ہو؟" دلیپ نے ہمت کر کے بلند آواز میں پوچھا۔

"ادھر آ" بھاری اور تحکمانہ آواز آئی۔

دلیپ اس کی طرف بڑھا...... یکایک اس نے اجنبی کو پہچان لیا۔ بولا "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے تجھ کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔ کیا تم وہی شخص نہیں جس نے تین اشخاص سے لڑتے وقت میرا ساتھ دیا تھا...... ہاں شاید وہ ننکانہ صاحب کا میلہ تھا۔ تبھی کا واقعہ ہے...... اور تم نے دو آدمی جان سے بھی مار ڈالے تھے۔"

"بے شک میں وہی ہوں۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تیرا نام دلیپ سنگھ تھا۔ میں تجھے ایک اجنبی اور نو عمر چھوکرا سمجھ کر تیرا مددگار بنا...... اور قتل تو میں نے بہت کیے ہیں۔ اسی پل پر گیارہ آدمی قتل کر چکا ہوں...... اور آج مجھ کو بارھواں قتل کرنا ہے۔"

دلیپ کو اس کے اجڈ پن پر تعجب ہوا۔ بولا "میں نہیں جانتا تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے۔ تم تو میرے محسن ہو۔"

"تو گرنام سے محبت کرتا ہے۔ جو صرف میری ہے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تو نے شنگارا سنگھ کو اسی پل پر سخت زخمی کیا تھا...... آج تیرا میرا فیصلہ ہوگا۔"

یہ کہہ کر اجنبی نے چھوی ہاتھ سے رکھ دی اور اس کی طرف بڑھا۔ ''......اور میں چاہتا ہوں کہ تو ایک مرد کی طرح میرے مقابل آ جائے۔''

دلیپ پس و پیش کر رہا تھا۔ اس نے کہا ''میں اپنے محسن سے لڑنا پسند نہیں کرتا۔''

اجنبی نے گرج کر جواب دیا ''تو بزدل ہے۔ یہ عورتوں کی طرح گلے میں ریشمی رومال لپیٹ کر گھومنا اور بات ہے اور کسی مرد کے ساتھ دست پنجہ لڑانا کچھ اور بات ہے۔ اگر تو واقعی اپنے باپ کے ہی تخم سے ہے تو میرے سامنے آ۔'' یہ کہہ کر اس نے اس کے منہ پر تھوکا۔

دلیپ کو غیرت آ گئی۔ وہ شیر کی طرح بپھر گیا۔ وہ ڈنڈا جو وہ گدھے کو ہانکنے کے لیے ہاتھ میں لیے تھا اس نے اس کے منہ پر دے مارا۔ لیکن اجنبی نے وار روکنے کی کوشش نہیں کی۔ دلیپ نے دوسری ضرب اس کے کان پر رسید کی ڈنڈا ٹوٹ گیا۔ اس کی پیشانی اور کان سے خون بہنے لگا۔ دلیپ جوش میں تھا۔ اس نے پوری قوت کے ساتھ ایک مکہ اس کے منہ پر رسید کیا۔ جس سے اس کا جبڑا اپنی جگہ سے ہٹ گیا، اور منہ بگڑ گیا...... مگر اجنبی نہایت سکون کے ساتھ کھڑا رہا۔

اس وقت اس کی پیشانی سے خون بہہ بہہ کر اس کی داڑھی کو تر کر رہا تھا۔ ایک کان کا اوپر والا حصہ ٹوٹ کر لٹک رہا تھا اور اس میں سے خون کی دھارا چھوٹ رہی تھی۔ منہ ٹیڑھا ہو جانے کی وجہ سے اس کی صورت اور بھی بھیانک ہو رہی تھی...... مگر وہ حیرت انگیز طور پر مطمئن تھا۔

پھر اس نے دلیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گہری اور بھاری آواز میں کہا۔ ''اس طرح نہیں، دلیپ! تم ابھی محض بچے ہو۔ لیکن جگا کوئی طفلانہ حرکت نہیں کرنا چاہتا۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسہ اپنے منہ پر دیا اور اس کا جبڑا عین اصلی جگہ پر آ گیا...... دلیپ جگے کا نام سن کر کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔

اجنبی اپنی چھوی پکڑ کر بولا۔ ''تیرے پاس چھوی ہے؟''

''نہیں۔''

''تلوار ہے؟''

''نہیں۔''

''صفاجنگ ہے؟''

"نہیں۔"

"مگر لاٹھی تو ہے وہ تیرے گدھے کی پیٹھ پر بوری میں ٹھنسی ہوئی۔"

دلیپ مارے تعجب کے چپ چاپ کھڑا تھا۔

"جا۔" اجنبی نے پکار کر کہا۔ "لاٹھی لے آ...... میں نے سنا ہے کہ تو علاقہ بھر میں سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا جوان ہے۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تیری غیرت تجھے ایک بزدل کی موت ہرگز نہ مرنے دے گی۔"

دلیپ بہادر تھا۔ مگر اس قسم کے شخص سے آج تک پالا نہ پڑا تھا۔

جگے نے چھوی اتار کر علیحدہ رکھ دی اور صرف لاٹھی اٹھالی۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کو للکارتے ہوئے میدان میں کود پڑے۔

ان کی للکار کی آواز سن کر پرندے گھونسلوں میں پھڑپھڑانے لگے۔ گیدڑوں نے ہوا ہو ہوا ہو کا شور بلند کیا۔ چاروں طرف گرد ہی گرد نظر آنے لگی۔

لاٹھی سے لاٹھی بج رہی تھی۔ دلیپ ہلکا پھلکا چست چالاک نو آموز اور نوجوان چھوکرا۔ بجلی کی طرح بے چین، جوڑ جوڑ میں پارہ۔ جگا بھاری بھر کم قوی ہیکل کہنہ مشق دیو۔ باوجود موٹا ہونے کے اب بھی جس وقت سرک لگاتا تھا تو ایسے معلوم پڑتا جیسے سطح آب پر ٹھیکری پھسلتی ہوئی چلی جارہی ہو۔ دلیپ نے داؤ لگا کر پہلا وار کیا۔ جگا اسے خالی دے کر چلایا "ایک۔"

دلیپ نے پھر وار کیا جگا اسے بچا کر گرجا "دو۔"

دلیپ نے تیسرا وار کیا۔ جگے نے اسے بھی روکا اور کڑکا "تین۔" یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف لپکا "او سنبھل بے چھوکرے اب جگا وار کرتا ہے۔"

پسینہ کی وجہ سے دلیپ کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ وہ فوراً چھرا لے کر جھپٹا۔ جگے نے ایک لات اس کے پیٹ میں رسید کی اور لڑکھڑاتا ہوا پل کی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔

اب جگے کے لبوں پر خونی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے ایک وحشی بھیڑیے کی مانند حلق سے ایک خوفناک آواز نکالی۔ اور پھر دونوں ایڑیاں اٹھا آگے کی طرف اُچک اس نے بھرپور وار کیا۔

دلیپ نے پھر اسنبھالا اور چیتے کی مانند تڑپ کر ہوا میں جست کر گیا۔ مگر کہنہ مشق استاد کا وار اپنا کام کر گیا۔ شاید پہلی صورت میں یہ وار اس کے سر کو توڑ دیتا اور لاٹھی اس کے سینہ تک پہنچ جاتی۔ مگر اب بھی لاٹھی کافی زور کے ساتھ سر پر پڑی۔ سر پھٹ گیا۔ اور وہ تڑپ کر بارہ سنگھے کی مانند نہر کے کنارہ پر جا گرا...... کچھ دیر تک تڑپتا رہا اور پھر سرد پڑ گیا۔

گرم خون بہہ بہہ کر نہر میں ملنے لگا۔ نہر کے پانی کی کل کل کی آواز ایسے معلوم پڑتی تھی جیسے خونی پل قہقہے لگا رہا ہو۔

قبرستان میں بوسیدہ قبروں کے روزنوں میں سے ہوا سکیاں لیتی ہوئی چل رہی تھی۔

زرد چاند بدلی میں سے نکل آیا۔ مگر اس کی شعاعیں شیشم کے گھنے پتوں میں الجھ کر رہ گئیں۔

جگے نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی خون آلود پیشانی کو صاف کیا۔ منہ ہاتھ دھویا، کان پر پگڑی پھاڑ کر پٹی باندھی۔ اس نے دلیپ کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر دل کی حرکت سننے کی کوشش کی۔ پھر اس نے چھوی اٹھائی اور دلیپ کو پیٹھ پر لاد کھیتوں کی طرح چل کھڑا ہوا۔

اس واقعہ کے پچیس دن بعد!

دیہات میں شام ہوتے ہی خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ خصوصاً سردیوں میں تو لوگ فوراً اپنے گھروں میں گھس بیٹھتے ہیں۔

گرنام کے ہاں سب ہی لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت پا کر بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عورتیں چرخہ کات رہی تھیں، بڑے بوڑھے باتوں میں مشغول تھے، اور بچے شرارتوں میں مصروف۔

اتنے میں جگا اندر داخل ہوا۔

شاید ڈیڑھ برس کے بعد آج پھر اس کے مضبوط ہاتھ میں چھوی چمک رہی تھی۔ سب نے اس کو دیکھ کر اظہار مسرت کیا۔

گرنام حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ بے بے نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ مگر اس نے بتایا

کہ اس کی ڈاچی باہر کھڑی تھی۔ اور اسے جلد ہی واپس جانا تھا۔

چند لمحوں کے لیے اس نے سکوت کیا۔ پھر اس نے نہایت مختصر اور فیصلہ کن انداز سے کہنا شروع کیا۔ "میں آپ لوگوں سے صرف اتنی بات کہنے کے لیے آیا ہوں، کہ آپ گرنام کی شادی جس شخص سے کرنا چاہتے ہیں وہ ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتی...... بلکہ اس کی شادی اس شخص سے ہوگی جس سے کہ میں چاہوں گا۔"

سب لوگ حیران تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گرنام کا ہونے والا خاوند وہ خود ہی تھا۔ مگر چونکہ انھیں یہ راز پوشیدہ رکھنے کی سخت تاکید کی گئی تھی۔ اس لیے وہ خاموش رہے۔

"......اور وہ شخص یہ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کی طرف دیکھا...... اور دلیپ اندر داخل ہوا۔

ہر شخص پر حیرت زا خاموشی طاری ہوگئی۔

گرنام نامعلوم کس دنیا میں پہنچ گئی۔ اس کو شرما جانا چاہیے تھا۔ مگر وہ اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔

جگے نے دلیپ کے کان میں کہا "اگر گرنام کو مجھ سے محبت ہوتی تو تم آج زندہ نظر نہ آتے۔ دلیپ! تم مرد ہو۔ میں نے اچھی طرح سے تم کو آزما کر دیکھ لیا ہے۔ میں چاہتا تو تم کو قتل کر ڈالتا۔ مگر مردوں سے مجھ کو محبت ہے۔ اب جبکہ تمہاری گرنام تمہیں سپرد کر رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ تم میرا راز ظاہر نہ کرو گے......"

دلیپ نے تشکر آمیز نظروں سے اپنے محسن کو طرف دیکھا۔

جگا بلند آواز میں بولا۔ "باپو! ماں!! بے بے!!!...... میں ان کی شادی کے لیے ضرورت سے بھی کہیں زیادہ روپیہ دوں گا۔ اور ان کو بہت سی زمین دوں گا۔"

باپو اصل قصہ بھانپ گیا۔ لیکن سب کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ دلیپ زندہ کیونکر ہوگیا۔ مشہور ہو چکا تھا کہ دلیپ کو ڈاکوؤں نے خونی پل پر قتل کر دیا تھا۔

دلیپ نے قصہ گھڑ کر سنا دیا کہ خونی پل پر ڈاکوؤں نے اسے گھیر لیا۔ اس لڑائی میں وہ سخت زخمی

ہوااور قریب تھا کہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا کہ سردار دھرم سنگھ وہاں پہنچ گئے۔ اور وہ اس قدر تندی سے لڑے کہ ڈاکوؤں کے چھکے چھوٹ گئے۔ اور ان کو بھاگتے ہی بنی۔ پھر وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور تیمارداری کرتے رہے۔

جگے کی مونچھوں کے نیچے اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ گرنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ مسحور ہو کر آگے بڑھی۔ اس نے جگے کا بھدا ہاتھ اپنے کنول ایسے ہاتھوں میں لے لیا۔ پہلے اس نے جگے کے بلند سینے اور اس کے غیر معمولی طور پر چوڑے شانوں کا جائزہ لیا۔ اور پھر گویا مطمئن ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی ''تم کتنے اچھے ہو...... تم یہیں ہمارے پاس ہی رہا کرو۔''

قریب تھا کہ جگا چیخیں مار مار کر رو پڑے۔ مگر جلدی سے پگڑی کے شملے میں منہ چھپا کر بگولے کی طرح دروازہ میں سے باہر نکل گیا۔

شادی ہو گئی......

کچھ عرصہ بعد رات کے وقت گرنام باپو کے ساتھ گھر سے باہر کریلے کی بیل کے پاس کھڑی تھی۔ معاً دور سے غبار اٹھا۔ کچھ سانڈنی سوار نمودار ہوئے، ان کی سجی سجائی سانڈنیاں، مردانہ اور دیو پیکر صورتیں، چمکتی ہوئی چھویاں...... عجیب منظر پیش کرتی تھیں...... ان کا سالار تو غیر معمولی طور پر چوڑا چکلا شخص تھا۔ گرنام اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی۔ ''باپو وہ کون لوگ ہیں؟...... یہ سب سے آگے والا شخص تو دھرم سنگھ دکھائی پڑتا ہے۔''

''نہیں بیٹی نہیں، وہ دھرم سنگھ نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی پوتی کا سر سینہ سے لگا لیا...... اور پھر ببول کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے ہوئے سانڈنی سواروں کی طرف خواب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''آج جگا ڈاکو ڈاکہ ڈالنے کے لیے جا رہا ہے۔''

# گرنتھی

"ست نام۔" یہ الفاظ حسب معمول گرنتھی جی کے منہ سے نکلے اور ان کے قدم رُک گئے۔ لیکن ان کے کچھے کا لٹکتا ہوا ازار بند گھٹنوں کے قریب جھولتا رہا۔

"گرنتھی جی! تم کو سو مرتبہ کہا ہے کہ یوں دندناتے ہوئے اندر نہ بڑھے آیا کرو۔ ذرا پرے کھڑے رہا کرو۔ کسی وقت آدمی نامعلوم کیسی حالت میں ہوتا ہے......" نل کے قریب بیٹھی ہوئی عورت نے اپنی پنڈلی شلوار کا پائنچا کھسکا کر ڈھانپ لی۔ اور ایڑیاں رگڑنے لگی۔ گرنتھی کب کا پیچھے ہٹ چکا تھا۔ عورت نے مفت میں رامائن چھیڑ دی۔ اس کا منہ اوپر کو ہوا تھا۔ منہ اوپر اٹھائے رکھنے کی بھی اسے عادت سی ہو گئی تھی۔ اس کی داڑھی بہت گھنی تھی۔ ٹھوڑی کے نیچے گردن کے قریب بال پسینہ سے تر رہتے۔ گردن کا وہ حصہ اس کو ہمیشہ بے چین رکھتا۔ غیر شعوری طور پر منہ اوپر رکھنے سے ہوا کا کوئی نہ کوئی بھولا بھٹکا جھونکا آتا اور اس کو ٹھنڈک کا احساس ہونے لگتا۔

وہ بیوقوفی کی حد تک سیدھا سادا ضرور تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ بالکل احمق ہی تھا...... وہ جانتا تھا کہ آج اس عورت نے وہ بات کیوں کہی۔ پنڈلی، آخر پنڈلی میں کیا رکھا ہے۔ اگر کوئی دیکھ بھی لے تو "یہ سو مرتبہ" کی بھی خوب رہی۔ حالانکہ یہ بات اس کو پہلی مرتبہ کہی گئی تھی۔ وہ ہرگز اس طرح دندناتا ہوا اندر داخل نہ ہو، اگر باہر کھڑا رہنے پر اس کی مدھم آواز سن لی جائے۔

اس کی آواز اچھی خاصی تھی لیکن زور سے آواز دینے پر اس کو ٹوکا گیا تھا۔ "یہ کیا بد تمیزی ہے۔ اس قدر حلق پھاڑنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔" اگر وہ کھڑا ان کی من پسند آواز میں بڑے ترنم کے ساتھ صبح سے شام تک "ست نام ست نام" کہتا رہے تو کوئی اس کی آواز نہ سُن پائے اور نہ اس کو روٹی دے۔ گوردوارے کے مسافر بھی ایک مصیبت تھے۔ نہ وہ روز روز آویں نہ اس کو روٹیاں مانگنی پڑیں۔ اپنے واسطے تو وہ کبھی بھی روٹیاں مانگنے نہ آئے۔ ...... ایڑیاں رگڑ رگڑ کر پاؤں دھونے والی کی صورت تو دیکھو۔ یہ تو خیر! اس آفت کی پر کالہ صورت بھی قابلِ دید تھی۔ جس نے اس پر بدنیتی کا الزام تھوپ رکھا تھا۔ سب سے احمقانہ بات جو اس کی بابت کہی جا سکتی تھی یہ تھی کہ اس نے فلاں عورت کی طرف بری نیت سے دیکھا، لیکن وہی الزام اس پر لگا کر وہ طومار باندھا گیا تھا کہ توبہ ہی بھلی۔ اتنے میں فتح سنگھ چوکیدار صحن میں داخل ہوا۔

عورت نے بے تکلفی سے پوچھا "آ بھتیا! کیا بات ہے۔" چوکیدار بھتے نے گرنتھی کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "وہ سردار جی گھر پر نہیں؟ وہ آئیں تو کہنا رات کو کنویں پر آ جائیں۔" لسی کا کٹورا پیش کیے جانے پر وہ اسے ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ گرنتھی کے کندھے سے کندھا بھڑا کر باہر نکل گیا...... عورت کی پیشانی ناہموار ہو گئی۔

گرنتھی ان سب باتوں کا مطلب سمجھتا تھا...... آج اس کو اس کے ناکردہ گناہوں کی سزا ملنے والی تھی۔

اس رات گاؤں کے بڑے کنویں پر گاؤں بھر کے سرکردہ اشخاص جمع ہوئے۔ گرنتھی پر جرح کی گئی اور اگر کوئی بات اس کے حق میں نکل آتی تو جھلاتے...... سب لوگ اس سے خفا تھے۔ کسی کو اصلی شکایت یہ تھی کہ وہ ان کے گھر والوں کو پرشاد ہمیشہ کم دیا کرتا تھا۔ کسی کے بچوں کو اس نے گوردوارے کی پھلواڑی اجاڑنے سے منع کیا تھا۔ کسی کے گھر میں جا کر کچھ کام کرنے سے اس کی بیوی نے انکار کر دیا تھا لیکن اس پر الزام یہ تھا کہ لاجو ایک دن گوردوارے میں ماتھا ٹیکنے کے لیے گئی تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا...... لاجو کو گاؤں کے تین سگے بھائی کہیں سے بھگا لائے تھے۔ وہ برائے نام پردہ داری کے ساتھ تینوں کی بیوی تھی۔ وہ تینوں بے کار تھے جو داؤں لگا کر گزرتے۔ ایک بھائی

نے پنساری کی دُکان کھول رکھی تھی۔ کبھی جلیبیاں نکال لیتے۔ کبھی ایک تانگہ تیار کر لیتے۔ موقع پڑنے پر اچھے پیانے پر چوریاں بھی کرتے، کبھی کسی راہگیر کی گھوڑی چھین لاتے...... "کیوں لاجو! کیا یہ بات درست ہے کہ گرنتھی نے تمہارا ہاتھ پکڑا؟" لاجو نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ کیونکر گرنتھی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس کو گلے لگانے کی کوشش کی۔

"گرنتھی جی تم کو کچھ کہنا ہے؟"

"میں نے اس کا ہاتھ نہیں پکڑا۔"

لاجو چمک کر کچھ کہنے کو تھی کہ اس کو روک دیا گیا۔ "تو گرنتھی جی آج تم نے لاجو کا ہاتھ پکڑا۔ کل کسی اور کا آنچل کھینچو گے۔ گاؤں کی بہو بیٹیوں کی عزت تمہارے ہاتھوں محفوظ نہیں۔"

"میں نے اس کا ہاتھ نہیں پکڑا......"

"تم نے کام تو وہ کیا ہے کہ تم کو...... خیر کل شنکرات کا کام بھگتا کر پرسوں یہاں سے چلے جاؤ۔"

گرنتھی واپس آکر بستر پر لیٹ گیا...... نیند نہ آتی تھی۔

ایک عرصہ تک ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ اس گوردوارے میں گرنتھی مقرر ہوا تھا۔ یہاں اس کو ہر طرح کا آرام میسر تھا۔ ایک طرف تواریخی عمارت، دوسری طرف نئی عمارت بن رہی تھی۔ چک ۳۵ اور ۳۶ کا یہ مشترکہ گوردوارہ تھا۔ یہ گاؤں چونکہ ایک دوسرے کے بالکل قریب قریب تھے۔ اس لیے علیحدہ علیحدہ گوردوارے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ چڑھاوا بھی زیادہ چڑھتا تھا۔

تھوڑی دیر تک اس کی بیوی اس کے قریب بیٹھی رہی۔ وہ اداس تھی۔ لیکن اس کو اپنے خاوند پر بھروسہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے خاوند پر جو الزام دھرا گیا تھا وہ سراسر بے بنیاد تھا۔ وہ دونوں اس آفت کا اصل سبب بھی جانتے تھے۔ لیکن لاچار تھے۔ اگر اس جگہ رہنے کا مطلب یہ تھا کہ بات بات میں بے عزتی برداشت کی جائے، اس کی بیوی دوسروں کے گھروں میں جاکر نہ صرف کام کرے بلکہ ان کی خوشامد بھی کرے تو اس سے بہتر یہی تھا کہ وہ اس غلامی کو خیر باد کہہ کر اپنے گاؤں کو چلے جائیں...... لیکن آئندہ وہ کیا کرے گا؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

گرمیوں کی چاندنی رات میں وہ کھلے آسمان تلے چارپائی پر بیٹھا صحیح معنوں میں تارے گن رہا تھا۔ اس نے تاروں کی طرف کبھی دھیان ہی نہ دیا تھا۔ ورنہ تاروں کی دنیا بھی کس قدر خوبصورت اور انوکھی تھی۔ کتنی دور تک پھیلے ہوئے بے شمار تارے اور بادلوں کی صورت کے وہ تارے جن کی بابت کہا جاتا تھا کہ مرنے کے بعد انسان کی روح اسی راستہ سے ہو کر جاتی تھی۔ نامعلوم وہ راستہ کیسا ہوگا؟ کیسی جگہ ہوگی؟ درخت ہوں گے یا ریت کے ٹیلے۔ جب روح تھک جاتی تو اس کو دم لینے کی اجازت ہوگی یا نہیں۔ یہ راستہ آخر کار کہاں ختم ہوتا ہوگا؟

اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب جاگا تو تارے جھلملا رہے تھے۔ ہوائیں خنکی تھی۔ باڑے میں بوڑھا بیل سینگ ہلا رہا تھا اور اس کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ گوردوارے کے اندر اس کے چھوٹے سے مکان کے صحن میں اس کی بیوی دہی بلو رہی تھی۔ دہی بلونے کی آواز اس بات کا یقینی ثبوت تھی کہ اب صبح ہونے والی تھی۔

وہ اٹھا۔ کلہاڑی پکڑ کر ببول کے درختوں کی طرف چلا گیا۔ ایک نازک سی شاخ کاٹ کر اس نے تین داتونیں بنائیں۔ اپنے لیے، اپنی بیوی کے لیے اور اپنی نو سالہ بچی کے لیے۔ ایک جھاڑن کاندھے پر ڈالے، وہ کھیتوں میں سے ہوتا ہوا باڑے میں واپس آیا اور بیل کی رسی کھول کر رہٹ کی طرف بڑھا۔

پرانی طرز کا یہ رہٹ سطح زمین سے بہت اونچا تھا۔ ایک اونچا گول چبوترا جہاں سے گوبر ملی مٹی نیچے گرتی رہتی تھی۔ چبوترے کے دونوں طرف گارے کی بے ڈول سی ٹیڑھی میڑھی دو دیواریں کھڑی تھیں۔ ان پر درخت کاٹ کر ایک طویل لٹھ ٹکا دیا گیا تھا۔ اس کے بیچوں بیچ چرکھڑی کی لکڑی گھسی ہوئی تھی۔ پاس ہی دوسری چرکھڑی اس میں دانت جمائے کھڑی تھی۔ نچلی چرکھڑی کے پاس لکڑی کا کتا جو اس کے پیچھے کی جانب گھومنے سے روکتا تھا۔ جب بیل کو جوت دیا گیا اور چرکھڑیاں گھومنے لگیں تو کتا کٹ کٹ بولنے لگا۔ کنویں والا بڑا چرکھڑا بھی گھوما، رسیوں سے بندھی ہوئی ٹنڈیں پانی کی طرف لپکیں جو ٹنڈیں رات کی بھری بیٹھی تھیں انھوں نے پانی انڈیل دیا۔ جھال میں سے پانی کی دھار اتیزی سے نکلی۔ کنواں عجیب سروں میں روں روں کی آواز نکالنے لگا۔ کبھی ایسا جان پڑتا جیسے گا رہا ہو۔ کبھی رونے کی سی آواز نکلنے لگتی۔ کبھی اس میں سے دل سوز چیخ کی سی آواز پیدا ہوتی......

تاریکی میں یہ عجیب و غریب آوازیں، چھوٹی بڑی گھومتی ہوئی چرکھڑیاں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے کوئی عجیب الخلقت جانور رینگ رہا ہو۔

شور و غل سے فضا میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اِدھر اُدھر سے دو چار کتے بھی بھونکنے لگے۔

گرنتھی نے جھال کی طرف تختہ لگا کر پانی روک لیا تاکہ یہ ٹونٹیوں کی طرف چلا جائے۔ جب کھیتوں کو پانی دینا ہوتا تو پانی کا رُخ جھال کی طرف کر دیا جاتا۔ چار دیواری پر بیٹھ کر اس نے داتون کی۔ داتنوں کی کوچی سے دانت اور مسوڑے صاف کیے، پھر داتون بیچوں بیچ پھاڑ کر اسے کمان کی صورت گھمایا اور زبان پر رگڑا۔ منہ میں انگلی پھیر پھیر کر وہ کھانستا اور تھوکتا رہا۔

کنویں پر جھکے ہوئے شہتوت کے پیڑ پر پرندے پر پھڑپھڑانے لگے۔

داتون پھینک کر اس نے کپڑے اتارے ٹونٹی کے منہ سے لکڑی ہٹا دی۔ منہ اور داڑھی دھو کر واہگورو، واہگورو کا ورد کرتا ہوا پانی کی دھارا کے نیچے بیٹھ گیا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ کل وہ اس جگہ کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اس وقت یہ بات کس قدر ناقابلِ یقین تھی۔

کچھا نچوڑ کر اس نے بغل میں دبایا۔ پانی سے لبریز بالٹی اٹھا کر وہ گوردوارے کے اندر چلا گیا۔ بڑے صحن میں اس کی بیوی جھاڑو دے رہی تھی۔ کچھا جھٹک کر رسی پر ڈالنے کے بعد اس نے فرش پر پانی چھڑکنا شروع کیا۔

آج سنکرات تھی۔

صفائی اور چھڑکاؤ کے بعد ٹاٹ فرش پر بچھایا گیا۔ گرنتھ صاحب پر سلک کے رومال ڈال دیے گئے۔ چوری بھی صاف کر کے قریب رکھ دی گئی۔ پھر وہ اندر سے ہارمونیم، ڈھولکی، چمٹا، چھینے وغیرہ گانے بجانے کے ساز اٹھا لایا۔ اس کی بیوی پاس کھڑی داتون کر رہی تھی۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کو اس بات کا احساس تھا کہ جب ان کو وہاں رہنا ہی نہیں تو اس کی بلا سے وہ کام بھی کیوں کریں۔ لیکن یہ گورو گھر کا کام تھا۔ یہ تو گوردوارے کی سیوا تھی۔ کسی پر کیا احسان تھا۔ اپنی ہی آخرت کا سوال تھا......اور دونوں کے دلوں میں ایک مبہم سا احساس بھی تھا کہ ممکن ہے کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ ان کا جانا منسوخ ہو جائے۔

لڑکی آج اچھے اچھے کپڑے پہنے پھولی نہ سماتی تھی۔ کتنی پیاری بچی تھی۔

دھوپ نکل آئی۔ اس کی بیوی چہرے پر چھڈی مل کر گھڑی کی گھڑی دھوپ میں جا بیٹھی۔ گرنتھی نے بڑے بڑے مٹکوں میں پانی بھرنا شروع کیا تاکہ سنگت کو پیاس لگے تو پانی کی دقت نہ ہو۔ گوردوارے کا بوڑھا بیل کمزور ہو چکا تھا۔ کام کم کرتا اور آرام زیادہ۔ یہ تو ہو نہ سکتا تھا کہ سنگت کو پانی پلانے کے لیے وہ بیل کو شام تک کنویں کے آگے جوتے رکھے۔

سنکھ ہاتھ میں لیے وہ گوردوارے کی ٹوٹی پھوٹی چار دیواری سے باہر نکل آیا۔ دروازے کے قریب درخت کا ایک بھاری بھر کم تنہ پانی کے گڑھے میں دھنسا پڑا تھا۔ اردگرد گوردوارے کے وہ کھیت تھے جن میں اس نے خود ہل چلایا تھا، بیج بویا تھا۔ چاندنی اور اندھیری راتوں میں پانی سے سینچا تھا۔ نلائی کی تھی۔ ان کھیتوں سے اس کا کتنا گہرا تعلق تھا۔ اس کا پسینہ ان کھیتوں کی بھربھری مٹی میں جذب ہو چکا تھا۔ اب وہ اپنی امانت کسی صورت میں بھی واپس لینے کا حقدار نہ تھا۔ قریب ہی بڑ کا ایک بوڑھا درخت تھا۔ جس کی بابت ایک روایت مشہور تھی۔ گوروؤں کے زمانے میں ایک نہایت پاکباز شخص اس گوردوارے میں سیوا کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی عمر اسی جگہ گورو کے چرنوں میں بتادی۔ یہاں تک کہ وہ بوڑھا ہو گیا...... لیکن اس کی محنت میں فرق نہ آیا۔ اس کا دل اسی جوش اور خلوص سے لبریز تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ گرمیوں کی دوپہر میں وہ کھیتوں کی نلائی کر رہا تھا۔ اس کی پگڑی کے اندر اس کے الجھے ہوئے بال پسینے میں تر ہو رہے تھے۔ اسے پیاس محسوس ہوئی۔ اس نے ٹنڈ میں پانی بھر کر رسی کا بکنا باندھ کر اسے بڑے درخت کی ٹہنی سے لٹکا رکھا تھا۔ جب اس نے ٹنڈ کو چھوا تو وہ اس قدر ٹھنڈی تھی جیسے برف۔ کس قدر ٹھنڈا پانی ہے اس نے دل میں کہا گورو صاحب سچے بادشاہ اسی طرف کو آنے والے ہیں۔ کیوں نہ پانی انھیں کے لیے رہنے دوں۔ وہ اس میں سے پانی پی لیں گے تو باقی پانی سے میں اپنی پیاس بجھالوں گا...... بیشک گورو صاحب دورہ کرتے ہوئے اس طرف کو آنے والے تھے لیکن ان کے آنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ اس وقت وہ اطمینان سے دربار میں بیٹھے سنگتوں کو درشن دے رہے تھے۔ یکایک گورو صاحب اٹھ بیٹھے، اور فی الفور کوچ کا حکم صادر فرمایا۔ سب حیران کہ آخر اس میں بھید کیا ہے۔ یہ بیٹھے بٹھائے ایک دم اتنی عجلت کیوں؟ گورو صاحب سچے

بادشاہ نے فرمایا، میرا ایک سکھ منتظر ہے وہ پیاسا ہے۔ جب تک میں وہاں جا کر پانی نہ پیوں گا وہ پیاسا ہی رہے گا...... گورو صاحب گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ہوئے اس جگہ پہنچے، جاتے ہی پانی مانگا۔ بوڑھے سکھ نے وہ ٹنڈ آگے بڑھا دی...... وہ کس قدر خوش تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

گرنتھی درخت کے تنے پر کھڑا ہو گیا۔ جب اس نے سنکھ منہ سے لگایا تو دل میں سوچنے لگا۔ گورو صاحب دلوں کا حال جانتے ہیں۔ وہ میری بے گناہی سے واقف ہیں۔ وہ یہاں سے نہیں جائے گا۔ اس کو یقین تھا کہ ضرور کوئی ایسی صورت نکل آئے گی۔

سنکھ پورنے کے بعد وہ دیر تک گاؤں کی طرف دیکھتا رہا، جیسے وہ بھی کسی کی آمد کا منتظر ہو۔ کتنی تیز دھوپ ہو گئی تھی اور لوگ ابھی گھر سے بھی نہ نکلے تھے۔ ٹیالے ٹیالے مکان۔ مکانوں کے بیچ میں سے سر اٹھائے ہوئے سرسبز درخت...... کچی سڑک سے آگے ڈھلوان پر بھنگیوں کے کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ دو تین بچھڑے ادھر اُدھر قلانچیں بھرتے پھرتے تھے۔

وہ گوردوارے کے چھوٹے سے باغ میں گیا۔ انگور کی بیلیں آڑی ترچھی لکڑیوں پر سے گر پڑتی تھیں۔ ایک کونے میں سے اس نے الجھی ہوئی رسیاں اٹھائیں۔ بیلوں کو لکڑیوں کے ساتھ لگا کر رسیوں کے ٹکڑوں سے، کچھ ڈھیل دے دے کر باندھنے لگا۔ اس کی موٹی موٹی انگلیاں اپنے کام میں ماہر تھیں۔ قریب ہی ہرے دھنیے اور مرچوں کی کیاری تھی۔ وہ اس کے کنارے پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔ بیچ بیچ میں کھٹ میٹھی بوٹی کے چھوٹے چھوٹے پودے بھی تھے۔ اس نے احتیاط سے ان کو اکھاڑنا شروع کیا۔ بچے ان بوٹیوں کو شوق سے کھاتے تھے۔ انار کے پیڑ خاموش سمادھی میں بیٹھے ہوئے درویشوں کی مانند نظر آتے تھے۔ ہوا بند تھی۔ پیڑوں کی پتیاں تک نہ ہلتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے پرماتما سے اس کی لو لگی ہوئی ہو۔ باغ کا کتنا حصہ بیکار پڑا تھا۔ اس کا خیال تھا، وہ جھاڑیوں اور مدار کے خودرو پیڑوں سے وہ حصہ صاف کر کے وہاں سبزیاں لگائے۔ مٹر، ٹماٹر، گوبھی......

ہر پیڑ اور پودے کو دیکھتا ہوا وہ باہر نکلا۔ پھر اسی تنے پر کھڑے ہو کر اس نے دوسری مرتبہ سنکھ بجایا۔ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مرد تو خیر کھیتوں پر کام کر رہے تھے لیکن عورتیں گھروں میں گھسی پڑی تھیں۔ بیوی سے کہنے لگا۔ "دو مرتبہ سنکھ پور چکا ہوں کوئی شخص نظر نہیں آتا، کم از کم

عورتوں کو آجانا چاہیے۔"

اس کی بیوی چپ رہی۔ عورتوں کی بابت وہ جانتی تھی۔ اول تو ہر عورت کے چار چار پانچ پانچ بچے تھے۔ ان کو نہلانا دھلانا۔ پھر ہر عورت کو بناؤ سنگھار بھی تو کرنا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں اپنے کپڑوں اور گہنوں کی نمائش کی جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ دنیا بھر کی باتیں یہیں کی جاتی تھیں۔ کئی پیچیدہ مسائل یہیں بیٹھ کر سلجھائے جاتے تھے۔

چھوٹی بچی بے خوشی میں دھوکی دھپ دھپائی شروع کی۔ گرنتھی چنبیلی کے پودوں کے گرد اینٹوں کے اکھڑے ہوئے جنگلوں کی مرمت کرنے لگا۔ کہیں کوئی اینٹ گری پڑی تھی۔ کہیں کوئی ٹہنی اینٹوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ کسی جگہ پودے اس قدر پھیل گئے تھے کہ جنگلے کو اور وسیع کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

لوہے کے ڈول بھر بھر کر اس نے پھولوں کو پانی دینا شروع کیا۔ بچارے گیندے کے پھول تو نرے یتیم ہی تھے۔ کوئی ان کی خبر گیری نہ کرتا تھا۔ بچارے خشک اور سخت زمین میں ہی نشوونما پاتے۔ کوڑا کرکٹ بھی انھیں پر پھینک دیا جاتا۔ اس کے باوجود جب پھول آتے تو ہر طرف پیلا ہی پیلا نظر آتا۔ پھولوں کے ہار گوندھے جاتے، بچے جھولیاں بھر بھر کر گھروں کو لے جاتے۔ کچھ گرنتھ صاحب کے سامنے چڑھا دیے جاتے، بڑی درگت ہوتی بچاروں کی۔ وہ جب کبھی گیندے کے کسی کھلے ہوئے پھول کی طرف دیکھتا تو اس کو اس کے یتیم ہونے کا خیال آنے لگتا جیسے کہ وہ خود یتیم تھا۔ وہ پودے کے قریب بیٹھ جاتا۔ پھول ہوا میں اِدھر اُدھر جھومنے لگتا۔ وہ پھول کو پیار سے دونوں ہاتھوں میں لے لیتا جیسے وہ کسی بچے کا چہرہ ہو۔ اس کو ایک بات یاد آجاتی، ایک مرتبہ (غالباً) گورو ارجن دیوجی کے لبادہ کی جھپٹ میں آکر پھول کی ایک پنکھڑی خاک پر گر پڑی تو گورو صاحب کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے...... یہ سوچتے سوچتے نامعلوم جذبہ کے زیرِ اثر گرنتھی پر رقت سی طاری ہو جاتی۔ وہ کتنی کتنی دیر تک دم سادھے بیٹھا رہتا وہ کچھ سمجھ نہ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی عقل موٹی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک ناقابلِ فہم کیفیت میں ڈوب جاتا۔

بھٹی کے قریب اس نے کڑاہ پرشاد کا کل سامان اکٹھا کر دیا۔ لکڑیاں اور موٹے موٹے اپلے بھی

ایک طرف ڈھیر کر دیے اور سنکھ لے کر پھر درخت کے تنے پر جا کھڑا ہوا، تیسری مرتبہ سنکھ پور کر وہ دیر تک اسی جگہ کھڑا رہا۔ دھوپ چلچلا رہی تھیں۔ آنکھیں دھوپ میں تپی ہوئی ہوا کی گرمی کو برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر گاؤں پر نظر جمادی۔ شاید کوئی صورت نظر آجائے۔ اس کو فکر تھی کام ختم کرنے کی۔

چند ایک نیلے پیلے دوپٹے، ہوا میں لہرائے۔ کچھ نو عمر لڑکے اور لڑکیاں اٹھکھیلیاں کرتے دکھائی دینے لگے۔ رنگ برنگ کے رومالوں سے ڈھکی ہوئی تھالیاں ہتھیلیوں پر رکھے زاہد صورت بوڑھی عورتیں پیچھے پیچھے چلی آتی تھیں۔ رفتہ رفتہ دونوں گاؤں کے لوگ چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے نکلے۔ اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں گوردوارے کی طرف بڑھے۔

گرنتھی نے ہاتھ پاؤں دھو کر پگڑی کو درست کیا۔ گلے میں زرد رنگ کا طویل سا کپڑا اڑا لے واہگورو واہگورو کہتا گورو گرنتھ صاحب کے پاس جا بیٹھا۔

گرنتھ صاحب سے رومال ہٹا کر ان کو احتیاط سے لپیٹ جلد کے نیچے دباتے ہوئے متبرک کتاب کو کھولا اور آنکھیں موند کر چوری ہلانے لگا۔

لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے عورتیں چار دیواری کے اندر داخل ہوئیں۔ ان میں سے بعض نئی نویلی دلہنیں تھیں۔ جنھوں نے کہنیوں تک چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ سرخ رنگ کی قمیص اور شلوار میں گٹھڑی سی بنی ہوئی وہ بیر بہوٹیوں کی مانند دکھائی دیتی تھیں۔ گورو گرنتھ صاحب کے سامنے پیسے، بتاشے، پھول، تھالیوں میں دالیں، چاول، آٹا وغیرہ رکھ کر وہ ماتھا ٹیکتیں اور ایک طرف بیٹھ جاتیں۔ لڑکوں میں بعض نے ہارمونیم پکڑ لیا۔ ایک لڑکا پچھلے تختے کو ہلا ہلا کر ہوا دینے لگا۔ دوسرا اپنی انگلیوں سے لکڑیوں کے سیاہ و سپید سُروں کو بے تحاشہ دبانے لگا۔ ایک نے ڈھولکی بجانی شروع کی۔ دو لڑکے بڑے چمٹے کو بجانے لگے۔ چھینے بھی چھنا چھن بولنے لگے۔ ادھر عورتیں آپس میں تبادلہ خیال کرنے لگیں۔ ان کی آوازیں ہر پابندی سے آزاد دور دور تک سنی جاسکتی تھیں۔ کچھ لڑکوں نے ادھر اُدھر بھاگنا شروع کیا۔ نئی عمارت کے اینٹوں کے چٹے لگے ہوئے تھے۔ لڑکوں نے اینٹوں کی ریل گاڑی بنائی۔ ایک لمبی قطار میں اینٹ کے پیچھے اینٹ کچھ کچھ فاصلے پر رکھ دی گئی۔ پھر ایک کو جو ٹھوکر لگائی

تو ساری اینٹیں دھڑا دھڑ گرنے لگیں۔ لڑکے اچھل اچھل کر شور مچانے لگے۔ ان کی ڈھیلی ڈھالی پگڑیاں کھل گئیں۔ انھوں نے از سرِ نو باندھنے کے بجائے پگڑیوں کو بغلوں میں دبایا اور باغ کے دورے پر نکل گئے۔ آج وہ نڈر ہو رہے تھے۔ وہ اپنی ماؤں کے ہمراہ تھے۔ گرنتھی کا اول تو آج کچھ خوف بھی نہ تھا، دوسرے وہ اس وقت آنکھیں بند کیے گرنتھ صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔

اب مردوں کی آمد شروع ہوئی۔ موٹے کھدر کے تہبند باندھے، گھٹنوں تک لمبے کرتے پہنے، سروں پر آٹھ آٹھ دس دس گز کلف لگی پگڑیاں لپیٹے، ہاتھوں میں لوہے اور پیتل کی شاموں والی مضبوط لاٹھیاں تھامے اور اپنی ڈاڑھیوں کو خوب چکنا کیے ہوئے آئے اور ماتھا ٹیک کر وہ ادھر اُدھر بیٹھنے لگے۔ ان میں سرو قد مضبوط نوجوان بھی تھے۔ جن کے تہبند رنگدار تھے۔ تہبند کے پچھلے حصے ایڑیوں میں گھسٹتے آتے تھے۔ بعض شلواریں پہنے ہوئے تھے۔ ان کے رنگین ریشمی ازار بند خاص طور پر گھٹنوں تک لٹک رہے تھے۔ پگڑیوں کے شملے خوب اکڑے ہوئے۔ ایسے چھیل چھبیلے بھی تھے جنھوں نے پگڑی کا آخری سرا گھما پھرا کر پگڑی کے اگلے سرے پر آن ٹھونسا تھا جیسے کسی پلے ہوئے مرغ کے سر پر اس کی شاندار کلغی۔

مردوں کے پہنچ جانے پر کارروائی شروع ہوئی۔ چند نوجوانوں نے بڑھ کر ساز سنبھالے۔ ایک ایک الائچی اور لونگ منہ میں ڈال کر ساز بجانے شروع کیے، ہارمونیم کے ساتھ تال پر ڈھولکی بجنے لگی۔ چمٹے والے نے جھوم جھوم کر چمٹا بجانا شروع کیا۔ ادھر چھینے بھی ٹکرائے، ہارمونیم والے نے منہ کھول کر ایک طویل "ہو" کی آواز نکالنے کے بعد گایا۔

ایتھے بیٹھ کسے نہیں رہنا، میلہ دو دن دا

اتنا کہہ کر وہ مسلسل منہ ہلانے لگا۔ ڈھولکی والے کی گردن ہلتی تھی تو چمٹے والے کا دھڑ۔

جب ایک مرتبہ کارروائی شروع ہوگئی تو سر کردہ اصحاب نے کانا پھوسی شروع کردی۔ کئی مسائل زیرِ بحث تھے۔

شبد کیرتن کے بعد سری گورو گرنتھ صاحب کی پوتر بانی پڑھ کر حاضرین کو سنائی گئی۔ اس کے بعد گرنتھی چوکی پر سے اترا اور ارداس (دعا) کے لیے گورو گرنتھ صاحب کے سامنے ہاتھ باندھ کر

کھڑا ہو گیا۔ حاضرین نے بھی اس کی پیروی کی۔ سب لوگ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ گرنتھی نے آنکھیں بند کر لیں اور ارداس شروع کر دی۔

"پرتھم بھگوتی سمر کے گورونانک لئی دھیائے

پھر انگد گور تے امر داس رامداسے ہو سہائے"

اس طرح دسوں گوروؤں کے نام دہرائے گئے۔ اور پھر۔

"پنج پیارے، چار صاحبزادے (صاحب اجیت سنگھ جی، صاحب ججھار سنگھ جی، صاحب جورادر سنگھ جی، صاحب فتح سنگھ جی) چالیس مکتے، شہیدوں، مریدوں، صدق رکھنے والے سکھوں کی کمائی کا دھیان دھر کے خالصہ جی، بولو جی واہگورو......" گرنتھی کے واہگورو کہنے پر حاضرین اس کے "واہگورو، واہگورو" کہتے، ادھر حاضرین کی آواز گونجتی ادھر ایک بڑے طبل پر چوب پڑتی اور طبل کی آواز حاضرین کی آواز کے ساتھ گھل مل کر دیر تک لرزتی رہتی اور دلوں پر ایک ہیبت سی طاری ہو جاتی...... "جن لوگوں نے دھرم کے لیے جانیں قربان کیں، چرکھڑیوں پر چڑھے، (بدن کے) جوڑ جوڑ جدا کروائے، جن کی کھالیں کھینچ لی گئیں، جنھوں نے کھوپڑیاں اتروائیں، لیکن اپنا دھرم نہیں چھوڑا۔ جنھوں نے سکھی صدق اپنے سر کے پوتر کیسوں (بالوں) اور اپنے آخری سانسوں تک نبھایا ان سنگھوں (شیروں) اور سنگھنیوں (شیرنیوں) کی کمائی کا دھیان کر کے خالصہ صاحب بولو جی واہگورو......"

"واہگورو! واہگورو!!"

......"جن گورسکھوں نے گوردواروں کے سدھار کی خاطر، سری ننکانہ صاحب جی میں اور سری ترن تارن کے سلسلے میں اپنے جسموں پر تکالیف برداشت کیں۔ جیتے جی تیل میں ڈال کر جلاد یے گئے۔ دہکتی بھٹیوں میں جھونک دیے گئے اور وہ اس طرح شہید ہو گئے۔ ان گورو کی صورت رکھنے والے سکھوں کی کمائی کا صدقہ خالصہ صاحب بولو جی واہگورو۔"

"واہگورو! واہگورو!!"

......"جن ماؤں، بیبیوں نے اپنے بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کروا کر اپنی جھولیوں میں ڈلوائے، ان کی کمائی کا صدقہ خالصہ صاحب بولو جی واہگورو۔"

"واہگورو! واہگورو!!"

طویل دعا کے آخر میں...... "(اے گورو صاحب) ہم کو نفسانی خواہشات، غصہ، لالچ، محبت اور غرور سے بچایئے۔ آپ کے حضور امرت دینے کی ارداس۔ اگر بھول چوک میں کوئی لفظ کم و بیش ہو گیا ہو تو اس کے لیے ہم معافی کے خواستگار ہیں۔ سب کے کام سنوار یے۔ گورونانک نام چڑھدی کلا تیرے بھانے سب کا بھلا۔"

سب نے جھک کر پیشانیاں فرش پر ٹیک دیں۔ گرنتھی نے دل ہی دل میں کہا۔ "واہگورو سچے بادشاہ سے دلوں کا حال چھپا نہیں۔" پھر کھڑے ہو کر "جو بولے سو نہال ست سری اکال۔" کے تین نعرے لگائے گئے۔ اس کے بعد کڑاہ پرشاد (حلوا) بانٹا گیا۔ رفتہ رفتہ لوگ پرشاد ہاتھوں میں چھپائے یا کٹوریوں میں لیے رخصت ہو گئے۔ چند سر بر آوردہ اشخاص بیٹھے رہے۔ جب تنہائی ہو گئی تو انھوں نے گرنتھی سے کہا کہ اگر پرشاد باقی ہو تو لایا جائے۔ گرنتھی نے پرشاد ان کو بانٹ دیا۔ چہروں کو اپنے چکنے ہاتھوں سے ملتے ہوئے انھوں نے بہی کھاتہ سنبھالا۔ پون گھنٹے کے بحث مباحثے کے بعد سب حساب صاف ہوا۔ گرنتھی سے کہہ دیا گیا کہ دوسرے دن رخصت ہونے سے پہلے وہ چابیاں سردار بگا سنگھ نمبردار کو دے جائے۔

ان کے چلے جانے کے بعد گرنتھی کی سب امیدیں ختم ہو گئیں۔ اس کی بیوی نے گھر کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ گرنتھی کے دل میں اب تک کچھ خلش سی تھی۔ وہ اضطراب میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔

اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے وہ تالاب کے قریب کھڑے ہو کر اس کے سبزی مائل پانی کو دیکھنے لگا۔ اس کے کنارے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ ایک دو جگہ سے سیڑھیوں کی اینٹیں بھی اکھڑ گئی تھیں۔ کائی جمی ہوئی تھی۔ اس تالاب میں کوئی نہ نہاتا تھا۔ نہ معلوم اس میں کب سے برسات کا پانی جمع تھا۔ ببول کے پیلے پیلے پھولوں کی تہ سی جمی ہوئی برگد کے بڑے بڑے زرد رنگ کے پتے پاش پاش ہو جانے والے جہاز کے شکستہ تختوں کی طرح تیر رہے تھے۔

اس کے قریب پرانی سادھ تھی جس کی دیواروں پر سے جابجا چونا اکھڑا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں پر پرانے زمانے کی رنگ دار تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ کئی جگہ سے رنگ اکھڑے ہوئے ضرور تھے۔ لیکن جہاں کہیں بھی موجود تھے، کس قدر چمک دار اور دل کش نظر آتے تھے، خاص کر گورونانک صاحب کی تصویر۔ درخت کی چھاؤں تلے بابانانک جی بیٹھے تھے۔ ایک جانب بھائی بالا اور دوسری طرف بھائی مردانہ۔ درخت کی شاخ سے پنجرا لٹک رہا تھا۔ جس میں ایک سرخ چونچ والا طوطا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسی حجرے میں ساتویں گورو صاحب پرماتما کی یاد میں مصروف رہتے تھے۔ تین چار برس پہلے کی بات تھی ایک سکھ اسی حجرے میں بیٹھ کر بلاناغہ بھگتی کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ رات کے وقت حجرہ منور ہو گیا۔ ذرہ ذرہ دکھائی دینے لگا۔ اتنے میں ایک نورانی صورت نظر آئی...... لیکن وہ سکھ جلوے کی تاب نہ لا سکا۔ وہ بھاگ کر باہر نکل آیا۔ اور فی الفور گونگا ہو گیا۔ اس کے بعد کسی نے اس کو بولتے نہیں سنا...... گرنتھی نے حجرے کا دروازہ کھول کر اس کے نمدار فرش پر اپنا ننگا پاؤں رکھا۔ اور چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں اس کی بیوی وہاں آئی اور اس کی متغیر صورت دیکھ کر کچھ پریشان سی ہو گئی۔ وہ اس کو اپنے ساتھ لے گئی۔

صحن میں دستی چرکھڑی والے چھوٹے سے کنویں کے اردگرد بنے ہوئے چوڑے چبوترے پر نیلے رنگ کی لمبوتری پگڑیاں باندھے نہنگ سکھ پتھر کے بڑے کونڈے میں شردائی گھونٹ رہے تھے۔ پگڑیوں پر لوہے کے چکر، گلے میں آہنی منکوں کی مالا، لمبے لمبے چغے...... وہ لوگ باری باری بادام، چاروں مغز، کالی مرچیں اور قدرے بھنگ والی شردائی کی گھوٹائی کر رہے تھے۔ ایک شخص نے اپنے ہاتھوں اور پاؤں سے کونڈے کو دونوں طرف سے جکڑ رکھا تھا۔ اور دوسرا گھونٹنے کا ایک لمبا چوڑا ڈنڈا، جو نیچے سے کم موٹا اور اوپر سے بہت زیادہ موٹا تھا، ہاتھوں میں لیے گھما رہا تھا۔ ڈنڈے کے اوپر گھنگھرو بندھے ہوئے تھے جو چھنا چھن بول رہے تھے۔ گرنتھی کچھ دیر تک خاموشی سے دیکھتا رہا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہوا بند تھی۔ جب اس کی بیوی دودھ دوہ کر گھر کے اندر جا رہی تھی۔ اس نے حسب معمول اپنی چارپائی باڑے کے قریب ڈال دی۔ جوتے اتار دونوں گھٹنوں پر کہنیاں

ٹیک چارپائی پر ہو بیٹھا۔

کووؤں کے جھنڈ کے جھنڈ کائیں کائیں کرتے گاؤں کے چکر لگا رہے تھے۔ چھوٹی سی نہر کی اونچی مینڈھ چکر لگاتی افق میں گم ہو رہی تھی۔ دور چند اونٹ بے مہار ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔

گرنتھی کھوئی کھوئی نظروں سے افق کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی کا منتظر ہو۔ جیسے آسمان سے کوئی نورانی صورت نمودار ہوگی...... تاریکی بڑھ رہی تھی، پورا چاند بلند ہو رہا تھا۔ اتنے میں بنتا سنگھ کندھے پر پھاوڑا رکھے آنکلا۔ بنتا سنگھ کسی عورت کو اغوا کرنے کے جرم میں ڈیڑھ برس قید بامشقت بھگت کر کل ہی اپنے گاؤں میں واپس آیا تھا، جیل کی سختیوں کا اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا تھا، وہ بدستور ہٹا کٹا تھا۔ جب اس کو سزا ہوئی اس وقت گرنتھی گوردوارے میں آیا ہی تھا۔ قریب پہنچ کر بنتا سنگھ نے بلند آواز میں ست سری اکال کا نعرہ لگایا۔ چارپائی پر بیٹھ گیا...... اس کے پھاوڑے سے گاڑھا گاڑھا کیچڑ ٹپک رہا تھا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے پوچھا...... "گرنتھی جی! سنا ہے کچھ آپ کے خلاف جھگڑا کھڑا کیا گیا ہے...... میں تو کل رات واپس آیا تھا۔ آج صبح سے میں چک ۱۵۶ میں ماموں سے ملنے چلا گیا تھا۔ اب میں سیدھا کھیتوں کی طرف چلا آیا آخر ماجرا کیا ہے؟"

بنتا سنگھ کا نہ صرف اپنے گاؤں میں دبدبہ تھا بلکہ علاقہ بھر میں لوگ اس سے خم کھاتے تھے۔ جب گرنتھی نے اس کو بتایا کہ اس کی قسمت کا فیصلہ بھی ہو چکا تو وہ جھلا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ "کس کی مجال ہے کہ تم کو یہاں سے نکالے۔ گرنتھی جی! تم اسی جگہ رہو گے اور ڈنکے کی چوٹ رہو گے۔ میں دیکھوں گا کون مائی کا لال تم کو یہاں سے نکالنے کے لیے آتا ہے۔"

یہ سن کر گرنتھی نے، جو اب تک بے حس سا بیٹھا تھا آنکھیں جھپکائیں، اس کی بھنوؤں کو حرکت ہوئی۔ وہ مسکین آواز میں بولا۔ "اور سردار بنتا سنگھ واہگورو جانتا ہے۔ میں نے لاجو کو چھوا تک نہیں۔"

سردار بگا سنگھ کے دو آدمی ادھر سے گزرتے ہوئے یہ باتیں سن رہے تھے۔ بنتا سنگھ ان کو سنا کر

بلند آواز میں للکار کر بولا: "گرنتھی جی! تم یہ کیوں کہتے ہو کہ تم نے اس کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ تم ہزار مرتبہ لاجو کا ہاتھ پکڑ سکتے ہو...... میں بگا سنگھ کو بھی دیکھ لوں گا۔ بڑا نمبردار بنا پھرتا ہے...... اور جن لوگوں نے تمہارے خلاف پنچایت میں حصہ لیا تھا۔ ان میں سے ایک ایک سے نبٹ لوں گا......"

اپنی بھرپور آواز میں اس نے یہ موٹی موٹی گالیاں بھی سنائیں......

یہ خبر دونوں گاؤں میں آگ کی طرح پھیل گئی...... سب لوگ لاجو کو گالیاں دینے لگے۔ حرامزادی! مفت میں بیچارے گرنتھی پر الزام دھر دیا۔

# بابا مہنگا سنگھ

ایک ہمارے ماموں صاحب ہیں کہ شہر میں کسی نہ کسی کام سے آتے رہتے ہیں۔ رات عموماً میرے ہاں ہی گزارتے ہیں اور جب رخصت ہونے لگتے ہیں تو مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کرتے ہیں۔ مجھے گاؤں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کھلی ہوا، دودھ، دہی اور سیدھے سادے بھولے بھالے لوگوں سے مجھے کیا تعلق؟ میں دودھ کے بجائے چائے پینا پسند کرتا ہوں۔ کھلی ہوا کے بجائے کافی ہاؤس کی دھواں دھار فضا زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ دیہات کے سیدھے سادے لوگوں سے براہِ راست تعلقات پیدا کرنے کے بجائے میں ارام کرسی پر بیٹھ کر کسی دوست کے ساتھ ان بچاروں کے مفاد پر گفتگو کرنا افضل سمجھتا ہوں۔ حفظانِ صحت کی رو سے شہر کی ضرر رساں فضا میں چالیس برس جینے کو دیہات میں اسی سال تک زندہ رہنے پر ترجیح دیتا ہوں...... لیکن ماموں صاحب کے اصرار سے مجبور ہو کر ایک مرتبہ دیہات میں جانا پڑا۔

گاؤں میں پہنچ کر مجھے مایوسی بالکل نہیں ہوئی بلکہ کچھ خوشی ہوئی کہ گاؤں کی بابت جو میرے خیالات تھے، وہ درست نکلے، اب ہر طرف کھلی ہوا تھی، کوئی اچھا مکان نہیں، کوئی سینما نہیں، کوئی کار نہیں، کوئی کمیونسٹ نہیں، بس کھلی ہوا ہے اور مجھے اس بات پر خوش ہونے کی دعوت دی جا رہی

تھی۔ میں ماموں کے مکان کے باہر والے کمرے میں بیٹھا جماہیاں لیا کرتا۔ گھر کے سامنے کھلی جگہ میں ماموں صاحب کی بھینسیں کھڑی دُم ہلایا کرتیں۔ کبھی کبھی میری طرف دیکھتی۔ کہو بیٹا دودھ پیو گے، مکھن چاٹو گے، دہی کھاؤ گے...... میں کہتا، میڈم! آپ دودھ کی بجائے گرم چائے کیوں نہیں دیتیں، معلوم ہوتا ہے کہ آپ چائے کے ذائقے سے واقف نہیں، ورنہ...... بھینس بھی آخر دیہاتن ٹھہری۔ وہ قطع کلام کر کے سینگ ہلانے لگتی اور پھر اپنی بے قدری پر مضمحل ہو کر انتہائی بے اعتنائی سے پورب کی طرف دیکھنے لگتی اور میں ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر کے پچھم کی طرف نظر جما دیتا۔

دو ہی روز بعد مجھے یقین ہو گیا کہ اس جگہ میرے دیکھنے کی کوئی چیز نہیں ہے۔ البتہ میں گاؤں والوں کے لیے دیکھنے کی چیز ہوں، ماموں جان مجھے اپنے ہمراہ لے کر باہر نکلتے تو جو واقف ملتا اور گاؤں بھر میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو ان کا واقف کار نہ ہو...... اسے میری تفصیلات سے آگاہ کرتے۔ وہ لوگ مجھے سر سے پاؤں تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتے...... ان کے اس رویہ سے میں بھول ہی گیا کہ مجھے بھی یہاں کچھ دیکھنا ہے...... اور وہ پیاری پیاری دیہاتی لڑکیاں...... جن کی تربوز تربوز بھر چھاتیاں، جنھیں دیہاتی سچ مچ چھاتیاں سمجھتے ہیں...... اور ان کے وہ گوبر میں سنے ہوئے ہاتھ، جنھیں پھیلا کر وہ کچھ ایسے بیباک انداز سے میری طرف دیکھتی تھیں کہ میں اپنے آپ کو بالکل سادہ لوح ظاہر کرنے لگتا، آنکھ مارنا تو ایک طرف مسکرانے تک کی جرأت نہ ہوتی تھی...... اور بچارے بھولے بھالے نوجوان جن کی صورتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اگر میرے ساتھ ماموں جان نہ ہوتے تو وہ ایک ٹکے کے لیے میری جان لینے سے گریز نہ کرتے۔

اس فضا میں میرے لیے اور زیادہ عرصے کے لیے زندہ رہنا ناممکن ہوا جا رہا تھا۔ مجھے بڑے اہتمام سے وہاں لے جایا گیا تھا اور میں بھی بڑے طمطراق سے وہاں گیا تھا۔ اس لیے دو ہی دن بعد لوٹ آنا قطعاً نامناسب معلوم ہوتا تھا۔ نہ معلوم، میں کیا کر گزرتا۔ اگر سچ مچ میری دلچسپی کا سامان پیدا نہ ہو جاتا۔ منجملہ اور چیزوں کے میرے دل میں سب سے زیادہ کشش سردار مہنگا سنگھ کے لیے پیدا ہوئی۔

ایک روز صبح کے وقت جبکہ ماموں صاحب مجھے پورا آدھ سیر تازہ دوہا ہوا دودھ پلانے

پر مصر تھے۔ سردار مہنگا سنگھ ادھر سے گزرا۔ ماموں سے علیک سلیک تھی۔ "واہگورو جی کی فتح" کہہ کر آگے بڑھ گئے اور پھر مجھے ماموں جی کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ تو میرے لیے مجسم درس عبرت تھا...... وہ کیونکر؟...... اب سردار مہنگا سنگھ کی عمر تین کم اسی برس کی تھی، لیکن اس عمر میں بھی دو چار سیر دودھ ایک ہی سانس میں پی لینا اس کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی اور ادھر میں جو ابھی نوجوان تھا۔ آدھ سیر دودھ بھی نہیں پی سکتا اور جب سردار مہنگا سنگھ جوان تھا تو وہ دودھ سے لبریز گھڑے کو منہ لگا دیا کرتا تھا۔

"پینے کے لیے......؟"

"اور نہیں تو کیا؟"

میں کھیتوں میں غائب ہوتے ہوئے مہنگا سنگھ کو دیکھتا رہا۔ اس کا اونچا قد، لمبی داڑھی اور بڑے بڑے ہاتھ پاؤں......

"کام کیا کرتا ہے؟"

"کچھ نہیں، اپنی زمین کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ پہلے ڈاکے ڈالتا تھا، اب واہگورو کی بھگتی کرتا ہے۔"

مجھے مہنگا سنگھ کی شخصیت سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ ایک ذہین شخص تھا۔ سیاسیات، معاشیات اور نفسیات وغیرہ مضامین پر وہ گفتگو نہیں کر سکتا تھا لیکن بحیثیت ایک انسان وہ یقیناً بہت دلچسپ تھا۔ اس کا راکششوں کے مانند ڈیل ڈول، گینڈے کی طرح کھال مربے والی پھولی ہوئی ہرڑ کی سی آنکھیں، گھنے بالوں سے ڈھکا ہوا سینہ، چھاج کے مانند کان، قدیمی بابلی بادشاہوں کی طرح بٹی ہوئی لمبی داڑھی اور مونچھیں دیکھ کر انسان کو اس بات کا شبہ تک نہ ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی مزیدار بات کہہ سکتا ہے یا گدگدی پیدا کرنے والے کسی چٹکلے کو سن کر قہقہے لگا سکتا ہے۔

چاندنی راتوں میں گاؤں سے باہر عام طور پر نوجوان کبڈی کھیلا کرتے تھے۔ لیکن اندھیری راتوں میں عموماً مہنگا سنگھ کو گھیر لیتے، مہنگا سنگھ کو زندگی میں بے شمار دلچسپ واقعات پیش آ چکے تھے۔ وہ ان کی سزائیں بھگت چکا تھا اور جو ثابت نہ ہو سکے تھے وہ دنیا نے معاف کر دیے تھے۔ اب وہ واہگورو نام کا سمرن کرتا تھا یا گاؤں کے نوجوانوں کو کوئی مزیدار قصہ سنا دیتا۔

گاؤں سے تقریباً ایک فرلانگ پر لفٹین کی باغیچی تھی، یعنی لفٹنٹ کا باغ۔ میں نے اس کی وجہ تسمیہ جاننے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ خیر اس باغیچے کے قریب ایک اونچا ٹیلا تھا۔ مہنگا سنگھ رات کا کھانا کھانے کے بعد اس ٹیلے پر جا بیٹھتا اور پریم رس میں ڈوبے ہوئے شبد، اپنی بے ڈھب آواز، لیکن اپنی دانست میں نہایت دردناک لے کے ساتھ پڑھا کرتا۔ کچھ آدمی بھی اس کے قریب آن بیٹھتے۔ داڑھیوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر شبدوں کے الفاظ اور معانی کی داد دیتے۔ بعض اوقات پریم رس اور گیان دھیان سے دفعتاً گریز کر کے وہ عورتوں کی باتیں کرنے لگتے۔ ان کے بالوں، آنکھوں، ہونٹوں، گردن اور چھاتیوں سے ہوتے ہوئے گہرائیوں تک اتر جاتے، سب مل جل کر بڑی فحش باتیں کرتے اور جب جی بھر جاتا تو دفعتاً ساری گفتگو کا ایک بہت ہی اعلیٰ اخلاقی نتیجہ نکال لیتے اور پھر سب بڑے گیانیوں کی طرح زندگی کی ناپائداری پر لمبی آہیں بلند کرتے ہوئے اٹھ کر گاؤں کی طرف چل دیتے۔

میرا بھی یہ معمول ہو گیا تھا کہ شام کا کھانا کھایا، اور باباجی کے ٹیلے کی طرف چل دیتا۔ بابا مہنگا سنگھ آنکھیں موندے، گوروچرنوں میں سیس نوائے یا تو کپڑے کی بنی ہوئی مالا جپتے یا شبد گاتے۔ جس روز کا اب ذکر کر رہا ہوں، اس روز بھی سب لوگ پریم رس میں رس گلے بنے بیٹھے تھے۔ نہ معلوم عورتوں کا ذکر کیوں اور کہاں سے شروع ہوا، اس روز صنفِ نازک پر نیا الزام لگایا گیا اور مہنگا سنگھ نے پہلے گورو صاحب کے لکھے ہوئے استری چرتر کا حوالہ دیا اور پھر اس کا ذکر ترک کر کے ذاتی تجربات بیان کرنے لگے......

ہم سب سرک کر ان کے قریب ہو بیٹھے۔

تاروں کی مدھم روشنی میں جب مہنگا سنگھ نے اس نئے مضمون پر گفتگو کرنے کے لیے منہ کھولا تو اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا ہو گئی۔ اس کی ہوا میں لہراتی ہوئی داڑھی جیسے جھوم جھوم کر اظہارِ مسرت کرنے لگی۔

''عورتوں کی چالاکی......؟ ......ہاہا...... مرد خود اپنے آپ کو کتنا ہی عقل مند کیوں نہ سمجھے لیکن عورت کے سامنے اس کی ایک نہیں چلتی۔ اب میں آپ بیتی سناتا ہوں جو بظاہر اس قدر حیرت انگیز

ہے کہ شاید تم لوگوں میں سے بعض کو اس بات کا یقین بھی نہ آئے......"

ہم سب اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ غور سے سن رہے تھے۔ اصل بات شروع کرنے سے پہلے اس نے بتایا کہ اس وقت اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ بہت طاقتور شخص تھا۔ گھونسہ مار کر اینٹ توڑ ڈالتا تھا۔ کئی معرکے کے ڈاکے ڈال چکا تھا۔ علاقہ بھر کے لوگ تو اس کا نام سن کر تھر تھر کانپتے تھے۔ پولس تک کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ......

یہ تمہید کافی لمبی تھی۔ وہ یہ باتیں پہلے بھی اتنی مرتبہ دہرا چکا تھا کہ ہم اسے سن سن کر تنگ آچکے تھے۔ لیکن نہ اسے ٹوکا جا سکتا تھا، نہ اس کی تردید کی جا سکتی تھی، اب بھی لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا، آخر وہ اصل قصے کی طرف متوجہ ہوا۔

"...... جس واقعہ کا میں اب ذکر کرنے والا ہوں، اس سے پہلے کئی روز کوئی مال ہاتھ نہ لگا تھا۔ یوں تو واہگوروں کا دیا سب کچھ تھا اور پھر زورِ بازو سے بھی بہت کچھ کمایا تھا۔ لیکن جسم میں جان تھی، طاقت کا استعمال بھی تو لازم تھا نا...... ہاں بھئی چرن! تم تو تقریباً میرے ہم عمر ہی ہو نا؟ تمہیں یاد ہے؟ کیلاں کے گاؤں کے اِرد گرد کا علاقہ کس قدر خطرناک سمجھا جاتا تھا......"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔ وہاں بڑے بڑے درختوں کے جھنڈ اور جھاڑیاں کوسوں تک چلی گئی تھیں، جنگل ہی جنگل تھا......"

مہنگا سنگھ نے پھر بات شروع کی، "بڑا سنسان علاقہ تھا، وہاں یا تو بھیڑیے رہتے تھے، یا ڈاکوؤں کی کمین گاہیں تھیں، مجھے بھی بعض اوقات وہاں پناہ لینی پڑتی تھی...... ایک مرتبہ کافی عرصے تک وہاں چھپے رہنے کے بعد میں نے اپنے گھر جانے کی ٹھانی...... مہینوں سے نہ گھر والوں کی مجھے، اور نہ میری گھر والوں کو کوئی خبر رہی تھی، میں نے دو تین ساتھیوں کو تاکید کر دی کہ میں زیادہ سے زیادہ آٹھ دس روز تک لوٹ آؤں گا اور اگر میں اتنے عرصے کے اندر اندر واپس نہ آؤں تو سمجھنا کہ گرفتار ہو گیا ہوں، پھر مجھے جیل سے چھڑانے کی تجویز کر لینا......"

بابا مہنگا سنگھ نے اپنی ٹانگوں کو سہلاتے ہوئے قدرے سکوت کیا...... "اپنے گاؤں تک چالیس کوس کا فاصلہ تھا، سو چارات کو سفر کیا کروں گا، اور دن کو کہیں چھپ رہوں گا۔ جنگل ختم ہوتے ہی پہلا گاؤں "کیلاں" تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میرے ہاتھ میں ایک لمبا لٹھ اور کمر سے

ایک ڈیڑھ فٹ کی کرپان لٹکی ہوئی تھی۔ یہ کرپان میں نے خالص لوہے کی بنوائی تھی...... اس وقت مجھے سوائے جانوروں کے اور کسی کا خطرہ نہ تھا، کیلاں کے لوگ چونکہ بڑے خطرناک علاقے میں رہتے تھے۔ اس لیے سردیوں میں تو شام پڑتے ہی گھروں میں گھس بیٹھتے تھے۔ میں مزے سے شبد گنگناتا کھیتوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ دفعتاً جو میری نظر اٹھی تو ایک بہت عجیب منظر دکھائی دیا...... کیلاں سے کئی کھیت ادھر درختوں کے پیچھے شمشان اور قبرستان ساتھ ساتھ کچھ اس انداز سے بنے ہوئے تھے کہ اگر گاؤں سے ایک طرف دیکھا جائے تو سوائے ان گھنے درختوں کے اور کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا...... دیکھتا کیا ہوں کہ قبرستان میں تیز روشنی ہو رہی ہے پہلے میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے شمشان میں کوئی مردہ جلایا گیا ہو، اور آگ ابھی جل رہی ہے لیکن یہ روشنی کچھ اور ہی طرح کی تھی اور پھر لحہ بہ لحہ تیز ہو رہی تھی......"

سب لوگ بلا آنکھیں جھپکائے مہنگا سنگھ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مہنگا سنگھ نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے قصہ جاری رکھا:

"یہ روشنی دیکھ کر میرے دل میں کئی قسم کے خیالات پیدا ہوئے۔ ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ ایسی سنسان جگہ، اندھیری رات، شدت کی سردی، ہر طرف خاموشی کا عالم...... اور قبرستان میں بڑھتی ہوئی روشنی، پہلے میں نے سوچا، ہے منا! (اے دل!) تجھے ان باتوں سے کیا لینا، سیدھا راستہ ناپتا چلا جا! تجھے منزل طے کرنی ہے، واگورو کی باتیں واگورو ہی جانے"۔ لیکن دل کی تسلی نہ ہوئی، اور میں نے سوچا، دیکھوں تو سہی، آخر معاملہ کیا ہے؟...... لو بھائی! میں نے اپنا راستہ چھوڑ کر قبرستان کا رخ کیا۔ قبرستان مجھ سے کافی فاصلہ پر تھا، جوں جوں میں قریب پہنچ رہا تھا، توں توں روشنی اور صاف نظر آنے لگی۔ قبرستان سے کچھ فاصلہ پر میں رک گیا...... گھنی جھاڑیوں میں نہ صرف آگ کی روشنی صاف صاف دکھائی دے رہی تھی بلکہ وہاں کوئی چیز ہلتی ہوئی دکھائی دی ...... پہلے سوچا، شاید میرا وہم ہو، چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔ یوں معلوم ہوا جیسے دو سینگ ہل رہے ہوں، میں قدم ناپتا، درختوں کی اوٹ لیتا ہوا کچھ اور قریب پہنچا تو سر سے پاؤں تک بالکل سیاہ گائے دکھائی دی...... آگ کا ایک آدھ شعلہ جھاڑی کے اوپر لپکتا ہوا دکھائی دے جاتا تھا...... وہ سیاہ گائے ویرانے میں تنہا

کھڑی ہوئی چڑیل کا روپ معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ہمیشہ واہگورو اکال پر کھ کا بھروسہ کیا ہے...... چنانچہ میں واہگورو کا نام لے کر اور آگے بڑھا۔ پھر ٹھٹھک گیا۔ کچھ اس قسم کا شبہ ہو رہا تھا کہ وہاں کوئی اور ہستی بھی ہے۔ رات مکمل طور پر تاریک تھی۔ درختوں کے وہ حصے جہاں آگ کی روشنی نہیں پہنچ رہی تھی، بڑے خوفناک دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے ایک نظر اپنے سر کے اوپر ڈالی۔ ٹہنیوں پر بھی ڈالی، کہ کہیں وہاں کوئی چھپا ہوا نہ بیٹھا ہو......"

ہم لوگ اس کی آواز کی گونج اور الفاظ کے جادو سے بت بنے بیٹھے تھے۔ حاضرین میں سے کسی کے منہ سے تھر تھراتی ہوئی آواز نکلی...... "پھر تم نے کیا دیکھا......؟"

"میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ ایک درخت کی اوٹ سے دوسرے درخت کی اوٹ تک انتہائی احتیاط کے ساتھ چلتا ہوا میں بالکل قریب پہنچ گیا۔ میں نے زندگی بڑے بڑے ویرانے میں بسر کی ہے۔ کئی عجائبات دیکھنے میں آئے، لیکن جو منظر وہاں دیکھا، وہ مرتے دم تک نہ بھولوں گا...... گائے کے قریب ایک قبر کے پاس بڑا سا چولھا بنا ہوا تھا۔ اس میں آگ جل رہی تھی۔ کچھ برتن پڑے تھے، پانی کا ایک کورا مٹکا...... ان سب چیزوں کے درمیان ایک عورت......"

"عورت......؟" سب کے حلق سے نکلا۔

"ہاں عورت......! بیس اکیس کے قریب ہوگی، اس قدر حسین اور پر شباب کہ زبان بیان نہیں کر سکتی، میں تو اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ سوچا، نہ معلوم یہ پری ہے سچ مچ کی یا کسی چڑیل نے پری کا روپ دھارا ہے۔ درخت کے تنے کے ساتھ لگا ہوا میں چپ چاپ اسے دیکھتا رہا...... سوچنے کی بات ہے کہ ایسی کالی رات کو، آبادی سے پرے، ویرانے بلکہ قبرستان میں کسی نوجوان اور حسین عورت کی یہ جرأت کیوں کر ہو سکتی تھی، میں نے دل میں کہا کہ دیکھیں، اب یہ کیا کرتی ہے...... اس نے میرے دیکھتے دیکھتے چولھے میں اور لکڑیاں ڈال دیں، آگ بھبھک اٹھی، پھر اس نے سر سے دوپٹہ اتار دیا، اس کے سیاہ بال دکھائی دینے لگے، اس نے مینڈھیوں کو کھولا اور پھر ساری چوٹی کھول کر بال بکھرا دیے اور روئی کی صدری کے بٹن کھولنے لگی، صدری کے نیچے ایک مخملی واسکٹ پہن رکھی تھی، اس کے بٹن کھول کر اسے بھی اتار دیا، اور جب اس نے قمیص کے بٹن بھی کھولنے شروع کیے تو

میرا دل دھڑکنے لگا...... باگورو...... باگورو!!...... بٹن کھولنے کے بعد الٹا کر قمیص کو بھی اتار دیا اب اس کے اوپر والے حصے پر ایک تار نہیں تھا۔ آپ لوگ میری حیرانی کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں، اس وقت مجھے بھی ارد گرد کی کچھ خبر نہ رہی، دل دھڑک رہا تھا، نہ معلوم یہ عورت کیا کرنے کو ہے میں ایک بچہ کی سی حیرانی کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا رہا اور اب جو اس نے اپنی شلوار کا ازار بند کھینچا، تو میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا...... چند لمحوں تک میری حالت کچھ عجیب سی ہو گئی۔ میں نے سمجھا کہ یہاں ضرور بھوتوں اور چڑیلوں کا مسکن ہے، اتنے میں پانی کے گرنے کی آوازیں آنے لگیں، میں نے جھجکتے ہوئے اس طرف نظر ڈالی تو عورت نے پانی کا مٹکا کالی گائے کے سر پر سینگوں میں پھنسا کر رکھ دیا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے مٹکا تھام رکھا تھا، دوسرے سے لوٹے بھر بھر کے پانی اپنے بدن پر ڈال رہی تھی۔ نہا کر اس نے ایک چادر سے بدن پونچھا، بغیر کپڑے پہنے اس نے ایک رنگین ٹوکری میں سے زیور نکال کر پہننے شروع کر دیے۔ انگوٹھیاں، گوکھرو، چونک، تویتریاں، کنٹھا، بازو بند، بالیاں، غرض وہ سر سے پاؤں تک سونے سے زرد ہو گئی......"

ہم میں سے ایک نے کہا۔ "ایسی سردی میں اس نے...... کپڑے نہیں پہنے......"

"نہیں...... یہی تو حیرانی کی بات ہے، اب اس نے ایک چھوٹی سی رکابی سے کپڑا سرکایا اس میں گندھا ہوا آٹا تھا۔ چولھے پر توا رکھا، اور آٹے کو پراٹھے کے انداز میں لپیٹ کر توے پر ڈال دیا اور اسے گھی میں تلنے لگی......"

اب میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، میں سنا تھا کہ پریوں کی کمر کا پچھلا حصہ کھوکھلا ہوتا ہے یعنی ریڑھ کی ہڈی نہیں ہوتی، دوسرے بھوتوں کا سایہ نہیں ہوتا اور اس عورت کا سایہ صاف نظر آ رہا تھا اور پھر ہر چیز اس قدر واضح تھی کہ میں نے سمجھ لیا دال میں کچھ کالا ہے۔ ایک تو بھوت چڑیلوں پر میرا یقین نہیں تھا، لیکن اس عورت کا واقعہ اس قدر عجیب تھا کہ یقین نہ آتا تھا کہ ایک کم سن اور حسین عورت ایسی سنسان جگہ پر آنے کی جرأت کر سکتی ہے، خیر! اب میں نے قدم بڑھایا اور اس سے چند قدم پرے کھڑی ہوئی گائے کی پیٹھ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا...... گائے کے جسم کو چھو کر میرا یقین پختہ ہو گیا کہ یہ کوئی غیر معمولی ہستی نہیں ہے، اب میں کھڑا ہوا ہی تھا کہ اس

عورت کی نظر میرے پاؤں پر پڑی۔ اور پھر دفعتاً اس نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا، اب دفعتاً اس کی صورت مسخ ہو گئی۔ باچھیں چر گئیں، دانت چمکنے لگے، نتھنے پھیل گئے اور آنکھیں جیسے ابل پڑیں...... ہاتھوں کی انگلیوں میں تشنج کی کیفیت پیدا ہوئی اور وہ بال پھیلائے "کلیجہ کھالوں گی، کلیجہ کھالوں گی" کہتی ہوئی میری طرف جھپٹی۔ اس کی آواز سن کر مجھے تسلی ہو گئی کہ یہ کوئی عورت ہے، چڑیل نہیں، جونہی وہ میرے قریب پہنچی۔ میں نے مسکرا کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ وہ وحشیوں کی طرح میرے ہاتھ کاٹنے لگی۔ میں نے زور سے اسے پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ وہ گرتے ہی پھر مجھ سے گتھم گتھا ہو گئی۔ اس عورت میں بلا کی طاقت تھی، لیکن ظاہر تھا ہم دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہ ہو سکتا تھا۔ میں نے تنگ آ کر اس کے بالوں کو خوب جھنجھوڑا اور اس کی پیٹھ پر دو تین دھپ مارے لیکن صرف اتنے زور سے، جو اس کی قوت برداشت سے باہر نہ ہوں، پھر میں نے اس کی نازک گردن کو اپنی لمبی انگلیوں کی گرفت میں لے کر کہا۔ "دیکھو! اگر ایسی چھچھوری حرکتیں کرو گی، تو میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا...... وہ بچاری تھک کر ہانپ رہی تھی، میں نے اسے پرے دھکیل کر کہا۔ "ذرا وہاں کھڑی ہو کر بات کرو مجھ سے......"

اب اسے بھی اس بات کا یقین ہو گیا کہ میں اس کی حقیقت سمجھ چکا ہوں اس لیے زیادہ حیل و حجت فضول تھی، دفعتاً اس نے چادر اٹھائی اور اپنے جسم پر لپیٹ لی، اور اس کی آنکھیں نیچے جھک گئیں، میں نے اصل مقصد جاننے کی کوشش کی، وہ زمین کی طرف دیکھتی رہی اور جھجک جھجک کر باتیں کرتی رہی۔ اب اسے مجھ سے ڈر معلوم ہوتا تھا، اس کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ چار برس پہلے اس کی شادی ایک بڑے ساہوکار سے ہوئی تھی، لیکن اب تک وہ اولاد کے لیے ترس رہی تھی اور اس کا شوہر دوسری شادی پر تلا ہوا تھا۔ ادھر یہ پریشان تھی۔ آخر ایک بوڑھی عورت نے اسے یہ نسخہ بتایا تھا کہ کالی گائے کے سر پر پانی کا مٹکا رکھ کر قبرستان میں اشنان کر، اور وہیں سے ایک پراٹھا پکا کر لا، اور کسی اولاد والی عورت کو کھلا دے، تو اس کے بچے مر جائیں گے، اور تیرے گھر اولاد ہو گی...... میں نے یہ سنا تو قہقہہ مار کر ہنسا، اس وقت گہنوں سے لدی ہوئی وہ عورت آگ کی روشنی میں بہت حسین دکھائی دے رہی تھی، میں نے آگے بڑھ کر اس کے رخسار کو چھوا۔ وہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔ کیسی نرم

جلد تھی اس کے چہرے کی، اور کس قدر بھولی صورت تھی اس کی.....!

اس نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں معلوم ہونا چاہیے، کہ میں ایک شریف گھرانے کی عورت ہوں!"

میں نے ہنس کر کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تو شریف عورت ہے، لیکن اے نیک بی بی! میں بھی بھلے خاندان کا آدمی ہوں، پرائی استری کی طرف بری نیت سے دیکھنا پاپ سمجھتا ہوں، گورو کا دیا کھاتا ہوں، انتہائی مجبوری کے سوا کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اس لیے تو خاطر جمع رکھ...... لیکن یہ بات سن لے، کہ تو نے جو طریقہ اولاد حاصل کرنے کا اختیار کیا ہے، یہ بہت بڑا پاپ ہے۔ کسی کا بُرا چاہنا بھلے آدمی کا کام نہیں ہے، بڑے بڑے رشیوں، گوروؤں، نبیوں، غرض کسی نے بھی اولاد حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں بتایا، جو تو اختیار کر رہی ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے کچھ داڑھی کو سنوارا، کچھ پگڑی کو درست کیا، انگوچھے سے منہ اور بازوؤں کی گرد پونچھی...... "اور بھئی میں خاصا کڑیل جوان تھا...... وہ مسکرا دی......"

بابا مہنگا سنگھ خاموش ہوگئے۔ ہم نے کہا...... "باباجی! اس کے بعد تم نے کبھی ملنے کی کوشش کی......؟"

"ہاں، لیکن پھر ملاقات نہیں ہوئی...... معلوم ہوتا ہے کہ پھر اسے میری کوئی ضرورت ہی نہیں رہی ہوگی...... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ سے خفا ہوگئی ہو؟"

"کیا تم نے کوئی خفگی کی بات کی تھی......؟"

"نہیں، اسے میری کوئی حرکت ناپسند نہیں تھی، البتہ جب وہ جانے لگی، تو میں نے اس کا کنٹھا پکڑ لیا، وہ حیران سی رہ گئی۔ بولی...... "تمہارا مطلب" میں نے جواب دیا کہ اس سے پہلے تو میرا کوئی مطلب ہی نہیں تھا، میرا اصل مطلب یہی ہے، اس نے کہا کہ اکیلی جان کر میرے زیوروں پر ہاتھ ڈال رہے ہو۔ میں نے جواب دیا، "چلو گاؤں میں جتنے آدمیوں کے سامنے کہو، تمہارے زیورات اتار لوں۔" اسے میری یہ تجویز پسند نہیں آئی، چنانچہ اس نے سارے زیورات میرے حوالے کر دیے......"

یہ کہہ کر باباجی نے سر جھکالیا، اور پھر جیسے گم ہو گئے۔ ایک بزرگ بولے "دیکھا، ایسی پاجی ہوتی ہیں عورتیں......"

لیجئے، میں دل میں سوچنے لگا۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ، اس قصے کا کیا ہی شان دار اخلاقی نتیجہ نکالا گیا ہے، سب لوگ آپس میں عورتوں کی بدمعاشی اور ان کی چالاکی پر رائے زنی کرنے لگے، لیکن بابا جی آنکھیں نیم وا کیے چپ چاپ بیٹھے رہے۔

"باہگورو! باہگورو!!" ان کے لب ہلے۔

میں نے انھیں افسردہ دیکھ کر پوچھا...... "باباجی! آپ نے جو اس عورت کے زیورات اتار لیے۔ غالباً آپ کو اسی بات کا دکھ ہو رہا ہے اس وقت......!"

باباجی کے بھاری پپوٹے ہلے، اور انھوں نے میری طرف پریم بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے سرد آہ کھینچی اور بولے...... "نہیں، مجھے اس کا دکھ نہیں، لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ پچاس برس گزرنے کو آئے۔ واہگورو اکال پرکھ نے مجھے ایسا موقع پھر کبھی نہیں بخشا......"

# سزا

یہ کہانی پنجاب کے ایک گاؤں سے وابستہ ہے۔

چھوٹا سا گاؤں تھا۔ دو ایک حویلیوں کو چھوڑ کر باقی تمام مکانات گارے کے بنے ہوئے تھے۔ وہی جوہڑ، وہی ببول، شرینہہ اور بیریوں کے درخت، وہی گھنے پیپل کے تلے رُوں رُوں کرتے ہوئے رہٹ، وہی صبح کے وقت کنوؤں پر کنواریوں کے جمگھٹ، دوپہر کے وقت بڑے بوڑھوں کی شطرنج اور چوپڑ، شام کو نوجوانوں کی کبڈی اور پُرسکوت راتوں میں وارث علی شاہ کی ہیر، ہیر اور قاضی کے سوال و جواب، وہی مضبوط، نٹ کھٹ اور چنچل چھوکریاں اور وہی سیدھے سادھے بلند قامت اور وجیہہ نوجوان......

شام ہو چکی تھی۔

گھر میں پکانے کے لیے کوئی چیز نہ تھی۔ اس لیے جیت کور پیسہ آنچل میں باندھ کر دال لینے کے لیے گھر سے باہر نکلی لیکن چار قدم چل کر رک گئی، سامنے پیپل کے نیچے مگدر کے قریب پھمن سنگھ چارپائی پر بیٹھا مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔

جیت کور جانتی تھی کہ جب وہ اس کے پاس سے گزرے گی تو وہ اسے بغیر چھیڑے ہرگز نہ رہے

گا۔ لہٰذا اس نے سوچا کہ بجائے دال کے کسی کھیت سے ساگ لے آتی ہوں۔ اس طرح وہ پیسہ چھوٹا بھائی چنن خرچ کرلے گا۔ آج دوپہر بھر وہ کھانڈ کی رنگ دار گولیوں کے لیے روتا رہا تھا۔ یہ سوچ کر وہ کھیتوں کی طرف چل دی۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ ببول اور گنوں کے سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ جیت کور چھوٹی چھوٹی کانٹے دار جھاڑیوں سے شلوار بچاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ جامن کے قریب بیروں کی جھاڑیاں تھیں، اس نے تھوڑے سے بیر چنن کے لیے توڑ لیے، پھر آگے بڑھی۔ اس کے چہرے سے افسردگی اور غصہ کے آثار ہویدا تھے۔ اس وقت وہ پھمن سنگھ کی بابت سوچ رہی تھی۔ آخر پھمن سنگھ اسے کیوں دق کرتا ہے۔ اگر اور نہیں تو سمتری اس سے کم حسین تو نہ تھی۔ وہ اسے کیوں نہیں چھیڑتا؟ لیکن سمتری کے تین جوان بھائی تھے۔ اگر کوئی اس کی طرف انگلی بھی اُٹھائے تو وہ اس کا خون پی جائیں۔ یہ خیال آتے ہی اسے اپنا بھائی یاد آ گیا۔ تین سال پہلے جب کہ اس کی عمر پندرہ برس کی تھی اس کا بھائی گھر سے کھانا کھا کر کنویں پر گیا۔ جہاں اس نے تربوز کھالیا اور شام تک ہیضہ سے مر گیا۔ اس کا بھائی گاؤں بھر میں سب سے زیادہ دراز قد تھا۔ اس کا سینہ ایسا تھا جیسے کسی بڑی چکی کا پاٹ، ایک بالشت اونچی اور موٹی گردن، چوڑے چکلے، مضبوط ہاتھ۔ کلائی پکڑنے اور کبڈی کھیلنے میں دور دور تک کوئی اس کی برابری کا دعویدار نہ تھا۔ ایک دفعہ کبڈی میں اس نے تھپڑ مار کر اپنے حریف نوجوان کی ہنسلی کی ہڈی توڑ دی تھی۔ یہ باتیں یاد کر کے جیت کور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، بھلا آج اس کا بھائی زندہ ہوتا تو کیا پھمن سنگھ کی ہمت پڑ سکتی تھی کہ اس سے چھیڑ خانی کرے۔ کل ہی کی بات تو ہے کہ اس بدمعاش نے اس کا آنچل کھینچ کر اس کا سر ننگا کر دیا تھا۔ یہ سب اسی لیے تو تھا کہ وہ نمبردار کا لڑکا تھا اور دوسرے یہ ان کے قرض دار تھے۔ ماں کی موت کے بعد ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ماں کے بعد باپ مرا، باپ کے بعد اس کا بھائی مرا اور اب بوڑھا دادا رہ گیا تھا جسے وہ باپو کہا کرتی تھی۔ یا چنن تھا۔ چھ سال کا بچہ۔ ماں باپ کی آخری نشانی۔ کئی دفعہ فصلیں خراب ہوئیں۔ نمبردار کا ڈیڑھ سو روپے کا قرضہ سر پر ہو گیا۔ زمین علیحدہ رہن تھی۔ باپو بوڑھا تھا۔ ان تمام مصیبتوں پر طرہ یہ کہ بے شرم پھمن سنگھ اسے دم نہ لینے دیتا تھا۔

اب جیت کور کا پھر سے خون کھولنے لگا۔ اس کے دل میں تمام مردوں کے لیے نفرت پیدا ہو رہی تھی۔ دل ہی دل میں کہنے لگی۔ اب تارا سنگھ کو ہی دیکھو اس کا آگا نہ پیچھا۔ بس لے دے کے اس کی ماں ہے تھوڑے دن کی مہمان۔ اسے بھلا کاہے کا فکر؟ زمین ہے، ایک کچا مکان، تین بیل، ایک بھینس اور ایک گائے بھی ہے۔ اسے اپنی اکیلی جان کے لیے یہ کافی سے زیادہ ہے۔ مارے بے فکری کے رانڈ کا سانڈ ہو رہا ہے۔ جب دیکھو مونچھ پہ ہاتھ۔ اتنا لمبا چوڑا جوان ہو کر بچاری کمزور لڑکیوں پر آوازے کستے شرم نہیں آتی۔ میں تو کہوں گی کہ سبھی مرد پرلے درجے کے مغرور، غنڈے اور پاجی ہوتے ہیں۔ جب کبھی پانی کا گھڑا کنویں سے اٹھا کر لاتی ہوں تو کیسی بھدی آواز سے گاتا ہے:

نکا گھڑا چک لچھیے! تیرے لک نوں جرب نہ آوے
نکا گھڑا چک لچھیے!

باپو کا خیال ہے کہ میں اس سے شادی کر لوں، مگر میں ایسے لفنگے کے ساتھ شادی کروں کیوں؟ مانا کہ پھمن سنگھ کی طرح اس نے دست درازی کبھی نہیں کی۔ مگر اس قسم کے گانے نوجوان لڑکیوں کو سُنا سُنا کر گانا بھی تو بھلے آدمیوں کا کام نہیں۔

اس وقت جیت کور کو رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ کاش واگورو اکال پرکھ اسے طاقت دیتا تو وہ ان دل پھینک عاشقوں کو اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی۔

چلتے چلتے وہ رک گئی۔ سامنے گنے کے کھیتوں کے پاس ہی ہرا ابھرا ساگ کا کھیت تھا لیکن وہ کھیت تھا تارا سنگھ کا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مویشی باندھنے کا مکان خالی معلوم پڑتا تھا۔ رہٹ چل رہا تھا۔ اور پاس ہی بیل بندھا ہوا تھا۔

اس نے جب اچھی طرح سے دیکھ لیا کہ نزدیک کوئی نہیں ہے تو چپکے سے کھیت میں سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئی اور جلدی جلدی ساگ توڑنے لگی۔ معاً ایک آواز سن کر اس نے سہم کر سر اوپر اٹھایا۔ دیکھا کہ دور گنے کے کھیتوں سے تارو ہاتھ میں پھاوڑا لیے بلند آواز سے گالیاں دیتا چلا آتا ہے۔ اُس کے جسم میں سنسنی سی پیدا ہوئی اور وہ ساگ وہیں پھینک کر جلدی جلدی دوسری طرف کو چلدی۔

اتنے میں تارو وہاں پہنچا۔ اس نے توڑا ہوا ساگ ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا اور پھر اس کی طرف لپکا۔ ادھر اسکے چھوٹے چھوٹے پھٹے ہوئے سلیپر ہری گھاس پر بار بار پھسلتے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ تارو اس کو پکڑا ہی چاہتا ہے وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ تارو بھی دوڑا۔ مختصر سی دوڑ کے بعد تارو نے اسے جا دبوچا۔ اور اس کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ کر بولا۔ ''کیوں ری جیتو! ہم سے یہ چالا کیاں؟ ہر روز تو ہی ساگ چرا کر لے جاتی تھی نا؟ آج میں بھی اسی تاک میں بیٹھا تھا۔''

جیتو روتے ہوئے اور اس کی آہنی گرفت سے بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''میں تو تیرے کھیت میں پہلے کبھی نہیں آئی...... چھوڑو مجھے۔''

''کبھی نہیں آئی تھی......'' تارو دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''چل آج میں تجھے چکھاتا ہوں مزا۔''

تب تارو اسے گھسیٹتا ہوا کچے مکان کی طرف لے گیا اور دروازہ کھول کر اسے زور سے اندر دھکیل دیا۔ وہ بھینس کے اوپر گرنے سے بال بال بچی۔ اس کی ایک چوڑی بھی ٹوٹ گئی۔ چوڑی کو ٹوٹتے دیکھ کر دامنِ صبر اس کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ چیخ کر بولی۔ ''تو نے میری چوڑی توڑ دی۔ میں نے اتنے شوق سے میلے سے لی تھیں......'' اس کی آواز بھرا گئی۔ اور وہ شکستہ چوڑی کے ٹکڑوں کو دیکھ دیکھ کر آنسو بہانے لگی۔

اب تارو نرم پڑ گیا۔ دل میں افسوس بھی پیدا ہوا۔ یکایک اس نے دیکھا کہ چوڑی کا ٹکڑا چبھ جانے سے جیتو کی کلائی سے خون بہہ رہا ہے۔ وہ ایک دم آگے بڑھا۔ ''اوہو! جیتو تمہاری کلائی سے خون بہہ رہا ہے۔ لاؤ......''

''ہٹ۔'' جیتو نے دو قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ ''بدمعاش...... کلموہا...... مسٹنڈا......''

تارو گالیاں کھا کر خاموش ہو گیا۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ وہ تو دو گھڑی کے لیے جیتو کو پریشان کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے دِق کرنے میں اُسے مزہ آتا تھا۔ لیکن اس کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ جیتو کا کوئی نقصان ہو یا وہ اسے کوئی جسمانی ایذا پہنچائے۔

جیتو دیوار کے پاس کھڑی چپکے چپکے رو رہی تھی اور تارو اپنی گردن کھجا رہا تھا۔ اس کے دل میں رحم کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ مگر وہ ہمدردی کا اظہار نہ کر سکتا تھا۔ دو گھڑی بعد وہ باہر نکل آیا

اور دروازہ بند کر کے کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد تارو سرسوں کا عمدہ ساگ لیے صحن میں داخل ہوا۔ جیتو نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بھیگی بھیگی لانبی پلکوں کو دیکھ کر تارو کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اس کو اپنی حرکت پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔ وہ جھجکتا ہوا آگے بڑھا اور ساگ کا گٹھا آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"جیتو: اب تم گھر جاؤ۔ لو یہ ساگ۔"

جیتو پہلے ہی بھری پڑی تھی۔ اس نے جھپٹ کر ساگ لیا اور الٹا اس کے منہ پر دے مارا۔ تمام ساگ بکھر کر زمین پر گر پڑا۔ اور دو چار پتے تارو کی چھوٹی چھوٹی داڑھی میں پھنس کر رہ گئے۔ تارو منہ سے کچھ نہ بولا اور جھک کر ساگ کو چننا شروع کر دیا۔

جیتو جلدی سے باہر نکل آئی۔ تارو بھی ساگ لیے پیچھے پیچھے لپکا۔ جیتو پانی کی نالی پھاندنے لگی، اس کا ایک پاؤں زمین میں دھنس گیا۔ کیونکہ زمین نمی کی وجہ سے نرم ہو رہی تھی اس نے پاؤں باہر کھینچ لیا۔ لیکن سلیپر پھنسا رہ گیا۔ تارو نے بڑھ کر جلدی سے سلیپر باہر کھینچ لیا اور کہنے لگا۔ "تم ٹھہرو میں ابھی دھوئے دیتا ہوں......"

نالی کے کنارے کپڑے دھونے کی سل پڑی تھی۔ جیتو اس پر منہ پھلا کر بیٹھ گئی اور تارو پانی کی دھارا میں پہلے ساگ دھونے لگا۔ وہ اب کوئی صلح کی گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ دھیمی آواز اور اپنی دانست میں بہت نرم لہجہ میں کہنا شروع کیا:

"جیتو! یہ بھینس تو اب دو کوڑی کی نہیں رہی۔ تین سیر صرف تین سیر دودھ دیتی ہے۔ بھلا ایسی بھینس رکھنے سے فائدہ؟...... ایک بھوری بھینس میری نظر میں ہے۔ کم سے کم سولہ سیر دودھ دینے والی۔ دام زیادہ ہیں۔ مگر کچھ ہرج نہیں۔ مجھے بھینس رکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں نے ایک سو پچپن روپے جمع کیے ہیں۔ بڑی مشکل سے، بہت ہی مشکل سے۔ اس بھینس کو ضرور خریدوں گا۔ ایسی مریل بھینس رکھنے سے کیا فائدہ؟ ایسی بھینس......"

تارو کو اپنی باتیں بالکل مہمل سی معلوم ہو رہی تھیں۔ اسے اتنا بھی حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ نظر اٹھا کر جیتو کی طرف دیکھ لے۔ اس نے ساگ دھو کر ایک طرف رکھ دیا اور اب ٹوٹا ہوا سلیپر دھونے لگا۔

ایک بات اور سوجھی بولا۔ "اور ہاں تم دریامو کو تو جانتی ہی ہو۔ بہت ہی کھوٹا آدمی ہے۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ چنن کے کان اینٹھ رہا ہے۔ میں نے سبب پوچھا تو کچھ ڈر گیا۔ کہنے لگا کہ اس نے کھیت سے ایک خربوزہ چرایا تھا۔ میں نے چنن کو اس کے ہاتھ سے چھڑالیا۔ بچارا چڑیا کی طرح سہا ہوا تھا۔ اور پھر میں نے دو دھپ دریامو کی گردن پر دیے اور کہا کہ "تو اتنی سی بات پر لونڈے کو مارے ڈالتا ہے۔ خبردار! جو اسے کبھی ہاتھ بھی لگایا تو...... جانتا نہیں چنن کس کا بھائی ہے؟"

یہ کہہ تارو خاموش ہو گیا۔ اور اس نے چپکے سے کنکھیوں سے جیتو کی طرف دیکھا مگر وہ ابھی تک منہ پھلائے خاموشی سے اپنے کبوتروں کے سے سفید سفید پاؤں کو ٹھیکری سے رگڑ رگڑ کر دھو رہی تھی۔ تارو اٹھا اور سلیپر اس کے پاؤں کے پاس رکھ دیے۔ اور ساگ اس کی جھولی میں ڈال دیا۔ وہ بے نیازی سے اٹھی اور اٹھلاتی ہوئی چل دی۔ وہ نزدیکی رستہ سے جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اب اندھیرا ہو چلا تھا۔ رستہ خراب تھا۔ کھیتوں میں پانی بھرا تھا، اور مینڈھ بہت کم چوڑی تھی۔ جیتو نے سلیپر ہاتھ میں لے کر بجائے مینڈھ کے پانی سے ہو کر جانے کی ٹھانی۔ تارو جلدی سے آگے بڑھا اور اس کا بازو تھام کر بولا۔ "تم سلیپر پہن کر مینڈھ سے چلی چلو۔ کیونکہ پانی کے اندر کانٹے دار جھاڑیاں ہیں...... میں تمہیں سہارا دیے رہوں گا۔"

جیتو نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور کہنے لگی۔ "تم لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ تم لوگ ہر کام بری نیت سے کرتے ہو۔ مگر میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اب تم لوگوں کی اس قسم کی حرکات چپکے سے برداشت نہ کروں گی۔"

یہ 'خراب نیت' کے الفاظ سن کر تارو نے اپنی صفائی کرنا چاہی۔ مگر جیتو چمک کر بولی "اور آج میں تمہیں خبردار کیے دیتی ہوں۔ کہ آئندہ مجھے ہاتھ لگانے کی جرأت ہرگز نہ کرنا ورنہ ہاتھ توڑ دوں گی۔"

تارو نے پہلے اس کے نرم و نازک ننھے منے ہاتھوں کو دیکھا پھر اپنے بھاری بھرکم میلے کچیلے اور کھردرے ہاتھوں پر نظر ڈالی اور تب اس کے لبوں پر تبسم پیدا ہوا۔

جیتو کو اس کی یہ حرکت دیکھ کر زہر سا چڑھ گیا اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ تڑاق سے سلیپر اسکے

منہ پر دے مارا۔

"جیتو!!" تارو معاشیر کی طرح غصہ میں گرجا۔ لیکن پھر نا معلوم کیا سوچ کر خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر کے لیے دونوں طرف سکوت سا رہا۔ پھر جیتو بے پروائی سے شلوار اٹھا کر پانی میں چل دی۔ سلیپر کی ایک کیل تھوڑی باہر نکلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے تارو کی پیشانی پر خراش آ گئی اور خون بہنے لگا۔ مگر وہ خون سے بے پروا جیتو کے آگے آگے چل رہا تھا۔ راستے میں جو کانٹے دار جھاڑی ہوتی اسے اپنے پھاوڑے کے ایک وار سے اکھاڑ کر جیتو کا راستہ صاف کر دیتا۔ جب یہ پانی کا راستہ ختم ہو گیا تو تارو نے بڑھ کر کانٹے دار جھاڑی میں سے راستہ بنا دیا اور خود ٹھہر گیا۔ جیتو نے ایک لمحہ کے لیے اس کے خون سے تر کرتے کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

تاریکی میں اس نے گھر کا دروازہ کھولا۔

ایک طرف چراغ جل رہا تھا۔ باپو گنڈاسے سے جوار کاٹنے میں مصروف تھا۔ چنن قینچی سے کاغذ کے پھول بنانے میں مصروف تھا......!

جیتو اندر داخل ہوئی تو باپو نے ایک دفعہ سر اٹھایا اور پھر جھک گیا۔ چنن نے ایک مرتبہ کہا "بہن آ گئی" اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

اس نے کونے میں سے کپاس کی سوکھی چھڑیاں اٹھائیں اور انھیں توڑ کر چولھے میں رکھا اور اوپر اُپلے رکھ کر آگ جلائی، تب مٹی کی ہنڈیا میں ساگ پکنے کے لیے رکھ دیا۔

باپو آہستہ سے بولا۔ "آج نمبر دار اور سپاہی پھر آئے تھے۔"

وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔ وہ عالم خیال میں تاریکی کی طرف دیکھنے لگی۔ ان کی بربادی اور تباہی ناچتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ جگ ہنسائی اس کے علاوہ تھی۔ اس نے سرد آہ بھر کر سر جھکا لیا اور کچھ بے چینی سے اٹھی اور آٹا لے کر تنور پر روٹی پکانے چلی گئی۔

روٹی کھاتے وقت باپو نے بتایا کہ سپاہی کہتا تھا کہ اگر پرسوں تک روپے کا انتظام نہ ہو سکا تو گھر کی قرقی کر دی جائے گی۔

انسان پر مصیبت آتی ہے تو ایک نہیں بلکہ سیکڑوں مصائب پے در پے حملہ آور ہو کر انسان کو

بے بس ولاچار بنادیتے ہیں۔

آج گویا آخری دن تھا۔ باپو صبح سے باہر گیا ہوا دوپہر کو گھر واپس آیا۔ اس کے اداس جھریوں دار چہرے سے صاف عیاں تھا کہ روپے کا بندوبست نہ ہو سکا۔ جیتو کی ماں کا ایک سونے کا زیور بیچا تھا۔ کل بائیس روپے جمع ہوئے تھے۔ باقی ایک سو تیس کہاں سے آئیں گے۔ گھر کے مویشی بیچنے سے کچھ روپیہ مل سکتا تھا۔ مگر انھیں سے تو روزی تھی اگر وہ بک گئے تو گویا دال روٹی سے بھی گئے۔ جیتو دوپہر کا کام ختم کر کے گھر سے باہر تھوڑی دیر تک کھلی ہوا میں کھڑی رہی۔ نمبردار ابھی تک نہ آیا تھا لیکن اسے آنا ضرور تھا، اور کل؟ کل تمام دنیا ان کا تماشا دیکھے گی۔

سامنے سے کالی گھٹا جھوم کر اٹھی اور آسمان پر چھا گئی۔

جیتو گوردوارے کی طرف چل دی۔ یہ چھوٹا سا گوردوارہ گاؤں سے کم و بیش تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ عمارت پرانی تھی۔ دو تین کوٹھریاں مسافروں کے واسطے بنی ہوئی تھیں اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا باغ تھا۔

گوردوارے کا کام ایک پرہیزگار اور پاکباز بزرگ کے سپرد تھا۔ جیتو کے باپو کی ان سے گاڑھی چھنتی تھی۔ یہ بزرگ جیتو کو سکھ گوروؤں کی پاک زندگی کے واقعات، ان کی قربانی اور ایثار کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ جس سے جیتو کے دل کو گونہ تسلی ہوتی تھی۔ جب وہ وہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ وہ بزرگ دوسرے گاؤں میں کسی کام کی وجہ سے گئے ہیں۔ اس نے کنوئیں پر اشنان کیا۔ کتاب پاک کے آگے سر جھکایا اور بابا نانک کی درگاہ سے رو رو کر اس مصیبت کے ٹل جانے کی دُعا کرتی رہی۔ پھر اس نے چنبیلی کے پھول چنے اور چنن کے لیے ہار گوندھنے لگی۔ کیونکہ آج صبح اس نے اس سے ہار کا پکا وعدہ کیا تھا۔ اتنے میں بارش شروع ہو گئی۔ خوب موسلادھار ہوئی۔ آخر جب بارش بند ہو گئی اور وہ بزرگ نہ آئے تو جیتو نے ہار اپنے بالوں کے جوڑے سے لپیٹا اور گاؤں کی طرف چل دی۔

بادل ابھی تک چھائے ہوئے تھے۔ روشنی آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ وہ ہنوز گھر سے کافی دور تھی کہ اس نے دیکھا کہ ایک سپاہی اور گاؤں کا نمبردار ان کے گھر سے باہر آرہے ہیں۔ وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس کے پاؤں شل ہو گئے۔ آخر کیا ہوا ہو گا؟ کل...... ہاں کل ڈھول پٹ جائے

گا...... وہ آگے کچھ نہ سوچ سکی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے گھر کی طرف جانے کے بجائے اور ہی کسی طرف چل دی۔ وہ جانتی تھی کہ اس وقت اس کے بوڑھے دادا کی کیا حالت ہو رہی ہو گی۔ مگر اس کا حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ گھر جائے۔ وہ عجب پریشانی میں چلتی گئی نہ معلوم کتنی دور تک...... آخر اس کی ٹانگوں نے جواب دے دیا اور وہ وہیں کھیت کے کنارے بیٹھ گئی۔

ہم دکھ سے اتنا نہیں گھبراتے جتنا کہ دکھ کے تصور سے۔ وہ جانتی تھی کہ اس تکلیف کا سامنا اسے کرنا ہی پڑے گا۔ مگر وہ چاہتی تھی کہ تاریکی چھا جائے اور وہ اندھیرے میں سب کی نظروں سے بچ کر چپکے سے اپنے گھر میں چلی جائے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے گھر کی تصویر آگئی۔ جہاں اس نے بچپن سے اب تک اپنی زندگی کے دن گزارے تھے۔ اور اب وہ گھر غیروں کا ہونے والا تھا۔

تاریکیاں چھانے لگیں۔ آسمان پر اکا دکا تارا جھلملانے لگا۔ مویشی واپس گاؤں کو جا رہے تھے۔ جوہڑ کے کنارے پیلے پیلے مینڈک ٹرا رہے تھے۔ جھاڑیوں میں ٹڈے اپنی تیز آواز سے بول رہے تھے اور گدھ بیریوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

جیتو نے سر اٹھایا۔ سامنے دھندلکے میں تارو کا کچا مکان اور رہٹ نظر آ رہا تھا۔ آج تارو کا کنواں دیکھ کر جیتو پر ایک کیفیت سی طاری ہو گئی۔ پچھلا واقعہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا جب کہ وہ ساگ لینے گئی تھی۔ تارو کی بدمزاجی، اس کی چوڑی کا ٹوٹنا، تارو کا پچھتانا اور اسے ساگ لا کر دینا، اس کا سلیپر دھونا پھر ہاتھ لگا دینا۔ تب سلیپر کھا کر بھی ضبط کرنا، اس کے راستے سے کانٹے صاف کرنا۔ اور اس کی پیشانی سے لہو کا بہنا سب اس کی نظروں کے سامنے پھر گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ تارو میں ہزار عیب سہی مگر دل کا بُرا نہیں اور آج جب کہ اس کا دل اُمڈا آتا تھا وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی داستانِ غم سنے۔ اگر سننے والا ہمدردی کے کلمات بھی کہہ دے تو اس کے دل کو تسلی ہو جائے مگر ایسا ہمدرد تھا کون...... ؟

تارو کے کنوئیں پر اس وقت کیسا امن و سکون تھا۔ اس وقت رہٹ کی روں روں اور مویشیوں کی گھنٹیوں کی ٹن ٹن نے کیا عجب سماں باندھ رکھا تھا۔ شرینہہ کے بلند درخت ہوا میں جھوم رہے تھے۔ ہرے بھرے کھیت میں سفید گھوڑی گھاس چر رہی تھی، گنوں کے کھیت کے پاس کتے کھیل

رہے تھے۔ کبھی دم ہوا میں اٹھا کر عجب انداز سے چلتے، کبھی غرا کر ایک دوسرے پر لپکتے، اور پھر اکٹھے ہو کر نئے کھیل کھیلنے کی تجویزیں سوچنے لگتے۔

جیتو کو خواہ مخواہ یقین ہونے لگا کہ تارو اس کا دکھڑا ضرور ہمدردی سے سنے گا۔ یہ سوچ کر کہ اس طرح سے وقت بھی کٹ جائے گا اور اس کے دل کا بار بھی ہلکا ہو جائے گا۔ وہ کنوئیں کی طرف چل دی۔ مدار کے پیڑوں اور کانٹے دار جھاڑیوں میں سے ہوتی ہوئی وہ کنوئیں پر پہنچ گئی۔ ہری ہری گھاس کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ جیتو نے ادھر اُدھر تارو کو دیکھا۔ مگر وہ نظر نہ آیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی اور کچھ ٹھٹکی۔ ٹھٹک کر بڑھی اور آہستہ سے دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے تارو نے کرخت اور تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

جیتو خاموش رہی۔

"ارے بھئی کون ہے؟ چلے آؤ دروازہ کھلا ہوا ہے۔"

جیتو نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔

تارو اسے دیکھتے ہی اچھل پڑا۔ "آؤ جیتو! تم کیسے رستہ بھول پڑیں؟"

اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ اس نے تارو کی طرف جو کہ پیڑھی پر بیٹھا گنا چوس رہا تھا، دبی نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ "یونہی ادھر آئی تھی۔ سوچا کہ ماں سے ملتی جاؤں۔"

"ماں؟ ماں تو کنوئیں پر بہت کم آتی ہے۔ آتی بھی ہے تو دن کو۔ اس وقت گھر پر ہی رہتی ہے۔"

وہ جانتی تھی کہ تارو کی ماں کنوئیں پر نہیں رہتی، گاؤں میں رہتی ہے۔ بظاہر وہ واپس جانے کے لیے لوٹی تو تارو نے ڈرتے ڈرتے پیڑھی اپنے تلے سے نکال کر اس کی طرف دھکیل دی اور جھجکتے ہوئے بولا۔ "جیتو! اب آئی ہو تو بیٹھو...... اگر تمہیں جلدی نہ ہو تو بیٹھو۔ ساگ لے جاؤ۔ چنن کے لیے گنے لیتی جانا۔ گنے بہت میٹھے ہیں۔"

جیتو پیڑھی لے کر تاریک کونے میں بیٹھ گئی۔ تارو شاید دل میں سمجھا ہو گا کہ ساگ اور گنوں کا داؤ چل گیا۔

تارو نے ٹاٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "آج تو بارش اچھی ہو گئی۔ ہوا مزے کی چل رہی ہے...... کیا تم شربت پیو گی؟ بہت عمدہ گڑ رکھا ہے۔"

"نہیں، پیاس نہیں اس وقت۔"

"اچھا کچھ ہرج نہیں تم گڑ گھر لے جانا اور کل کو شربت بنا کر دیکھنا۔"

"اچھا۔"

"میں نے چنن سے کہا تھا کہ گنے لے جائے، مگر وہ آج تو آیا نہیں۔ اسے یہاں بھیج دیا کرو۔ رستہ جانتا ہی ہے۔ رس (گنوں کا) پی جایا کرے گا اور یہ ہمارے پچھواڑے بیر لگے ہوئے ہیں، لال لال بہت میٹھے۔ میں تو ادھر اُدھر کے چھوکروں کو توڑنے نہیں دیتا۔ میں کہتا ہوں کہ چنن آئے تو کھائے۔ آخر بچہ ہے نا، اسے بیر بہت بھاتے ہیں۔ جب ہم تم چھوٹے تھے، یاد ہے نا، ہم بھی بیر تو کھانے جایا کرتے تھے۔"

"کیوں تارو! تمہارے گنے تو خوب ہوئے ہیں اب کے۔" جیتو نے بات کا رُخ بدل کر کہا۔

"ہاں سب 'واہگورو اکال پرکھ' کی کرپا ہے۔"

وہ خاموش رہی۔

"کہو تو باہر سے گنا لا دوں۔"

"نہیں تارو میرا جی نہیں چاہتا۔"

اب پھر کچھ دیر کے لیے خاموشی رہی۔ تارو اس کی خاموشی کا سبب جاننا چاہتا تھا۔ پھر بہت احتیاط سے کہنے لگا۔ "جیتو!...... مجھے دراصل ڈر لگتا ہے کچھ کہتے ہوئے کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ...... آخر بتاؤ نا تم آج اس قدر خاموش کیوں ہو؟ کیا کوئی خاص بات ہے......؟"

یہ ہمدردی کا کلمہ سن کر جیتو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر تاریکی کی وجہ سے تارو انہیں دیکھ نہ سکا۔ لیکن وہ اپنی بھرائی ہوئی آواز کو چھپا نہ سکی۔ "نہیں تارو...... تمہیں کیا بتاؤں......"

تارو کے چہرے پر سختی کے آثار پیدا ہو گئے۔ آنکھیں غصہ میں چمکنے لگیں۔ وہ کرخت آواز میں کڑک کر بولا۔ "پھمن سنگھ نے کوئی حرکت تو نہیں کی؟ بتادو جیتو! وہ دیکھ سامنے کرپان لٹکی ہوئی ہے۔ میں نے آج ہی تیز کی ہے۔ میں پھمن سنگھ کی بابت تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ مگر اب اس کی موت دور نہیں۔ یہ کرپان اسی کا خون پینے کے لیے رکھی ہے......"

"نہیں تارو۔" جیتو ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "یہ بات نہیں۔ یہ بات بالکل نہیں...... میں بتاتی ہوں۔

تم سے کچھ چھپا نہیں......اصل بات یہ ہے کہ......"

دروازہ آہستہ سے کھلا۔ تارو چیتے کی طرح چوکنا ہو گیا اور اس کا ہاتھ فوراً پاس پڑی ہوئی کلہاڑی پر جا پڑا۔ جیتو نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"کیا میری بہن یہاں ہے؟" چنن نے آہستہ سے دروازے میں سے سر نکال کر تارو سے پوچھا۔

تارو نے اطمینان کا سانس لیا اور کلہاڑی پیچھے کی طرف سرکا دی۔

"چاند! آجاؤ۔ میں یہاں ہوں۔"

چنن دوڑ کر آیا اور اپنی بہن کی گود میں چڑھ بیٹھا۔

"ڈھونڈ لیا نا تمہیں؟ میں تمہیں بہت دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ پھر میں نے سوچا کہ بہن ضرور ہمارے لیے بیر لینے کے لیے تارو کے کنوئیں پر گئی ہو گی۔"

جیتو اس کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے بولی۔ "کیوں رے! تجھے ڈر نہیں لگا اندھیرے میں۔"

"نہیں۔"

تارو بولا۔ "واہ! بھلا شیروں کے بچوں کو بھی کبھی ڈر لگا ہے۔"

چنن نے تارو کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ "اچھا تم نے کہا تھا کہ گنے دیں گے۔ لاؤ اب میں تو بہت سے لوں گا۔"

"آؤ جتنے چاہو لے لو۔"

"اچھا، لاؤ دو۔" یہ کہہ کر وہ گودی سے اترنے لگا۔ مگر پھر رُک گیا۔ ذرا ٹھہرو، ایک بات ہے تمہیں نہیں بتائیں گے۔" پھر بہن کے کان میں کہنے لگا۔ "بہن ہمیں ایک پیسہ دو۔ تم نے کہا تھا۔"

"گھر پر لینا۔"

چنن شانوں کو ہلا کر ضد سے کہنے لگا۔ "نہیں ابھی دو۔"

"تم بہت اچھے ہو چنن۔" جیتو نے چمکارتے ہوئے کہا۔ "اس وقت نہیں۔"

"تو تارو سے لے دو۔"

"اس کے پاس بھی نہیں ہے۔"

"ہے کیوں نہیں...... آج جب تم باہر چلی گئی تھیں۔ تارو ہمارے گھر آیا اور باپو کو اس نے چھن چھن کر کے بہت سے روپے گن دیے......"

"چنن!!" جیتو حیرت سے بولی۔

لیکن چنن اپنی ہی دھن میں تھا۔ "مگر میں تو کہتا ہوں کہ باپو نے بہت برا کیا۔ اس نے شام کو سب روپیہ نمبردار کو دے دیا......"

جیتو کی حیرانی کی حد نہ رہی۔ "مگر تم سے کس نے کہا؟"

"کس نے کہا؟" چنن چیخ کر بولا۔ "میں نے خود دیکھا۔ اچھا بتاؤ اب میں تارو سے پیسے لے لوں؟"

"تم نے خود دیکھا۔" یہ کہہ کر وہ خاموشی سے ہوا میں تاکنے لگی۔ ایک بڑے طوفان اور آندھی کے بعد گویا یکایک بادل پھٹ گئے، ہوا خاموش ہو گئی اور ہر طرف بالکل امن و سکون ہو گیا۔ اس کے دماغ کی پریشانیاں دور ہو گئیں۔ اس کے دل پر سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا۔ اس محویت کے عالم میں اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب چنن نے تارو سے پیسہ لیا۔ اور کب وہ کنویں پر سے گنے لینے کے لیے باہر دوڑ گیا اور کب تارو اپنی جگہ سے اٹھ کر بھینس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس راحت آمیز محویت میں جیتو کو تارو کا خیال آیا، وہی دنیا میں اس کا سچا ہمدرد تھا۔ کس قدر نیک۔ اتنی دیر باتیں کرنے کے باوجود اس نے ان روپوں کا اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا۔ وہ روپے اس نے کس قدر مصیبتوں سے جمع کیے تھے۔ مگر اس نے اپنی ذاتی خواہش پر اس کی ضرورت کو ترجیح دی۔

تارو کا خیال آتے ہی اس کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ جب اس نے اس سے کہا تھا کہ وہ ہر کام خراب نیت سے کرتا ہے۔ یہ کیسے بے معنی اور خود غرضانہ الفاظ تھے۔ وہ اس کی زخمی پیشانی، وہ بہتا ہوا خون، وہ اس کا ضبط و تحمل۔ جیتو چونکی اور اس کی آنکھیں تارو کو ڈھونڈھنے لگیں جو کہ اس کی طرف پشت کیے بھینس کے پاس کھڑا تھا۔ جیتو اس کے پاس جا کر آہستہ سے بولی۔ "تارو!"

وہ خاموش رہا۔

"میری طرف دیکھو تارو۔"

تارو نے دیکھا کہ جیتو کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں۔ وہ اپنی بھاری آواز میں بولا۔ "روتی کیوں ہو جیتو۔ میں تو ہر وقت اسی کوشش میں رہتا ہوں کہ تمہارے کام آسکوں، مجھے اس دن کا اپنی حرکت پر بہت افسوس ہے۔"

جیتو نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا جس جگہ کہ اس کے کمبخت ہاتھوں نے سلیپر مارا تھا۔ پھر دھیرے سے کہنے لگی:

"تارو اب میں جاتی ہوں۔ میں پھر آؤں گی، اب تم آرام کرو، ہاں۔ میں پھر آؤں گی۔"

یہ کہہ کر وہ واپس پیڑھی کے پاس آئی اور سلیپر پہن کر لوٹی تو دیکھا کہ تارو راستہ روکے دروازے کے آگے کھڑا ہے۔ وہ مسکرا کر اپنے کرخت لہجہ میں بولا۔ "جیتو! آج پھر میری نیت خراب ہو رہی ہے۔ آج پھر سزا دے دو۔"

جیتو نے جھینپ کر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ تارو پر ڈالی پھر جسم چراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی، اپنے جوڑے سے چنبیلی کا ہار کھولا اور کچھ مسکرا کر اور کچھ لجا کر وہ ہار اس کے گلے میں ڈال دیا۔

تارو نے راستے سے ہٹ کر دروازہ کھول دیا۔

آگے چنن گنے لیے بھاگا آرہا تھا۔ جیتو نے گنے تھام لیے اور اسے گود میں اٹھالیا۔ گوبر اور کیچڑ سے پاؤں بچاتی ہوئی چل دی۔ چنن اس کے گلے کے گرد باہیں حمائل کر کے کہنے لگا۔ "بہن، تارو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ تمہیں کیسا لگتا ہے۔"

جیتو دل ہی دل میں شرما گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہ کوئی سن تو نہیں رہا، جواب دیا "ہاں چنن! تارو مجھے بھی...... تارو بہت اچھا آدمی ہے۔"

جیتو کو اب بھی تارو کے گانے کی بھاری اور بے سری آواز سنائی دے رہی تھی:

نِکا گھڑا چک لچھیے! تیرے لک نوں جرب نہ آوے
نِکا گھڑا چک لچھیے!

# راستہ چلتی عورت

یہ کوئی شعلہ نہیں تھا، بلکہ بوٹا سنگھ کی نئی نویلی بیر بہوٹی سی دلہن کے سرخ دوپٹے کا آنچل تھا، جو تیز گرم ہوا کے جھونکوں میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

اب وہ کوٹ گوراں نام کے گاؤں کے قریب پہنچ چکے تھے، شادی کے بعد پہلی بار بوٹا سنگھ بیوی کو اس کے میکے سے اپنے گاؤں کو لے جا رہا تھا۔ تقریباً آدھا راستہ طے ہو چکا تھا، کیونکہ کوٹ گوراں آدھے راستے پر واقع تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ اور گرمی کی شدت کی حد نہیں تھی۔ کوٹ گوراں کے لوگ انتہائی گرمی کا یہ وقفہ کسی قدر آرام سے گزارنے کے لیے گاؤں کے باہر شر-نہہ کے اونچے اور گھنے پیڑوں کے جھنڈ کی چھاؤں تلے گزارتے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی وہ وہاں جمع ہو کر اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے۔ کوئی شطرنج کھیل رہا تھا، کوئی چوسر۔ کوئی باتیں بنا رہا تھا تو کوئی اونگھ رہا تھا۔ بعض لوگ گھروں سے ہلکی پھلکی چارپائیاں اٹھا لائے تھے اور بعض زمین پر ہی بوریا بچھائے ہوئے تھے۔ البتہ جگیر سنگھ اپنے لفنگے ساتھیوں کے ساتھ الگ محفل جمائے ہوئے تھے۔ وہ محض درشنی جوان ہی نہیں تھا بلکہ بیچ پچ دم خم کا مالک تھا اور اپنے چیلے چانٹوں میں سب سے ممتاز تھا۔ کچھ دن پہلے تیز و تند آندھی

کے طوفان میں شر ینہہ کے اونچے پیڑ کی ایک بھاری بھر کم ڈالی چرچرا کر زمین پر آگری تھی۔ جگیر اور اس کے آٹھ دس ساتھی اسی سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ اس وقت وہ محض آپس کی گپ شپ سے محظوظ ہو رہے تھے۔ جگیر اپنی ایک فٹ کی کرپان سے ایک چھوٹی سی شاخ کو بائیں ہاتھ میں تھامے آہستہ آہستہ چھیل رہا تھا۔ اس بے مصرف کام کے دوران میں رہ رہ کر اس کی باچھیں چڑی جاتی تھیں۔ اس کے اجڈ چہرے سے خشونت کے آثار ہویدا تھے۔ اس کے ساتھی غیر ضروری انہماک کے ساتھ یا تو اس کے ہاتھوں کی جانب دیکھ رہے تھے یا شکاری جانور جیسی مستعدی کے ساتھ اِدھر اُدھر تاک رہے تھے۔ اچانک انھوں نے دور سے آتی دلہن کو دیکھا تو پر معنی انداز میں ہلکے سے کھانس کر ایک نے جگیر کے کولہے پر کہنی کا ٹہوکا دیا۔

پہسا، یعنی وہ چوڑی راہ گزر جس پر بوٹا سنگھ اپنی بیوی کے ساتھ چلا آرہا تھا، پیڑوں کے اس جھنڈ کے قریب سے ہی گزرتی تھی۔ سامنے کچھ فاصلے پر گوردوارے کی چھوٹی سی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے گنبد پر ایک جھنڈا لہرا رہا تھا جس کا رنگ کبھی گہرا زرد رہا ہوگا تاہم اس پر ایک چکر، دو کرپانوں اور ایک کھڑے کھنڈے کا نشان اب تک معدوم نہیں ہوا تھا۔

وہاں پر موجود ایک بھی شخص ایسا نہیں تھا جس کی نظر بے اختیار اس دلہن کی طرف نہ اٹھ گئی ہو، جو ایسی دکھائی دیتی تھی جیسے ابھی ابھی کسی باکمال کمہار کے چاک سے اتاری گئی ہو۔ جگیر اور اس کے ساتھیوں کی نگاہیں تو گویا دلہن کے چندن سے بدن پر پیوست ہو کر رہ گئیں۔

جیسے جیسے دلہن قریب آتی گئی، یہ حقیقت اور بھی واضح ہوتی گئی کہ لڑکی واقعی نایاب تھی۔ اس کے آگے چلتے ہوئے بوٹا سنگھ کی شان بھی نرالی تھی۔ دیکھنے میں وہ کوئی لحیم شحیم کڑیل جوان نہیں تھا۔ اس کا قد میانہ، جسم اکہرا اور تیور مردانہ تھے۔ چال میں ناگ کا سا لہرا تھا۔ دوہرے شملے والی پگڑی سے کج کلاہی ٹپکتی تھی۔ سانولے سلونے چہرے پر عجب دمک تھی۔ ہاتھ میں ہلکی پھلکی لاٹھی تھی۔

جب یہ جوڑا ان سب لوگوں کے سامنے سے گزر رہا تھا تو یکایک جگیر سنگھ ایک خاص انداز سے کھانس اٹھا۔

بوٹا سنگھ رک گیا۔

ان دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے الجھ کر رہ گئیں۔ پل بھر کے تامل کے بعد بوٹا سنگھ مسکرایا تو اس کے سامنے والے اوپر کے دونوں دانتوں میں پیوست سونے کی ننھی ننھی کیلیں دمکنے لگیں۔ وہ جگیر کو آنکھوں آنکھوں میں تولتے ہوئے بھاری آواز میں بولا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کچھ تکلیپھ ہے۔"

"ہے تو۔" جگیر نے پُراسرار اور پُرمعنی انداز میں ایک نظر دلہن پر ڈالی۔

"ایسی ویسی بھاگی بھگائی لڑکی نہیں ہے۔ میری بیاہتا جورو ہے۔"

"تو بھائی، اپنا راستہ ناپیے۔"

"سو تو ناپ ہی رہے تھے، لیکن آپ کو کچھ تکلیپھ میں پا کر رکنا پڑا۔"

"تکلیپھ کی بات چھوڑو، مگر ایک پرشن جرور اٹھتا ہے۔"

بوٹا سنگھ نے کھڑے کھڑے پہلو بدلا "پرشن؟"

جگیر نے زور سے زمین پر تھوک کر جواب دیا "پرشن اٹھتا ہے کہ جو لوگ گلے میں ہیرے لٹکائے پھرتے ہیں انھیں اس بات کا پربندھ بھی کر لینا چاہیے کہ کہیں کوئی اجنبی جھپٹا نہ مار لے جائے۔"

گاؤں کے سب ہی لوگ جانتے تھے کہ راہ گیروں پر بے جا آوازے کسنا جگیر اور اس کی ٹولی کا شیوہ تھا۔ مگر آج وہ حد سے کہیں آگے نکل گئے تھے۔ یہ کسی کی بھی نظر میں پسندیدہ بات نہیں تھی۔

"سمجھا۔" بوٹا سنگھ دبے دبے قہر میں ڈوبی آواز میں غرایا۔

سب لوگ غیر معمولی لفڑے کے لیے تیار ہو گئے۔

بوٹا سنگھ نے اپنی لاٹھی دلہن کے حوالے کی اور پھر اس نے آگے سے تہبند کو سمیٹ کر پورے پلو کو دونوں رانوں میں گھما کر اسے پیچھے کی طرف سے نیچے پہنے ہوئے کچھے (جانگیے) کے نیفے تک اچھی طرح ٹھونس لیا۔ جوتے اتار کر ایک طرف رکھ دیے۔ پھر لاٹھی ہاتھ میں لے کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

سب لوگ ایک ٹک اس کی ہر حرکت غور سے دیکھ رہے تھے۔

اس نے لاٹھی کو پہلے اپنی ایک انگلی پر ٹکا کر ہوا میں اٹھایا۔ لمحہ بھر رکنے کے بعد اس نے لاٹھی کو ہوا میں خوب اوپر تک اچھالا۔ جب لاٹھی اوپر سے نیچے کی طرف گری تو اس نے اسے دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر دسوں انگلیوں پر نچانا شروع کر دیا۔ عجب تماشا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے لاٹھی کسی قسم کا ساز ہے، جس کے تاروں پر بوٹا سنگھ کی تیزی سے چلتی ہوئی انگلیاں رقصاں تھیں۔ کیا مجال جو لاٹھی اس کی انگلیوں کی گرفت سے نکل کر گر جائے۔

لاٹھی پر اپنی گرفت کے کمال کا مظاہرہ کرنے کے بعد بوٹا سنگھ نے اسے دونوں ہاتھوں میں تھام کر چاروں طرف گھمانا شروع کر دیا...... وہ پینترے پر پینترا بدلنے لگا۔ سرک لگاتا ہوا کبھی اِدھر کبھی اُدھر نکل جاتا۔ اس کی ٹانگوں میں گویا بجلی بھری تھی۔ پاؤں کے نیچے سے دھول کے ہلکے ہلکے بادل بلبلا کر ہوا میں اٹھنے لگے۔ کچھ لمحے تو ایسے آئے جب دیکھنے والوں کو لاٹھی نہیں محض اس کا کوندتا ہوا سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ لاٹھی تھی کہ بپھرا ہوا ناگ۔ ایسا لگتا تھا کہ نہ جانے کتنے ناگ فضا میں پھنکار رہے ہیں۔ اس امر میں تو کوئی شبہ نہ رہا تھا کہ اگر بوٹا سنگھ حملہ آوروں سے گھرا ہوتا تو اس وقت تک اس کی لاٹھی نہ معلوم کتنوں کا خون چاٹ چکی ہوتی اور نہ جانے کتنی لاشیں زمین پر بچھ چکی ہوتیں۔

آخر بوٹا سنگھ نے لاٹھی روک دی اور اس کی بونجی موٹھ پر ٹھوڑی ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دھیرے دھیرے آنکھوں کی پتلیاں گھما گھما کر وہاں موجود اشخاص کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

ہر شخص دم بخود بیٹھا یا کھڑا تھا۔

اب بوٹا سنگھ نے جگیر سنگھ پر نظر جما دی، جو ابھی تک اسی ٹہنی کو چھیلے جا رہا تھا۔ کچھ توقف کے بعد بوٹا سنگھ نے اس سے کہا "جو سوال آپ نے اٹھایا تھا اس کا جواب تو میں نے دے دیا۔ اب میرے من میں ایک سوال اٹھا ہے جس کا جواب مجھے ملنا چاہیے۔"

روئے سخن جگیر کی طرف تھا، جو بدستور کرپان سے ٹہنی چھیلے جا رہا تھا۔

بوٹا کہتا گیا: "یہاں سے آگے بڑھنے کے بعد جو ہوگا اس سے تو میں نمٹ لوں گا، لیکن سوال یہ ہے کہ اس گاؤں میں بھی تو کوئی نہ کوئی اپنے باپ کے تخم سے اور اپنی ماں کا لال ہوگا۔ جس کے دل میں پرائے ہیرے اڑانے کا چاؤ ہوگا۔"

اس سے آگے بوٹا سنگھ جو کہنا چاہتا، وہ تو اس نے دانستہ طور پر یا نادانستہ طور پر نہیں کہا...... تاہم اس کی بات ادھوری ہونے پر بھی مکمل تھی۔

ظاہر تھا کہ یہ جگیر کے لیے کھلا چیلنج تھا۔ دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ لوگ باگ یہ دیکھنے کے منتظر تھے کہ کیا جگیر اور اس کے ساتھی بوٹا سنگھ پر ٹوٹ پڑیں گے...... اب جگیر کرپان ہاتھ سے رکھ کر قدم بہ قدم بوٹا سنگھ کی طرف بڑھا اور قریب پہنچ کر مسکراتے ہوئے گہری آواز میں بولا "سردار جی، اس گاؤں میں نہ تو کوئی اپنے باپ کے تخم سے ہے اور نہ اپنی ماں کا لال ہے۔"

اتنا کہہ کر جگیر الٹے قدموں لوٹ گیا۔

ایک بار پھر دونوں راہ گیر اپنے راستے پر ہو لیے۔ پیچھے عورت چکوری کی طرح چلتی ہوئی، آگے مرد، جس کی پگڑی کا شملہ اصیل مرغ کی کلغی کی طرح ہوا میں سر بلند کیے ہوئے تھا۔

# تین باتیں

رویل سنگھ گوردوارہ ڈیرہ صاحب کے صحن میں سویا ہوتا تو اسے منہ اندھیرے ہی جاگنا پڑتا۔ چونکہ گوردوارے میں صبح ہی صبح شبد کیرتن شروع ہو جاتا تھا اور صحن کی صفائی کے لیے مسافروں کو جگانا پڑتا تھا۔ اس لیے چھت پر دیر تک سویا رہا۔ یہاں تک کہ سورج نکل آیا اور تیز دھوپ میں شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ کا کلس جگمگا اٹھا۔

کیرتن شروع ہو چکا تھا اور گروپریم کے متوالے نرونار ی جمع ہو رہے تھے۔ رویل سنگھ کو اپنی غفلت پر بڑی شرم محسوس ہوئی۔ جب وہ گاؤں میں تھا تو کبھی اتنی دیر سے نہیں اٹھا تھا لیکن جب سے وہ لاہور میں آیا تھا، دن بھر آوارہ گردی کرنے کے بعد اس قدر تھک جاتا تھا کہ طلوع آفتاب تک غٹ رہتا تھا۔

لیٹے لیٹے اس نے اپنے پاؤں پر نگاہ ڈالی، اس کے پاؤں بڑے بڑے تھے اور ٹخنوں کی ہڈیاں کسی بیل کی ہڈیوں سے کم نہ تھیں۔ اس کی ٹانگیں بہت لمبی تھیں۔ اور لمبی دوڑوں میں حصہ لینے کی وجہ سے وہ مضبوط اور خوش وضع ہو گئی تھیں۔

کچھ دیر اسی طرح لیٹے رہنے کے بعد وہ دفعتاً اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

جو لوگ رات کو اس کے ساتھ چھت پر سوئے تھے۔ ان میں سے بیشتر جا چکے تھے۔ اس نے صحن کی طرف جھانک کر دیکھا جہاں عورتیں چھوٹے چھوٹے گھونگھٹ نکالے ہاتھوں میں دونے اور کٹوریاں تھامے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔

اپنے گھر میں بھی وہ اسی طرح اچھل کر اٹھ بیٹھتا تھا۔ یہاں اسے کوئی کام نہ تھا۔ پہاڑ سا دن کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ چار دنوں سے وہ گوردوارے کے لنگر سے روٹی کھا رہا تھا۔ تھوڑی سی نقدی جو اس کے پاس تھی وہ شربت اور لسی پینے کے لیے۔ اس کے پاس صرف چند آنے باقی رہ گئے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے بعد اس کا گزارہ کیسے ہوگا۔ وہ شرافت کا کچھ ایسا قائل بھی نہ تھا۔ وہ سٹے ہوئے کلوں والے بنیوں کو بڑی خوف ناک نظروں سے گھورا کرتا تھا، لیکن یہ لاہور تھا۔ ایک گہما گہمی...... متواتر آمد و رفت...... کوئی اکا دکا مل جائے تو وہ ایک ہی دھول جما کر اپنا شکار ہتیا لے۔ اسے یاد آیا کہ...... پانچ چھ ماہ پہلے وہ اور اس کے ساتھی گاؤں کے ایک ساہوکار کے گھر میں آدھی رات کے وقت جا گھسے۔ جب کچھ ہاتھ نہ آیا تو جلدی میں انھوں نے تیرہ بوریاں گیہوں کی اڑالیں۔ لیکن پکڑ لیے گئے۔ تین ساتھی تو سزا پا کر بڑے گھر پہنچ گئے۔ مگر وہ اور اس کے ایک ساتھی کا جرم ثابت نہ ہو سکا...... آئندہ کے لیے اس نے توبہ تو نہ کی، البتہ محتاط ہو گیا...... احتیاط کی چند اور وجہیں بھی تھیں...... ایک تو گرفتاری کی صورت میں اسے بچانے والا کوئی نہ تھا، باپ مر چکا تھا اور ماں بیچاری بے دست و پا تھی۔ دوسرے امر کور جس کے ساتھ اسے بہت زیادہ محبت تھی اور جو نازک اندام اور دھارمک خیالات کی لڑکی تھی۔ اس سے کہنے لگی کہ اگر تم جیل چلے گئے تو میں کچھ کھا کر مر جاؤں گی۔ رویل سنگھ جانتا تھا کہ وہ ضدی لڑکی جو کچھ کہتی ہے اسے پورا کر دکھائے گی۔ چنانچہ اس کی محبوبہ اور اس کی ماں نے مل جل کر اسے اس بات پر رضا مند کر ہی لیا کہ وہ شہر میں جا کر کوئی نوکری تلاش کرے۔ تاکہ وہ لوگ آرام سے زندگی بسر کر سکیں۔

اس کی محبوبہ امر کور اپنی عمر کی نسبت کہیں زیادہ سیانی اور دور اندیش تھی۔ اس نے رویل سنگھ کے دل میں بجائے آوارگی کے گھر کا پیار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کا ایک گھر ہوگا۔ وہ دونوں خوب مزے میں بڑے پیار سے اکٹھے رہا کریں گے۔ ان کے ہاں ننھے منے بچے پیدا ہوں گے۔ پھر انھیں کتنی

خوشی حاصل ہو گی۔ رویل سنگھ کا کند ذہن ان باتوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کا اکھڑ دل گھر کی کشش سے بیگانہ ہی رہا لیکن جب شام کے دھندلکے میں کسّی کی پٹڑی پر امر کور گیلی مٹی کا تسلہ سر پر جمائے ہنس ہنس کر اس قسم کی باتیں کرتی تو اس کی تیزی سے گھومنے والی چمکدار آنکھیں اور پتلے پتلے ہونٹ اسے بہت ہی بھلے معلوم ہوتے تھے، اس کی زبان باچھوں پر گھلنے لگتی۔ جیسے امر کور مٹھائی کا دونا ہو۔ اگر وہ امر کور کا ایسا ہی شیدائی تھا تو گھر، گھر کا پیار، اور بچے تو معمولی باتیں تھیں۔ لیکن جب امر کور دیکھتی کہ وہ اس کی باتوں کی طرف دھیان دینے کے بجائے حریص نظروں سے اس کے گالوں اور ہونٹوں کی طرف دیکھ رہا ہے تو سٹ پٹا کر ٹوٹے ہوئے سپرنگ والی گھڑی کی طرح خاموش ہو جاتی۔ "او ہو ہو ہو۔" رویل سنگھ اسے دونوں بازوؤں میں اچک لیتا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں متحرک ہو جاتیں۔ "بھئی امرو! دیکھو منہ مت پھلاؤ۔ دھرم سے جو تم کہو گی وہی کروں گا۔"

"تو میں کیا کہہ رہی تھی...... تم سے" امر کور چمک کر پوچھتی۔

"سنو امرو! میری موٹی عقل ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی۔ تم مجھے سمجھانے کی کوشش مت کرو۔ بس مجھے اتا بتا دو کہ میں کیا کروں؟"

پھر وہ اس کے تمتماتے ہوئے گالوں پر ہونٹ رکھ دیتا۔ امرو اسے پیار کرنے کی چھٹی بھی دے دیتی اور ساتھ ہی ملامت بھی جاری رکھتی۔ "دیکھو!...... کوئی آ رہا ہے......؟ کوئی دیکھ لے گا!...... اب میں یہاں کبھی نہیں آؤں گی اس جگہ...... بس دیکھ لینا، ہاں!......"

ان کے گھر کے قریب ہی امرو کی گائے بندھی رہتی تھی۔ شام کے وقت امرو وہاں دودھ دوہنے کے لیے آتی تھی۔ جب وہ ادھر سے گزرتا تو اُچک کر ایک نظر ادھر ضرور ڈالتا اگر امرو دکھائی دیتی تو پہلے اِدھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کر لیتا اور پھر اسے مخاطب کر کے گنگنانے لگتا۔

نی...... مُچھیے بادام رنگیے
تینوں لین کبوتر آیا

......"جو بولے سو نہال"...... گرو کے متوالوں نے نعرہ لگایا تو رویل سنگھ چونک اٹھا۔ اب پرشاد بانٹا ہی جانے والا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنا کنگھا سنبھالا اور منتشر بالوں کو سمیٹنے کے بعد

جلدی سے پگڑی باندھی اور چادر کندھے پر ڈال کر تہمد کی سلوٹیں درست کرتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے دیے اور پگڑی کے شملے سے چہرہ پونچھا۔ گوردوارے کے دروازے پر نہنگ سکھوں کو کھڑے دیکھ کر بڑے عقیدت مندانہ انداز سے پاؤں بھی دھو ڈالے اور دروازے کی چوکھٹ پھلانگ کر اندر داخل ہوا۔ پہلے ایک مرتبہ اس نے غلطی سے چوکھٹ پر پاؤں رکھ دیا تھا۔ تو سیوادار نے اسے آنکھیں دکھا کر ٹوک دیا تھا۔

پرشاد بانٹا جا رہا تھا۔ اس نے پہلے تو سامنے سے ہاتھ بڑھا کر پرشاد لیا۔ پھر پینترا بدل کر دوسری طرف ہاتھ بڑھا کر پرشاد لے لیا۔ پرشاد دینے والے کو ذرا شک گزرا۔ جب ذرا چکر کاٹ کر اس نے تیسری مرتبہ ہاتھ بڑھائے تو پرشاد بانٹنے والے کو غصہ آ گیا۔ "سردار جی! بڑے افسوس کی بات ہے۔" واقعی بات افسوس کی تھی۔ لیکن وہ صبح کو اسی حلوے سے ناشتہ کیا کرتا تھا۔ اور اوپر سے پاؤ بھر دہی کی لسی پی لیتا تھا۔ گاؤں میں تو ہر شخص کو پاؤ بھر حلوا دیا جاتا تھا لیکن یہاں......؟ یہ شہری لوگ چھ ماشہ حلوہ دے کر رہ جاتے تھے۔ چنانچہ رویل سنگھ نے کہا۔ "گیانی جی! اتنا سا حلوہ تو ہم نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے...... یہ تو بس ہتھیلیوں سے چپک کر رہ جاتا ہے۔"

پرشاد بانٹنے والے کے تیور بگڑ گئے۔ "سردار صاحب! پرشاد آخر پرشاد ہے...... اس کا یہ مطلب نہیں کہ پرشاد ہی سے پیٹ بھر لیا جائے۔"

رویل سنگھ اس قسم کی منطق سے واقف نہیں تھا۔ چپ چاپ ایک طرف سرک کر کھڑا ہو گیا۔ جب سبھی متوالے چلے گئے تو وہ ایک کونے میں سیمنٹ کے سرد فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں گیانی جی نمودار ہوئے اور ایک بڑے دونے میں پاؤ، ڈیڑھ پاؤ حلوا ڈال کر اسے دے گئے۔ رویل سنگھ حیران رہ گیا۔ جب حلوا کھا کر وہ باہر نکلا، تو پاؤ بھر دہی میں سیر بھر پانی ڈال کر لسی پینے لگا۔

لسی پینے کے بعد وہ سیدھا بڈھے دریا کی طرف چل دیا۔ دو دن پہلے وہ سردار بدھ سنگھ چوب فروش کے ہاں گیا تھا۔ وہ ان کے گاؤں ہی کے رہنے والے تھے۔ انھیں ایک ملازم کی ضرورت تھی۔ اور وہ رویل سنگھ کو نوکری دینے پر رضامند ہو گئے تھے لیکن یہ الفاظ بدھ سنگھ کے بیٹے ہرنام سنگھ نے کہے تھے۔ اسی لیے وہ بدھ سنگھ سے ملنے کے لیے آج پھر وہاں آیا تھا۔ بدھ سنگھ کو مصروف دیکھ کر

رویل سنگھ کونے میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔

رویل سنگھ کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ دو جماعتیں پاس کر چکا تھا۔ تیسری جماعت میں ایک مرتبہ ماسٹر نے اسے زیادہ دیر تک مرغا بنائے رکھا تو اس نے پڑھنا لکھنا ترک کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے انگریزی پڑھنے کی کوشش بھی کی تھی۔ چنانچہ وہ "اے" سے "زیڈ" تک سارے حروف پڑھ لیتا تھا اور ان میں سے بعض لکھ بھی سکتا تھا۔

فراغت پا کر بدھ سنگھ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی نظر کمزور تھی اور کان بھی کچھ بہرے تھے۔ چنانچہ رویل سنگھ کو اس کے قریب پہنچ کر اور چلا چلا کر اپنا مدعا بیان کرنا پڑا۔ بمشکل بڈھے نے بتایا کہ ان کے پہلے ملازم کا خط کل ہی آیا ہے۔ اور وہ دو چار روز تک واپس آنے والا ہے۔ اس لیے وہ اسے نہیں رکھ سکتے۔

ادھر سے جواب پا کر رویل سنگھ نے سبیل سے پانی پیا اور شہر کی طرف چل دیا۔ اب وہ بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا آج سیر کر کے کل گاؤں واپس چلا جائے۔ وہ بڑی بڑی امیدیں لے کر شہر میں آیا تھا لیکن اب کیا منہ لے کر واپس جائے گا۔ وہ ایک بے فکر اور آوارہ مزاج نوجوان تھا۔ اس قسم کی پابندیوں اور مجبوریوں سے کبھی دو چار نہیں ہوا تھا۔ گھومتے گھامتے وہ شاہی محلہ کے نزدیک ایک دھرمشالہ میں پہنچ گیا۔ وہ دن میں ایک آدھ مرتبہ اس دھرمسالہ میں چلا آیا کرتا تھا۔ یہاں کا گرنتھی البیلی طبیعت کا نوجوان شخص تھا۔ ان دونوں میں کچھ بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر رویل سنگھ نے اسے کبھی اپنا رازدان نہیں بنایا تھا۔ گرنتھی اسے ابھی تک ایک کھاتا پیتا زمیندار سمجھتا تھا۔

وقت کٹی کے لیے رویل سنگھ دوپہر کو وہاں پہنچ جاتا۔ وہ دونوں فرش پر ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کرتے ... اور برقی پنکھے تلے اینٹوں کے بنے ہوئے سرد فرش پر لیٹ جاتے، ادھر اُدھر کی گپیں ہانکتے رہتے۔ نیند آتی تو سو بھی جاتے۔

آج وہ وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ جب سیڑھیاں چڑھ کر ہال میں داخل ہونے لگا تو دیکھا کہ پہلو والے کمرے میں گرنتھی ریٹھوں کے پانی سے سر دھو رہا ہے۔ اسے دیکھ کر گرنتھی نے قہقہہ لگایا۔ دو چار باتوں کے بعد رویل سنگھ اندر چلا گیا۔ اس نے صراحی سے گلاس میں پانی انڈیلا اور

آہستہ آہستہ پینے لگا۔ دراصل اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ کئی دنوں سے وہ لنگر کی روٹیاں کھا رہا تھا۔ اب اسے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اب وہ کم از کم ایک وقت کا کھانا وہاں سے نہیں کھائے گا۔

پنکھا چھوڑ کر اس نے پگڑی اتاری اور فرش پر لیٹ گیا۔ گرنتھی نہانے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کیے جاتا تھا۔ اس کی بے تکی باتوں سے رویل سنگھ اپنی بھوک کو بہلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد گرنتھی اپنے لمبے لمبے بال نچوڑتا ہوا اندر داخل ہوا اور ایک بڑے مزے کی بات شروع کر دی۔

اتنے میں ایک شخص انھیں کھانے پر بلانے آیا۔ شرادھوں کے دن تھے۔ رویل سنگھ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ آج پیٹ بھر کھانا ملے گا۔ معمولی سے تکلف کے بعد کھانے میں شریک ہو گیا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد اس پر ایسی گہری نیند چھائی کہ شام تک اس کی آنکھ نہ کھلی۔

اٹھتے ہی اس نے نل کے ٹھنڈے پانی سے اشنان کیا تو طبیعت کھل گئی۔ گرنتھی نے شکر کے ٹھنڈے شربت میں ستو گھول رکھے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے دو لوٹے پیے۔ وہ ستوؤں کا بڑا شوقین تھا۔

دوبارہ پگڑی باندھ کر اس نے گرنتھی سے مصافحہ کیا۔ اور اس نے بتایا کہ اس کا کام ختم ہو چکا ہے۔ اور وہ کل اپنے گاؤں لوٹ رہا ہے۔ اس پر گرنتھی نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور تاکید کی کہ "وہ جب کبھی لاہور آئے تو اسے ضرور ملے۔"

یہاں سے وہ بازار کی سیر کرنے کے لیے چل کھڑا ہوا۔ انارکلی میں گھومتا ہوا وہ نیلا گنبد جا نکلا۔ وہاں سے اس نے لکڑی کے بڑے بڑے تختوں پر مختلف قسم کی تصویریں دیکھیں۔ ایک تصویر میں پہاڑ کا منظر دکھایا گیا تھا۔ پہاڑ میں جگہ جگہ بل بنے ہوئے تھے۔ اِدھر اُدھر پتھروں پر بڑے بڑے چوہے دوڑتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ نیچے لکھا تھا۔ "جاپانی چوہے ہیں انھیں مار بھگاؤ۔" یہ تصویر دیکھ کر رویل سنگھ بہت خوش ہوا۔ خصوصاً چوہوں کی صورتیں بڑی مضحکہ خیز تھیں۔ یعنی جسم تو چوہے کے مانند اور سر انسانوں کے۔ بعض چوہوں نے عینکیں بھی لگا رکھی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ جب وہ گاؤں میں جا کر امر کور سے ان چوہوں کا ذکر کرے گا، تو وہ کس قدر خوش ہو گی۔ کتنی حیران

ہو گی...... پھر اس نے دماغ پر زور دیا کہ آخر یہ جاپانی کون ہیں؟ یہ کس قسم کے چوہے ہوتے ہیں۔ اس نے آج تک ایسے چوہے نہیں دیکھے تھے۔ اس نے پگڑی سرکائی، سر کھجایا، غور کیا، لیکن کچھ نہ سمجھ سکا۔

اتنے میں کسی نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ یہ اس کا پرانا دوست ہر سا سنگھ تھا۔ دھوپ میں اس کا چہرہ کالے بوٹوں کی طرح چمک رہا تھا۔ آدھی پگڑی سر پر بندھی ہوئی تھی اور آدھی اِدھر اُدھر جھول رہی تھی۔ رویل سنگھ اچھل کر اس سے بغل گیر ہو گیا۔

ہر سا سنگھ بھاڑوں کے خاندان سے تھا۔ رویل سنگھ کو اس سے خاص انس تھا۔ ہر سا سنگھ مضبوط جسم کا شیر دل شخص تھا۔ اسے ایسے ایسے ہتھکنڈے یاد تھے کہ بڑے بڑے استاد ان کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ دونوں بچپن ہی سے بہت گہرے دوست تھے۔ ہر سا سنگھ کبڈی کھیلنے میں طاق تھا۔ اس کا جسم مچھلی کی طرح چکنا اور خرگوش کی مانند پھرتیلا تھا۔ اور وہ بھیڑیے کی طرح خونخوار اور مکار تھا۔ جوان ہوتے ہی اس نے بڑے پیمانے پر ڈاکے ڈالنے شروع کر دیے تھے۔ اس نے علاقہ کے ایک نامی ڈاکو سندر سنگھ سے بھی ساز باز کی تھی۔ اور ان دونوں نے مل کر بڑے بڑے میدان مارے تھے۔ بعد میں سندر سنگھ کو پھانسی ہو گئی اور ہر سا سنگھ روپوش ہو گیا۔ آج اسے اپنے سامنے دیکھ کر رویل سنگھ کو بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ دونوں ایک حلوائی کی دُکان میں داخل ہوئے۔ ہر سا سنگھ نے دو سیر مٹھائی خریدی۔ اور مٹھائی کھانے کے بعد دونوں نے پیٹ بھر کر لسی پی۔

ہر سا سنگھ نے اسے بتایا کہ اس نے ضلع امر تسر میں دو ایسے گھر تاڑ رکھے ہیں جہاں سے مال اڑانا چنداں مشکل نہیں ہے۔ یہ سن کر رویل سنگھ بہت خوش ہوا۔ اس قسم کی گفتگو سے اسے گہری دلچسپی تھی۔ اس نے مستقبل کا نہایت دلفریب تصور باندھا، اور ان دونوں میں عہد و پیمان ہو گیا کہ وہ کل پھر اسی جگہ ملیں گے۔ یہ طے کر کے وہ دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

ہر سا سنگھ کے چلے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک رویل سنگھ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل پر سے بھاری پتھر ہٹ گیا ہو۔ لیکن جب اسے امرو کا خیال آیا تو وہ کچھ مایوس سا ہو گیا۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ اس نے پھر ڈاکے ڈالنے شروع کیے ہیں، تو یقیناً بگڑ جائے گی۔ اسے چور کی بیوی بننا

کبھی پسند نہ تھا۔ اس پر اس نے دل ہی دل میں امرو کو دو تین گالیاں بھی دیں ...... لیکن وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ اس لیے اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پھر سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ اگر یہ ممکن ہو سکے کہ وہ صرف ایک بار ڈاکہ ڈال لے پھر چاہے زندگی بھر کے لیے اس پیشے کو خیر باد کہہ دے۔ لیکن اگر وہ گرفتار ہو گیا تو اس کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ امرو سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ ماں کو علیحدہ دکھ ہو گا اور وہ خود جیل میں پڑا سڑے گا۔

اس ادھیڑ بن میں وہ چلا جا رہا تھا۔ اگرچہ یہ کام بہت مشکل تھا لیکن وہ صحت ور اور مضبوط ہونے کے باوجود نکار تھا، اور وہ نہیں جانتا تھا کہ آخر وہ کیا کرے۔ سڑکوں پر بے شمار موٹریں، بیش قیمت کپڑے پہنے ہوئے امیر لوگ اعلیٰ سے اعلیٰ دکانیں اور اونچے اونچے مکانات دیکھ کر وہ حیران ہو رہا تھا۔ آخر ان سب کے لیے اس قدر روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ وہ کیوں اپنی محبوبہ کے ساتھ پرامن زندگی بسر کرنے سے معذور ہے؟ اسی قسم کے خیالات میں ڈوبا ہوا وہ ایک باغ میں جا نکلا۔ ایک روش کے کنارے بڑے بڑے سے بورڈ پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا:

"بہادری کے صلہ میں۔"

وہ سوچنے لگا کہ "صلہ کیا ہوتا ہے۔ پھر وہ غور سے اس تمغہ کی طرف دیکھنے لگا جس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ "وکٹوریہ کراس ...... منگل سنگھ آٹھویں راجپوتانہ رائفلس کو بہادری کے صلہ میں وکٹوریہ کراس دیا گیا۔"

وہ نہیں جانتا تھا کہ وکٹوریہ کراس ہوتا کیا ہے اور کیسی بہادری پر دیا جاتا ہے اور پھر وکٹوریہ کراس ملنے کے بعد کیا ہوتا ہے...... اکتا کر وہ پرے ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اسے اپنی کم عقلی پر بہت ہی افسوس ہوا۔ وہ پھر اپنے خیالات میں کھو گیا اور اپنی پیشانی کو انگلیوں سے بجا بجا کر سوچنے لگا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ وہ ہر سا سنگھ سے ملے یا نہ ملے۔

وہ گھاس پر لیٹ گیا۔ ایک بازو سر کے نیچے رکھ لیا۔ دوسرا پیشانی پر اور نیم وا آنکھوں سے دور دور تک نظر دوڑانے لگا۔ سامنے ٹھنڈی سڑک کے پرلے سرے پر بہت لمبا چوڑا تختہ آویزاں کیا گیا۔ اس پر ایک خوبصورت عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس عورت کا چہرہ اس کے پورے قد کے برابر تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں اور سرخ سرخ گالوں والی بہت حسین عورت تھی۔ وہ حیران ہوا کہ آخر

یہ کس عورت کا فوٹو ہے۔ نیچے انگریزی کے موٹے موٹے حروف میں کچھ لکھا تھا۔اس نے سوچا شاید کسی میم کی تصویر ہو۔ حالانکہ اس نے دیسی کپڑے پہن رکھے تھے مگر اس نے سنا تھا کہ اب میمیں بھی دیسی کپڑے پہننے لگی ہیں۔ لیکن اس تصویر کو سر بازار دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔ غیر مردوں کے سامنے اپنے حسن کی نمائش کیوں کی گئی تھی۔ پھر وہ تصویر کی لمبائی چوڑائی کو دیکھ دیکھ کر حیران ہونے لگا۔ "بلے بلے" ...... اس بورڈ کے ساتھ ایک اور چھوٹا سا تختہ تھا۔اس پر موٹے موٹے حروف میں کچھ لکھا تھا۔اس نے پیشانی سے ہاتھ ہٹا کر آنکھیں اور بھی زیادہ کھول لیں۔ دیر تک غور کرنے کے بعد وہ پڑھ سکا۔

"انڈین آرمڈ کور

کو آپ جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔"

وہ اچھل پڑا۔ یہ انڈین آرمڈ کور نیا ہی نام ہے۔ ہربنس کور، پریم کور، جیت کور تو اس نے سن رکھے ہیں۔ لیکن انڈین آرمڈ کور بالکل نیا نام ہے۔ شاید کسی انگریز عورت کا نام ہو۔ ادھر اُدھر کچھ لوگ گھوم رہے تھے۔اس کے دل میں آئی کہ کسی سے اس عورت کی بابت دریافت کرے۔ لیکن کسی عورت کا معاملہ تھا۔اس قسم کی بات بیباکی سے پوچھتے ہوئے اسے شرم سی محسوس ہوئی چنانچہ اس کے دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔ آخر اس نے اپنی چادر کو تہ کر کے اسے سر کے نیچے رکھا اور لیٹ گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہوا میں ایک لطیف سی نمی تھی۔اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ لیٹے لیٹے وہ انڈین آرمڈ کور کی بابت پھر سوچنے لگا۔ رفتہ رفتہ اسے کچھ سمجھ آنے لگی کہ اس عورت کی تصویر نصب کرنے کا کیا مقصد ہے؟ اس نے سنا تھا کہ لاہور میں بڑی بڑی بدمعاشیاں ہوتی ہیں۔ لیکن کیا کوئی عورت اس قدر جرأت کر سکتی ہے کہ اپنی تصویر اس طرح سر بازار کھڑی کر کے دوسرے تختے پر لکھوا دے کہ "انڈین آرمڈ کور" کو آپ جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے......
اس نے پریوں کی کہانیوں میں ایک خوبصورت ملکہ کا قصہ سنا تھا۔اس کی جوانی بس ایک قیامت تھی جو بھی اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لیتا ہوش و حواس کھو بیٹھتا۔ وہ نت نئے نوجوانوں سے گٹھ جوڑ کرتی اور جب وہ بے کار ہو جاتے تو انھیں مگرمچھوں کے تالاب میں پھنکوا دیتی...... مگر وہ تو کہانی تھی۔

لیکن یہ عورت؟...... آخر اسے نوجوانوں کی کیا ضرورت ہے؟ کیا اس کا چال چلن بھی خراب ہے۔ کیا یہ بھی نوجوانوں کو بے کار کر کے پرے پھینک دیتی ہوگی۔ کیا گورنمنٹ نے کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جو ایسی بدکار اور نوجوانوں کو برباد کر دینے والی عورت پر لاگو ہو سکے۔

رفتہ رفتہ باغ میں آمد و رفت بڑھنے لگی۔ کالی کالی مامائیں بچوں کی گاڑیاں دھکیلتی ہوئی آئیں۔ چند شوقین مزاج کالجیٹ چھوکرے انگریزی میں گٹ مٹ کرتے ہوئے اِدھر اُدھر مٹر گشت کرنے لگے۔ کئی بوڑھے کھوسٹ اپنی چکنی کھوپڑیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بنچوں پر آ بیٹھے۔ قریب کے درخت سے ریڈیو کی آواز آنے لگی۔ اس نے پہلے بھی ریڈیو سنا تھا۔ لیکن باغ میں دفعتاً ریڈیو کی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ اِدھر اُدھر کے لوگ بھی ریڈیو والے درخت کے قریب زمین پر بیٹھ گئے۔ اس نے اپنی ڈھیلی ڈھالی پگڑی کو درست کیا اور سنبھل بیٹھا۔ اتنے میں ریڈیو سے مرزا صاحباں کے بول سنائی دیے۔ اس کے دل پر سرور طاری ہو گیا...... ایک چھابڑی والا ادھر آ نکلا۔ اس نے جیب ٹٹول کر دیکھی۔ ایک ٹکا بچ گیا تھا۔ اب یہی اس کی کائنات تھی۔ اس نے چھابڑی والے کو آواز دے کر دو پیسے کے کچالو لیے اور انھیں تنکے سے اڑس اڑس کر کھانے لگا۔

کچالو کھانے کے بعد وہ اٹھا، نل سے پانی پیا، اور مونچھیں پونچھتا ہوا ریڈیو والے درخت کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک اور بڑا تختہ لگا ہوا تھا۔ جس پر نیچے اوپر تین آدمی بھاگے چلے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے تین آدمی بندوقیں تھامے ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ ہر جوڑے کے ساتھ حاشیے میں لکھا تھا۔

اٹلی میں دشمن کو بھگانے والا کون؟ پنجابی جوان!

جرمنوں کو کون بھگا رہا ہے؟ پنجابی جوان!

جاپانیوں کو کون بھگائے گا؟ پنجابی جوان!

وہ غور سے ان تصویروں کو دیکھنے لگا۔ کیسی مضحکہ خیز صورتیں بنا رکھی ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بھاگنے اور بھگانے والے لکڑی کے بنے ہوئے ہوں۔ وہ دیر تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بورڈ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک لمبی جمائی لی، اور زور سے کھانس کر بلغم اگلا اور آنکھیں جھپکتا ہوا ریڈیو کی طرف بڑھا۔ آواز درخت کی ٹہنیوں میں سے آ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر رات کو درخت پر

چڑھ کر ریڈیو اڑا لیا جائے تو کیسی رہے۔ وہ درخت کے تنے اور ٹہنیوں پر نظر دوڑا دوڑا کر اوپر چڑھنے کے امکانات پر غور کرنے لگا۔ جب اس نے اِدھر اُدھر گھوم کر دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ درخت پر سوائے بھونپو کے اور کچھ بھی نہیں۔ ایک بابو نے اسے بتایا کہ ریڈیو پرے سرکاری کمرے میں بند ہے۔ وہاں سے بجلی کا ایک تار درخت سے باندھ دیا گیا ہے اور تار کے آگے بھونپو لگایا گیا ہے۔

رویل سنگھ مایوس ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ یہاں بھی چھوٹے چھوٹے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ ایک پر لکھا تھا...... ''ہندوستان کو بچاؤ۔'' اس نے اپنے کسے ہوئے جوڑے کو ڈھیلا کیا اور سوچنے لگا کہ ہندوستان کہاں ہے؟ وہ یوپی کے لوگوں کو ہندوستانی سمجھتا تھا اور بس اتنا جانتا تھا کہ پورب کی جانب کوئی دیس ہے۔ جسے لوگ ہندوستان کہتے ہیں۔ وہاں کے لوگ دبلے پتلے سے ہوتے ہیں۔ ان کی زبان بھی خوب ''چٹر پٹر'' سی ہوتی ہے۔ پھر وہ دل ہی دل میں کہنے لگا۔ نا معلوم بچارے ہندوستان پر کیا آفت آن پڑی ہے؟ آہستہ آہستہ وہ پھر اپنی الجھنوں میں گم ہو گیا۔ اتنے میں کسی عورت نے ریڈیو پر پنجابی گیت گانا شروع کیا:

وے پنجابی جواناں!...... وے ویرا تینتھوں
جرمن جاپانی تھر تھر کمبدے

وہ تنکے سے دانت کریدنے لگا۔ اب اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ آج وہ ذرا جلد ہی گوردوارے پہنچ جائے گا۔ ورنہ اگر کھانے کا وقت ختم ہو گیا تو اسے پھر بھوکا رہنا پڑے گا۔

لاہور میں اس کا جی نہیں لگا۔ اسے اس بات کا دلی رنج تھا کہ اسے کوئی نوکری نہیں مل سکی...... اس کے قریب بیٹھا ہوا لڑکا ایک دوسرا بورڈ پڑھنے لگا:

''انڈیا کی جے۔''

''آ جاؤ نوجوان، دشمن بھاگ رہا ہے۔ یہی موقع ہے اس کا پیچھا کرنے کا۔''

ایک سپاہی لوہے کی ٹوپی پہنے اور دونوں ہاتھ اٹھائے للکار رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بندوق تھی۔ دوسرا خالی تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے اور سپاہی بھی چلے آ رہے تھے۔

رویل سنگھ نے پھر ہاتھ پھیلائے اور منہ کھول کر ایک لمبی سی جمائی لی۔

اس کے منہ کے چوڑے دہانے میں موٹے سے موٹے دشمن کی کھوپڑی آسکتی ہے۔ اور اس کی فولادی انگلیاں تگڑے سے تگڑے دشمن کا ٹینٹوا دبا سکتی ہیں۔ لیکن دشمن تھا کدھر؟

اس کی بھوک تیز ہوتی جا رہی تھی۔ دماغ میں خیالات کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگ شور مچا رہے تھے۔ ریڈیو گیت سنا رہا تھا۔ کتے بھونک رہے تھے...... وہ چادر جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ گوردو کے لنگر میں وقت سے پہلے پہنچ جانا چاہتا تھا۔

جب وہ باغ کے پھاٹک سے گزرنے لگا تو اس نے ایک اور بڑا سا تختہ دیکھا۔ اس پر ایک فوجی سکھ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ جس کے گالوں پر خوب چربی چڑھی ہوئی تھی۔ خوشنما داڑھی خوب کس کر بندھی ہوئی تھی اور سر پر گول سی دوہری پگڑی بندھی تھی...... اس کے ایک ہاتھ کی تین انگلیاں اٹھی ہوئی تھیں۔ دوسرے ہاتھ کی ایک انگلی سے وہ ان انگلیوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا:

۳ باتیں:

"اچھی خوراک!"

"اچھی تنخواہ!"

"جلدی ترقی!"

اور نیچے لکھا ہوا تھا:

"کھانا مفت ملتا ہے۔ وردی، بوٹ اور تنخواہ سب کچھ مفت ہی مفت۔ گھر جانے کے لیے چھٹیاں بھی پوری تنخواہ پر۔"

رویل سنگھ کچھ دیر تک اس تختے کی طرف گھورتا رہا۔ پھر اپنی لمبی زبان ہونٹوں اور باچھوں پر پھیری...... اور پھر پتہ پوچھتا ہوا بھرتی کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔

# کالے کوس

چھوٹا سا قافلہ، جو تین عورتوں اور ایک مرد پر مشتمل تھا، دم لینے کے لیے کنوئیں کے قریب ڈیرا ڈالے تھا۔

وہ لوگ مسلمان تھے...... اور وہ دن اس سرزمین کو آزادی ملنے کے دن تھے جسے آج کل پاکستان اور ہندوستان کہتے ہیں۔

مرد، ۳۲ یا ۳۳ برس کا گرانڈیل شخص تھا۔ سر پر چھوٹی سی پگڑی کے دو چار بل...... گلے میں کرتہ، اس کے نیچے چوڑی نیلی دھاری کا تہبند...... ناک نقشے میں کوئی عیب نہیں تھا۔ داڑھی استرے کی یورش سے کئی دنوں سے بے نیاز تھی۔ مونچھیں خوب بڑی بڑی، کبوتروں کے پروں کی مانند، نیچے کو گری ہوئیں۔ آنکھیں، متجسس اور تیز جن میں اب تھکن کے آثار ہویدا تھے، جسم کے پھیلے ہوئے ڈھانچے، لمبی لمبی بانہوں، اور طویل ٹانگوں کے باوجود وہ موٹا نہیں تھا۔ اس کے بدن کی پرورش میں ڈنڈ، بیٹھک، اور باداموں کا ہاتھ نہیں بلکہ اس کے جسم کے ریشے ریشے کی پرورش گیہوں یا مکی کے آٹے اور ساگ بھات پر ہوئی تھی۔ اس کا نام غلام محمد عرف گاماں تھا...... وہ اچھا آدمی نہیں تھا...... اس میں ایک ہی اچھی بات تھی، وہ یہ کہ اسے نیک ہونے کا دعویٰ نہیں تھا۔ یہ چیز اس کے چہرے ہی سے ظاہر تھی۔

تین عورتیں...... ایک بوڑھی، ایک جوان اور ایک نوخیز، بالترتیب اس کی ماں، بیوی اور بہن تھیں۔

بوڑھی پانچوں نمازیں پڑھ پڑھ کر سارے ہندوؤں خصوصاً سکھوں کے نیست و نابود ہو جانے کی دعائیں مانگا کرتی تھی سوائے پھلور سنگھ کے...... پھلور سنگھ عرف پھلورا اس کے بیٹے کا دوست تھا۔

بیوی کی عمر پچیس برس کے قریب تھی۔ سیدھے سادے خدوخال...... شادی کو آٹھ برس گزر چکے تھے لیکن ایک بلونگا تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ گامے کے دوست پر معنی انداز سے اسے کہنیوں سے ٹہوکے دے کے پوچھتے۔ "کہو استاد! آخر ماجرا کیا ہے؟" ...... اس پر گاماں اچھا انسان نہ ہونے کے باوجود لمحہ بھر کے لیے آسمان کی جانب دیکھتا اور کہتا...... "جو اللہ کی مرضی!"

"ہاں بھئی آڑے وقت میں اللہ کے سوا اور کون کام آتا ہے!"

اس کی بہن عاشاں حسین اور نازک اندام تھی۔ اس اعتبار سے وہ گامے سے بہت مختلف تھی...... اس کی بابت گامے نے اڑتی ہوئی خبر سنی تھی کہ وہ گاؤں کے ایک چھوکرے اللہ دتے کو میٹھی نظروں سے دیکھتی ہے اور اللہ دتہ بھی اس کے فراق میں سرد آہیں بھرتا ہے...... گاما نے تہیہ کر لیا تھا کہ جب کبھی وہ انھیں اکٹھا دیکھ پائے گا تو گنڈاسے سے ان کے سر اڑ دے گا، لیکن باوجود کوشش کے گامے کو اس افواہ کی صداقت کا ثبوت نہیں مل سکا۔

چار ناخوش انسانوں کا یہ خانماں برباد قافلہ پیادہ پا پاکستان کو جا رہا تھا۔

ان کی کہانی دوسرے لاکھوں مسلمانوں کی کہانی تھی جو مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب کو جانے کے لیے مجبور کیے گئے تھے۔

گاماں...... لیٹرا بھی تھا اور قاتل بھی۔ بدمعاش بھی تھا اور ڈاکو بھی...... لیکن ان سب برائیوں کے باوجود وہ کسان تھا...... ہل چلانا اور بیج بونا اس کا آبائی پیشہ تھا۔

ملک کی تقسیم کے بعد دفعتاً ساری خدائی ان کی دشمن ہو گئی۔ گھر کی چار دیواری تک انھیں بھینچ کر مار ڈالنے کی دھمکیاں دینے لگی۔ وہ دھرتی جو پہلے بجائے ماں کے تھی، اب گرم ہو کر اس قدر تپ گئی تھی کہ اس پر اس بچوں کا چلنا پھرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ زمین جو پہلے ان کا پسینہ جذب کر کے

سونا اگلتی تھی، اب ان کا خون پی کر بھی مطمئن نہیں ہوتی تھی، چنانچہ ایک روز گامے نے گھر آکر کہا۔ "اب ہمیں جانا ہی ہوگا۔"

سامان؟

اس پر وہ تلخ ہنسی ہنسا اور اس نے تینوں عورتوں کو بکریوں کے مانند گھر سے باہر ہانک دیا۔

اس کے بعد خونی نظارے، آگ، دہشت، بھوک اور پیاس...... مسلسل...... پھلور سنگھ، گامے کا دوست تھا۔ برے کاموں میں دونوں ساتھی رہے تھے۔ مل کر انھوں نے اچھا کام کبھی نہیں کیا تھا۔ پھلور سنگھ نے مشورہ دیا کہ ان کا کسی بڑے قافلے کے ہمراہ جانا خطرے سے خالی نہیں۔ چنانچہ گامے نے سب کچھ پھلورے پر چھوڑ دیا اور وہ راتوں رات چوری چھپے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک پہنچا دیتا۔ دن کے وقت وہ لوگ آرام کرتے اور رات ہوتے ہی پھر سفر شروع کر دیتے۔

ایک رات پھلورے کے آنے میں کچھ دیر ہو گئی تو مالک مکان جو ڈرپوک تھا، ان سے کہنے لگا، بھئی! آج رات حملے کا سخت خطرہ ہے۔ ان کا وہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔ ورنہ وہ خود بھی جان سے ہاتھ دھوئیں گے اور اسے بھی پھنسادیں گے۔

گاؤں سے باہر بھی جان کا خطرہ کم نہیں تھا لیکن مجبوری کے عالم میں گاماں اللہ کا نام لے کر، تینوں عورتوں سمیت وہاں سے چل کھڑا ہوا۔

ہر چند گاماں مضبوط انسان تھا، اسے اپنے زورِ بازو پر بھروسہ بھی تھا لیکن مسلح ہجوم کا مقابلہ کرنا اس کی قوت سے باہر تھا اور پھر عورتوں کا ساتھ!

انھوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ دن کے وقت کھیتوں، جھاڑیوں یا کسی اندھے کنوئیں میں چھپ جاتے اور رات بھیگ جانے پر چل کھڑے ہوتے۔

انھیں پھلورا سنگھ سے جدا ہوئے دو راتیں گزر چکی تھیں اور تیسری گزر رہی تھی۔

رات بھیگ چکی تھی لیکن انھوں نے ابھی سفر جاری نہیں کیا تھا۔

چاندنی رات تھی لیکن آسمان پر ہلکا سا غبار چھایا ہوا تھا اس لیے چاندنی بہت اداس دکھائی دے رہی تھی۔

اس وقت وہ ایک ایسے کنوئیں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جو ایک مدت سے ویران پڑا تھا۔ کنوئیں

کی مینڈھ گر چکی تھی۔ دو کچی دیواریں اس امر کی گواہ تھیں کہ کبھی یہاں بھی رہٹ کی روں روں سنائی دیتی ہو گی۔ شاید الغوزوں کی تانیں بھی اڑتی ہوں گی اور چنچل کنواریوں کے نقرئی قہقہے بھی فضا میں گونجتے ہوں......

یہ مقام سطح زمین سے قدرے بلند تھا۔ گاماں سر اٹھا کر دور دور تک نگاہ دوڑا رہا تھا۔ وہ اندازاً مغرب کی جانب بڑھ رہے تھے، لیکن انہیں اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہیں اور پاکستان کی حدود سے کتنی دور ہیں۔

وہ قریب قریب نڈھال ہو چکے تھے۔ کاش پھلورے کا ساتھ نہ چھوٹتا تو شاید اب تک وہ منزل مقصود تک پہنچ گئے ہوتے۔

بوڑھی ماں کے ڈھیلے ڈھالے چہرے میں جھانکتی ہوئی بے رونق آنکھوں سے حیرت اور درماندگی کا اظہار ہوتا تھا۔ اپنی طویل زندگی میں اس نے اس قسم کے واقعات دیکھے نہ سنے تھے...... بیوی، بھوک، مسلسل پریشانی اور عزت و آبرو کے خوف سے بالکل نڈھال ہو چکی تھی۔ اس کا سر ڈھلک کر دیوار سے ٹک گیا تھا...... عاشاں، وہ نسبتاً تازہ دم تھی۔ ایک تو خیر عمر کا تقاضا تھا اور پھر شاید اسے خطرے کی اہمیت اور نوعیت کا پورا پورا احساس بھی نہیں تھا۔ اس کے بوجھل بالوں نے جھک کر اس کے چہرے کے بہت بڑے حصے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ البتہ اس کے نازک لب، ترشی ہوئی حسین ناک اور گھنی بھنویں صاف دکھائی دے رہی تھیں...... پھیکی چاندنی نے اس کی صورت کو خواب ناک بنا دیا تھا۔

بیٹھے بیٹھے گاما سوچنے لگا۔ ممکن ہے، عاشاں اور اللہ دتے والی بات درست ہو...... اب اس قسم کے خیال سے وہ ناخوش نہیں ہوا...... ننھی منھی بھولی بھالی فاختہ سی بہن کبھی کبھار اچٹتی ہوئی نظروں سے بھائی کی جانب دیکھ لیتی اور پھر آنکھیں جھپکا لیتی...... وہ بچپن ہی سے بھائی سے سخت ڈرتی تھی تاہم وہ اکثر بھائی کی سلامتی کے پیارے پیارے سوز بھرے گیت گایا کرتی۔

دفعتاً ہوا چلنے لگی۔ پیپل کی پتیوں نے تالیاں بجا بجا کر گامے کو چونکا دیا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بوجھل آواز میں بولا۔ "اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

عورتیں کچھ تامل کے بعد گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان میں سے کسی کو بھی پتہ نہیں تھا کہ انھیں کدھر جانا ہے۔ سب لوگ بوجھل قدموں سے ایک سمت کو چل دیئے۔

آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ کنوئیں سے کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ گامے کے قدم رک گئے۔ عورتیں بھی رک گئیں۔

زمین ناہموار تھی۔ دور دور تک آبادی کا کوئی نشان نہیں ملتا تھا اور پھر آبادی سے انھیں کیا سروکار؟ ان کے جسم تھک کر چور ہو چکے تھے۔ بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ مارے بھوک کے انھیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کلیجہ کسی بھاری پتھر کے نیچے دب گیا ہو۔

گاماں کھوئی کھوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ قریب ہی اینٹوں کا بھٹہ تھا وہ بھی سنسان پڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا مدت سے اسے یونہی چھوڑ دیا گیا ہے...... حدِ نگاہ تک کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ان کے حق میں یہ بات اچھی تھی، لیکن تکلیف دہ بات یہ تھی کہ منزل مقصود کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ ابھی غالباً انھیں ان گنت کوسوں کا فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ ان گنت کوس! اس کے ذہن میں الجھن سی پیدا ہونے لگی۔ اس نے گھوم کر عورتوں کی جانب دیکھا۔ انھیں دیکھ کر اسے بڑا رحم آیا۔ یہ معصوم، بے گناہ، سادہ لوح صورتیں!

پھر اس نے کھیت کی مینڈھ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آؤ تھوڑی دیر آرام کرلیں۔"

وہ سب ایک لفظ تک کہے بغیر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے اتنا بھی تو نہیں کہا کہ ابھی تو ہم دو فرلانگ بھی نہیں چلیں، آرام کی کیا ضرورت ہے۔

کھیتوں کے سلسلے پھیلتے ہوئے افق میں گم ہو رہے تھے۔ جہاں آسمان تپتی ہوئی زمین کے لب چومتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ہر جانب بار بار نظر دوڑائی اور پھر زیرِ لب بڑبڑایا۔ "نہ معلوم پاکستان کہاں ہے"۔

بوڑھی ماں نے آسمان کی جانب نظر اٹھا کر کہا۔ "اللہ! ہمیں ملت کی سرزمین تک جلد پہنچا دے۔"

وہ عفت مآب عورتیں اپنی آبرو کے لیے فکر مند ہو رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ ایک مرتبہ وہ آبرومندی کے ساتھ پاکستان کی سرزمین تک پہنچ جائیں۔ خواہ وہاں پہنچتے ہی ان کو موت آجائے۔

انھیں اپنی جانیں ایسی پیاری نہیں تھیں۔

گامے نے تاروں سے نظر ہٹا کر دونوں ہاتھوں میں کھیت کی بھر بھری مٹی کو اٹھایا اور اسے بڑے انہماک سے دیکھنے لگا۔ اس نے اسے دبا کر اس کے لمس کو محسوس کیا۔ اس نے ہوا کو سونگھا۔ طول ذعریض جال کے مانند پھیلی ہوئی کھیتوں کی مینڈھوں پر نگاہ دوڑائی جو ایک دوسری کو کاٹتی چھانٹتی افق تک پھیل گئی تھیں...... لیکن گامے کی نگاہیں پاکستان کی زمین، پاکستان کی مٹی، پاکستان کے کھیتوں اور پاکستان کی جھاڑیوں کی متلاشی تھیں۔

فضا مغموم تھی لیکن وہاں اس قدر سکون اور امن تھا کہ ایک مرتبہ تو ان عورتوں کی بھی یقین سا ہونے لگا کہ کالی کملی والا ضرور انھیں باعزت تمام منزلِ مقصود تک......

معاً ایک جھٹکے کے ساتھ گاماں چوکنا ہو گیا۔ اس نے مضبوط مچھلیوں والا بازو حفاظت کے انداز سے عورتوں کے آگے پھیلا دیا۔ دوسرا ہاتھ چشم زدن میں چھری تک پہنچ گیا۔ اس کے طاقتور بازوؤں کے پٹھے پھڑ پھڑانے لگے۔ اس کی متجسس آنکھیں بھٹے کی جانب ایک نقطے پر جم گئیں۔

آخر ہے کیا؟...... لیکن یہ سوال عورتوں کے لبوں تک نہیں آسکا۔

اب گاما عظیم الجثہ اصیل مرغ کے مانند بازو پھیلائے، قدم زمین میں گاڑ گاڑ کر آگے بڑھتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ "اس بھٹے کے پیچھے ضرور آدمی چھپے بیٹھے ہیں۔"

انھیں بھی ایک شخص کی جھلک دکھائی دی۔ عورتوں نے سوچا کہ اب اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی کوئی سبیل نہیں ہو سکتی۔

چند لمحوں بعد ٹوٹی پھوٹی اینٹوں اور مٹی کے ٹیلوں کے پیچھے سے ایک آدمی نمودار ہوا...... وہ سکھ تھا۔

وہ تن تنہا آگے بڑھنے لگا۔ وہ بھی گامے کے مانند لمبا تڑنگا شخص تھا۔ حرکات و سکنات سے وہ بھی شریف انسان دکھائی نہیں دیتا تھا...... اس کے پیچھے...... اس کے پیچھے اور کوئی نہیں تھا۔ شاید اس کے ساتھی بھٹے کے پیچھے چھپے بیٹھے تھے۔

وہ قدم بقدم آگے بڑھ رہا تھا۔

گاماں رک گیا۔ دھندلی روشنی میں وہ سایہ قریب سے قریب تر آتا گیا۔ یہاں تک کہ گامے

کے اعصاب کا تناؤ نقطۂ عروج تک پہنچ کر دفعتاً صفر پر آگیا۔ غالباً..... نہیں یقیناً نووارد پھلورا تھا۔

اور پھر نسبتاً بلند نعروں سے انھوں نے ایک دوسرے کا استقبال کیا۔

آتے ہی پھلورے نے پہلے عورتوں کا جائزہ لیا۔ سب کو صحیح سلامت پا کر بولا۔ "شکر ہے! شکر ہے!"

گامے نے مسکرا کر کہا۔ "ہم سب سلامت ہیں۔"

"لیکن تم لوگ تنہا کیوں چلے آئے تھے۔ میرا انتظار کیوں نہیں کیا تم نے......"

گامے نے سارا قصہ کہہ سنایا۔

اس پر پھلورے نے غل مچا کر کہا۔ "یہ تو تمھیں گھر سے نکالنے والے کی انتہائی حماقت تھی اور تمہاری بھی بے وقوفی تھی۔ افوہ! وہاں پہنچ کر میں بہت پریشان تھا۔ یہ درست تھا کہ کچھ خطرہ پیدا ہو چلا تھا، لیکن تمھیں بآسانی چھپایا جاسکتا تھا۔ اس دن سے تمہاری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ یہی فکر تھی کہ کہیں فسادیوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔"

ماں بولی۔ "بیٹا! اللہ کے فضل سے ہمارا بال تک بیکا نہیں ہوا، لیکن ہمارے یہ دن تو بہت ہی مصیبت میں کٹے ہیں۔ ہمیں تو یہ امید بھی نہیں رہی تھی کہ تم ہمیں دوبارہ ملو گے......"

"واہ جی واہ۔" پھلورے نے اور شور مچا کر کہا۔ "بھلا تمہارے دل میں اس قسم کے خیالات پیدا ہی کیوں ہوئے۔ دیکھو نا! تمہارے پیروں کے نشانات دیکھ کر یہاں تک آن پہنچا ہوں۔"

فضا میں دونوں غیر شریف مردوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اداس چاندنی رات میں چہل پہل نظر آنے لگی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ عورتوں نے بڑے اطمینان کا سانس لیا۔ جیسے اب ان کی مدد پر پوری فوج پہنچ گئی ہو...... پھلورا جو اس بڑھیا کے ہاتھوں میں پل کر جوان ہوا باتیں کیے جا رہا تھا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہو چکیں تو گامے نے کہا۔ "یار! ہم تو اٹکل پچو چلے آئے ہیں۔ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آئے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا......"

یہ کہہ کر وہ وہیں رُک گیا اور آنکھیں سکیڑ کر دور دور تک نگاہیں دوڑانے لگا کہ شاید کہیں پاکستان کی سرزمین دکھائی دے۔

اس پر پھلورے نے گامے کو ایک بازو میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اوئے گامیاں! اب تو تم پاکستان پہنچ چکے ہو۔ تم کیا سمجھے بیٹھے تھے...... کہ وہاں پہنچنے کے لیے دریا پہاڑ پھاندنے پڑیں گے؟"

گاماں ہکا بکا رہ گیا۔ ہکلا کر بولا "سچ؟...... کہاں ہے پاکستان؟"

یہ کہہ کر وہ پھر آنکھیں سکیڑ کر افق کی جانب دیکھنے لگا۔

عورتوں کے لبوں پر بھی مسکراہٹ کی لہریں دوڑنے لگیں۔

پھلورے نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ رہے پاکستان کے کھیت۔"

سب لوگ پھلورے کے ساتھ ساتھ تیز تیز قدم اٹھا کر چلنے لگے۔ بمشکل ایک فرلانگ دور پہنچ کر پھلورا رک گیا۔ پھر ہاتھ سے اشارہ کر کے بولا۔ "لو اب یہاں سے پاکستان کے کھیت شروع ہو جاتے ہیں۔ تم سیدھے چلے جاؤ۔ کہیں پولیس یا فوج کی چوکی تک پہنچ جاؤ گے یا کسی گاؤں میں جا پہنچو گے...... اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں......"

عورتوں نے جنگلی چکوریوں کی طرح اپنی رفتار تیز کر دی۔ گاماں دو کھیت تو تیر کی سی تیزی کے ساتھ پار کر گیا اور پھر رکا۔ تینوں عورتیں لپکتی ہوئی اس کے پیچھے چلی آ رہی تھیں۔ تیز چلنے کے باعث وہ ہانپنے لگی تھیں۔

گامے کی باچھوں میں سے ہنسی پھوٹی پڑتی تھی۔ گھوم کر کہنے لگا۔ "اماں! ہم پاکستان پہنچ گئے ہیں۔"

معصوم عورتوں نے رک کر نظریں ادھر اُدھر دوڑائیں اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

گامے نے قدرے توقف کے بعد جھک کر دونوں ہاتھوں میں کھیت کی بھر بھری مٹی بھر لی اور اسے اپنے چہرے کے قریب لے آیا۔ چند لمحوں تک اسے غور سے دیکھتا رہا۔ دبا کر اس کے لمس کو محسوس کیا، ہوا کو سونگھا، پھر سر گھما کر طویل و عریض جال کی مانند پھیلی ہوئی کھیتوں کی مینڈھوں پر نگاہ دوڑائی جو ایک دوسرے کو کاٹتی چھانٹتی افق تک چلی گئی تھیں......

اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔

پھر اسے احساس ہوا کہ پھلورا اس کے ساتھ نہیں ہے...... پھلورا دو کھیت پرے دھندلی چاندنی میں اڑیل ٹٹو کی طرح زمین پر پاؤں جمائے کھڑا تھا۔

چند لمحوں تک وہ سب چپ چاپ اس کی جانب دیکھتے رہے۔

بلند و بالا پھلورا سنگھ کی ڈھیلی ڈھالی پگڑی کے شملے ہوا میں لہرا رہے تھے اور اس کی طویل لاٹھی

کی برنجی شام اس کے داہنے کان کی لو کو چوم رہی تھی۔

عمر رسیدہ ماں نے پھلورے کی طرف دیکھا اور پھر پس منظر میں جھلکتے ہوئے ستاروں پر نظر دوڑا کر دل میں کہنے لگی۔ میں پانچوں وقت نماز کے بعد اللہ سے اس شخص کے حق میں دعا مانگا کروں گی۔

سادہ لوح عورت یہ بھول گئی کہ کیا اس شخص کے حق میں دعا مانگنے پر شانِ کریمی سب کے گناہ معاف کر دے گی؟

الوداع کہنے کے لیے گاماں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا اپنے دوست کی جانب بڑھا...... اس کے پاؤں من من کے ہو رہے تھے...... وہ جانتا تھا کہ پھلورا دو کھیت پرے کیوں رک گیا ہے۔

جب دونوں قریب قریب کھڑے ہوئے تو قد و قامت اور ڈیل ڈول میں دونوں برابر تھے۔

پھلورے کے پر خشونت چہرے پر بھدی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی...... جیسے وہ کہہ رہا ہو۔

"گامے! تم سرزمین پاکستان سے مجھے ملنے کے لیے واپس آئے ہو۔"

گاماں نے اپنے بلند قد کو اور بھی بلند کیا اور ایک مرتبہ پھر اپنے سامنے کھڑے ہوئے کڑیل کسان سے آنکھیں ملائیں۔ اس کی گھنی مونچھیں متحرک ہوئیں۔ اس نے پھلورے کا چوڑا چکلا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر...... جیسے اثبات میں سر ہلاتے اس نے بھرپور مردانہ آواز میں جواب دیا۔

"آہو پھلوریا!"

# لمحے

سوم کا دن تھا۔

یوں تو میں اپنے دوستوں کی بہت قدر کرتا ہوں لیکن کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ دوستوں کی صورت تک نہ دکھائی دے اور میں محض اپنے لیے ہی ہو کر رہ جاؤں۔ میرے دوستوں کی تعداد بہت کم ہے اس لیے مجھے ایسے دن بھی میسر آجاتے ہیں۔

جس روز کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ وہ اسی قسم کا دن تھا، صبح کا وقت تھا، پیشتر اس کے کہ کوئی دوست میرے مکان پر پہنچ کر "اماکانت! اماکانت!!" کے نعرے لگاتا۔ میں چائے سے فارغ ہو کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

نہ بیوی، نہ بچے، نہ ملازمت، نہ کاروبار، نہ خوشی، نہ غمی، عجب رندانہ کیفیت میں زندگی بسر ہو رہی تھی۔ میری بیکاری سے گھر والوں کی ناخوشی کے باعث دل پر اداسی چھائی رہتی تھی۔ کوئی ذمہ داری نہ ہونے کی وجہ سے دماغ ہلکا رہتا تھا۔ اپنی بیوی نہ ہونے کے سبب سے ذہن پر رومانیت کا تسلط تھا۔

بس اسٹینڈ پر پہنچ کر دیکھا کہ کناٹ پلیس جانے کے لیے بس تیار کھڑی ہے۔ اندر اکا دکا مسافر بیٹھے ہیں، میں نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر جیب میں سے 'کیمل' کی ڈبیا نکالی اور بڑے اطمینان سے

ایک سگریٹ کو سہلاتا رہا، پھر اسے ہونٹوں میں دبایا اور سلگا کر طویل کش لیا۔ بالآخر کوٹ کے کالر درست کرتا ہوا بس کے اندر داخل ہو گیا۔

آٹھ بجے تھے۔ بھلا سردی کے موسم میں کسی کو کیا پڑی تھی کہ گھر کی گرم فضا سے نکل کر باہر کو اٹھ بھاگے۔ چنانچہ بس میں ایک عجیب سکون طاری تھا۔ چند لوگ ایک دوسرے سے پرے پرے بیٹھے دھیرے دھیرے باتیں کرنے میں محو تھے۔

میں نے پہلے تو عورتوں اور لڑکیوں کا جائزہ لیا۔ تین لڑکیاں تھیں اور دو عورتیں۔

لڑکیاں گوری تھیں۔ دو دو چوٹیاں، آنکھیں بڑی نہ چھوٹی، باتیں میٹھی نہ پھیکی۔ لیکن گال......

اف توبہ...... اس قدر بیہودہ گال!! ہڈیاں ابھری ہوئیں اور گہری گہری لکیریں جو ہنستے وقت اور گہری ہو جاتی تھیں...... اب دوسری عورت کی جانب دیکھا...... ہرے رام! وہ تو صورت سے بالکل آیا لگی۔ شاید سچ مچ کی آیا ہو۔ اسی بات سے مجھے خیال آیا کہ ہم لوگ بچوں کے لیے کس قدر بدصورت آیائیں مقرر کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عمر بھر ہمارے بچوں کی جمالیاتی حس پنپنے نہیں پاتی......

خیر اب ایک عورت کا جائزہ لینا باقی تھا۔ وہ میری جانب پیٹھ موڑے بیٹھی تھی۔ اس کے کندھے پر ننھے بچے کا سر لگا تھا اور ایک بچی سامنے کی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ گویا وہ کم از کم دو بچوں کی ماں تھی۔

دل پر مایوسی کا جذبہ طاری ہونے لگا۔ بیس پچیس منٹ کا یہ سفر یونہی کٹ جائے گا۔ دل بہلاوے کی کوئی حسین صورت دکھائی نہ دے گی۔ کیا یہ سفر جمائیاں لیتے ہی بتانا پڑے گا۔

سوچا...... اگر دو بچوں کی ماں بدصورت ہے تو اپنی بہنوں سے بڑھ کر کیا ہو گی۔ یہی نا کہ ان کے برابر ہو گی یا ذرا بہتر۔ آخر یہی طے پایا کہ اس خاتون کے عین پیچھے والی سیٹ پر ڈیرا جمایا جائے۔

پچھلی سیٹ پر چپکے سے بیٹھ کر میں نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بالوں کی تہہ جمائی اور پھر انتظار کرنے لگا کہ وہ ذرا اِدھر اُدھر گھوم کر دیکھے تو صورت کا جائزہ لیا جائے۔

لیکن وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سامنے کی جانب منہ کیے چپکی بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ بس چل دی۔

مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ بارے کنڈکٹر نے آکر دام طلب کیے۔ ٹکٹ لیتے وقت خیال آیا کہ کاش اس خاتون سے تھوڑی بہت بات چیت ہو چکی ہوتی تو اس کے ٹکٹوں کے دام دے کر اچھے خاصے مراسم پیدا کیے جا سکتے تھے۔

جب اس کی باری آئی تو اس نے منہ پھیر کر دیکھا۔ رُخِ روشن کا جلوہ دکھائی دیا...... دل دھک سے رہ گیا۔

وہ واقعی بہت حسین تھی۔ تار اسی آنکھیں، نازک لب، اور درخشاں پیشانی ...... خلافِ امید اس عورت کو حسین پاکر ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ اس سے گفتگو کیوں کر شروع کی جائے۔ کون سا موضوع مناسب رہے گا۔ موسم؟ ...... لیکن ہندوستان میں ابھی موسم کے موضوع پر گفتگو کا آغاز کرنا خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ اس عورت سے یہ کہنا کہ آہا! کیا ہی خوشگوار موسم ہے محض بیکار ہوگا۔ سنیما، ایکٹر، ایکٹرسیں، بسیں، سڑکیں ...... نہیں، نہیں، یہ باتیں مہمل ہیں ...... اتنے میں عورت کے شانے کے ساتھ لگے ہوئے ننھے بچے نے آنکھیں کھولیں اور حیرت واستعجاب سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بڑا پیارا بچہ تھا۔ میں نے اس کے گال پر ہلکی سی چٹکی لی تو اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ پھر میں نے دونوں انگلیوں سے اس کی ٹھڈی کو ہلکے ہلکے سہلانا شروع کیا تو وہ ہنسنے لگا...... میں جانتا تھا کہ اس کی ماں کو اس بات کا علم ہو چکا ہے۔

بچے کے کانوں کے پیچھے داد کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے جرأت سے کام لے کر پوچھا۔

کیوں جی! ننھے کے کانوں کے پیچھے داد ہو رہا ہے......"

"جی...... ہاں......"

"تو کیا آپ اس کا علاج نہیں کرائیں گے؟"

"علاج تو ہو رہا ہے......"

"کیا ہومیو پیتھی علاج کرا رہی ہیں؟"

"جی نہیں، ہے تو ایلو پیتھی۔"

"ایک ڈاکٹر ہیں رچی رام۔ ہومیو پیتھی علاج کرتے ہیں۔ خصوصاً بچوں کے علاج میں تو انہیں مہارت حاصل ہے۔ اگر یہ علاج موثر ثابت نہ ہوا، تو ان سے رجوع کیجئے گا۔"

"بہتر۔"

"بہت ہی پیارا بچہ ہے۔" میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

عورت نے بچے کو شانے سے ہٹا کر کھڑکی کے ساتھ پیٹھ لگالی۔ اب اس کا رخ قریب قریب میری جانب تھا۔ اس نے بچے کو زانو پر بٹھا کر دیکھنا شروع کیا کہ وہ واقعی حسین ہے یا نہیں۔ پھر جیسے دل ہی دل میں اس نے میرے قول کی تائید کرتے ہوئے میٹھی نظروں سے میری جانب دیکھا۔

"آپ کو بچوں سے خاصا لگاؤ ہے۔ کیا آپ کے بھی بچے ہیں؟"

"جی نہیں۔" میں نے قدرے جھینپ کر کہا۔ "ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"کیوں شادی نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟"

"یونہی۔" میں نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہی، ابھی بے کار ہوں۔ جب تک آمدنی کی معقول صورت نہ ہو، دل میں شادی کا خیال بھی نہیں آسکتا۔"

"لیکن آپ بیکار کیوں ہیں؟"

میں اس جرح سے گھبرا گیا تھا۔ "میں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کرنے کے بعد پشاور میں کاروبار شروع کیا تھا۔ آمدنی کی صورت نظر آنے لگی تو فساد شروع ہوگئے اور مجھے اِدھر بھاگنا پڑا ......اب نئے سرے سے کام کرنے کا خیال ہے۔"

عورت کی آنکھوں میں اداسی کی جھلک دکھائی دی۔ اس وقت وہ کچھ کھوئی کھوئی سی نظر آرہی تھی۔ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے حسین چہرے کے خدوخال کا بغور جائزہ لینے لگا...... کیا وہ میری خاطر اداس تھی؟ ایک لمحے کے لیے ہی سہی!...... کاش! مجھے بھی ایسی ہی موہنی بیوی مل جائے۔

کہتے ہیں کہ عورت مرد کے دلی جذبات کو بہت جلد پہچان لیتی ہے۔ عورت نے نظریں جھکالیں اور پھر قدرے تامل کے بعد نہ معلوم کیوں...... بڑی بچی کی جانب اشارہ کر کے مسکرا کر بولی۔ "یہ میری بیٹی ہے۔"

"آؤ بیٹی! میرے قریب آؤ......" میں نے ہاتھ پھیلائے۔ وہ مارے شرم کے آگے نہیں بڑھی تو میں نے خود ہی بڑھ کر اسے گود میں بٹھالیا۔ "آہاہا...... بڑی اچھی ہے ہماری بے بی...... اچھا تو تم پڑھتی ہو کیا؟"

لیکن وہ بڑے اہتمام کے ساتھ شرماتی رہی۔

عورت بولی "بتاؤنا بے بی! تم سے کے مرتبہ کہا ہے کہ یونہی مت شرمایا کرو۔"

میں نے سوچا۔ کس قدر مہذب ہے یہ عورت۔ اس کی بات چیت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پڑھی لکھی اور خاص سلجھی ہوئی ہے۔

ماں کے سرزنش کرنے پر بیٹی نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"کیا پڑھا ہے بھئی ہمیں بھی سناؤ...... تم تو بہت اچھی بے بی ہو۔ تمہیں تو پڑھا لکھا یاد ہوگا سارا، بولو یاد ہے؟"

"ہاں جی۔" بے بی نے بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر بھرپور نظروں سے میری جانب دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس بات کا اقبال کرنے میں اسے بہت فخر محسوس ہورہا ہے۔

"اچھا بھئی پھر سناؤنا! کیا پڑھا ہے تم نے؟"

"اے، بی، سی، وائی، زیڈ۔"

اس پر ہم دونوں قہقہہ مار کر ہنسے۔ میں اور وہ عورت۔ ہم دونوں جو ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ لیکن قہقہوں کی ملی جلی آواز سے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی فلم کے ہیرو اور ہیروئین کوئی سحر انگیز ڈوئیٹ گارہے ہوں۔

عورت نے بمشکل ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ "اری بے بی! تجھے اے، بی، سی، ابھی تک یاد نہیں ہوئی۔ سی کے بعد ایک دم وائی زیڈ؟"

اب ہماری ملاقات قابلِ اطمینان درجے تک آن پہنچی تھی۔ اب بیشتر خدشات دور ہوچکے تھے۔ ہم دو بہت اچھے واقف کاروں بلکہ دوستوں کی طرح گفتگو کرنے لگے۔

بیس یا پچیس منٹ کے سفر میں زیادہ باتیں نہیں ہوسکتی تھیں، لیکن اگر احساسات کو لیجئے تو لمحہ بھر میں کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے۔ ایک میٹھی نظر تھی کہ زندگی کے ان لمحوں کو رنگین بناتی چلی گئی۔ اس کی آواز میں ایسا لوچ اور رسیلا پن تھا کہ مدتوں کانوں میں شہد سا گھلتا رہا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں میں ہم اس قدر محو تھے کہ اردگرد کی کچھ خبر نہیں رہی تھی...... جب میں

نے جنگل میں شیر کے فرضی شکار کی کہانی سنائی اور جھوٹوں ہی کہہ کر دیا کہ میں نے شیر کے سامنے کھڑے ہو کر اس پر گولی چلائی تھی تو عورت کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حیرت سے بولی۔

"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ شیر کا شکار مچان پر بیٹھ کر کیا جاتا ہے۔"

"جی ہاں۔" میں نے بے پروائی سے سگریٹ کا بجھا ہوا ٹکڑا ہوا میں پھینکتے ہوئے جواب دیا "لیکن کہنہ مشق شکاری مچان پر کبھی نہیں بیٹھتے ہیں۔"

وہ سچ مچ میری بات پر ایمان لے آئی۔ باتوں باتوں میں مجھے خیال آیا کہ مرد کے دل میں عورت کی کشش کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عورت کے سامنے وہ دل کھول کر جھوٹ بول سکتا ہے اور عورت بھی ہر دم جھوٹ سننے کے لیے تیار رہتی ہے۔ ہوشیار سے ہوشیار عورت بھی بالآخر اسی مرد کو پسند کرتی ہے جس کے جھوٹ پر وہ اعتبار کر سکے۔

عورت طفلانہ انداز سے کئی باتیں پوچھتی رہی اور میں بڑی توجہ سے ان کے جواب دیتا رہا...... گناہ و ثواب، پیار، محبت، عشق و حسن اور شرافت و خباثت کی گھلی ملی سی یہ ملاقات کس قدر دل کش اور جان لیوا تھی...... اس سہانی صبح کو دو اجنبی مسافروں کی مختصر سی ملاقات، تاریخ عالم کا کس قدر اہم واقعہ!!

عشق کی منزل تو کیا آتی...... البتہ بس کی منزل قریب آ رہی تھی۔

بے بی ابھی تک میری گود میں بیٹھی تھی۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ کام نکل جانے کے بعد بے بی کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔ میں نے مجوب ہو کر بے بی کی بغلوں کو گدگدایا "ارے بے بی! تم تو کوئی بات ہی نہیں کرتیں...... کیا تم ہم سے خفا ہو۔"

وہ چپ رہی۔

"بولو...... بے بی۔"

"لا ہیں۔" بے بی نے انکار کے طور پر سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا تو بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا لام؟"

"ہاں۔"

"سول تاناں۔"

"سلطانہ۔" عورت نے کہا۔

مجھے پہلی مرتبہ اس بات کا علم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں۔ سلطانہ کی بغلوں کو گدگداتے ہوئے میرے ہاتھ رک گئے۔ میں نے قدرے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

"کیا آپ مسلمان ہیں؟"

"جی۔" یہ کہہ کر عورت نے میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"نہیں کچھ نہیں۔" میں ہنس دیا...... "مجھے ہوا کیونکہ بظاہر......"

پھر قدرے بھدی سی خاموشی طاری ہو گئی۔

بات کچھ بھی نہیں تھی...... میں نے سکوت توڑتے ہوئے پوچھا۔

"فساد کے دنوں میں آپ دہلی ہی میں تھیں؟"

"جی ہاں ہم سب یہیں تھے۔"

میرے دل کو نہ معلوم کیا ہونے لگا۔ میں نے رکی رکی آواز میں پوچھا۔ "آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

عورت نے قدرے سکوت کیا۔ "بس کچھ نہ پوچھیے۔ مالی نقصان بہت ہوا، جانیں بچ گئیں۔ یہی غنیمت سمجھیے۔ کناٹ پلیس میں ہماری دکان لٹ گئی۔ مکان میں فسادی گھس آئے...... لیکن پیشتر اس کے کہ کوئی نقصان ہوتا پولیس آ گئی......"

میرا سر جھک گیا...... ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اسٹینڈ پر پہنچ کر بس رک گئی۔

اس خیال سے کہ عورت تنہا ہے اور بچے دو، شاید اسے میری مدد کی ضرورت ہو، میں نے اپنی سیٹ سے اٹھنے میں تامل کیا لیکن عورت کے ہلکے پن سے روشن ہوا کہ میری مدد درکار نہیں ہے۔ چنانچہ میں شریف مرد کی طرح اٹھ کر چل دیا۔

چند قدم چلنے کے بعد میں نے یونہی گھوم کر دیکھا کہ وہ عورت اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھ

رہی ہے، لیکن اس کے قدم اکھڑے اکھڑے دکھائی دیتے تھے۔ وہ قدرے لنگڑا کر چل رہی تھی۔

میں سوچنے لگا کہ اگر اس کی ٹانگ میں یہ نقص نہ ہوتا تو وہ قدم قدم پر فتنے جگاتی ایسی حسین عورت اور یہ عیب!

دفعتاً ہماری نظریں ملیں...... غالباً وہ سمجھے بیٹھی تھی میں چلا گیا ہوں۔ مجھے ایک مرتبہ پھر اپنے سامنے پاکر وہ پریشان سی ہوگئی جیسے کہہ رہی ہو۔ "آخر تم نے مجھے لنگڑا کر چلتے ہوئے دیکھ لیا نا؟"

محجوب ہو کر اس نے اپنا گلابی ہوتا ہوا چہرہ جیسے جھکا لیا اور پھر جیسے روٹھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

میں اسے منانے کے لیے آگے بڑھا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ "معزز خاتون! تم بہت حسین ہو۔ تم حسن کی پتلی ہو، تم کیا جانو میں ان چند دلفریب لمحوں کے لیے تمہارا کس قدر شکر گزار ہوں۔"...... اور پھر میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "معاف کیجیے گا...... آپ کچھ پریشان سی نظر آتی ہیں۔ کیا آپ کو کہیں آگے جانا ہے۔ تانگہ لاؤں؟...... یا آپ کو کسی انتظار ہے؟"

اس نے سر پر دوپٹہ سنوارتے ہوئے جواب دیا۔ "جی جانا تو قریب ہی ہے...... وہ نہیں آئے...... ملازم کو بھیج دیتے، ملازم کو تو آنا ہی چاہیے تھا......"

میں نے آگے بڑھ کر لڑکی کو گود میں اٹھا لیا اور بولا۔ "چلیے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔"

وہ بغیر کچھ کہے میرے ساتھ ہولی۔

ابھی ہم پندرہ بیس قدم ہی چلے ہوں گے۔ کہ وہ بول اٹھی۔ "لیجیے وہ لڑکا...... ہمارا نوکر چلا آرہا ہے۔"

ہم رک گئے۔ میں نے جھجکتے ہوئے ٹانگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا پیدائشی نقص ہے؟"

اس نے قدرے تامل کیا۔ پھر اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "جی نہیں...... جب فسادیوں نے ہمارے مکان پر حملہ کیا تو ایک سورمیر نے لاٹھی گھما کر ماری

تھی......"

میرا دل بیٹھنے لگا۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے بچی کو نوکر کی طرف بڑھایا...... میری پیشانی پر ٹھنڈے پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھ سے جیب میں رومال ٹٹولنے لگا۔

رخصت کے موقعے پر کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ چنانچہ میں کچھ اس انداز سے دو قدم پیچھے ہٹا جیسے وہ قدیم بابلیوں کی حسین شہزادی ہو۔ میری آنکھیں جھک کر اس کے قدموں پر جم گئیں۔ میں نے تصور ہی تصور میں اس کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔

پھر اچٹتی ہوئی نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو معلوم ہوا کہ اب ان آنکھوں میں وہ روکھا پن نہ تھا نہ سختی اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ مہربان ہوتی ہوئی کسی خودسر ملکہ کی طرح کہہ رہی ہے "مابدولت خوش ہوئے......مابدولت نے نہ صرف تمہیں بلکہ تمہاری ساری قوم کو معاف کیا......"

ایک مرتبہ پھر ہم نے ایک دوسرے کی جانب شکر گزار نظروں سے دیکھا......اور پھر ہم ایک دوسرے سے دور ہونے لگے۔ یہاں تک کہ بالآخر ایک دوسرے کی نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گئے۔

# ہندوستاں ہمارا

ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
(اقبالؔ)

جگجیت سنگھ اپنی بیوی کی تلاش میں تھا۔

بھلا اتنے بڑے جوڑ میلے میں ایک عورت کو ڈھونڈ نکالنا بھی کوئی آسان کام تھا۔ سکھوں کا جوڑ میلہ ایک برس میں ایک ہی مرتبہ لگتا تھا۔ گوروار جن دیو جی مہاراج کی یاد میں بڑے بڑے دیوان لگتے۔ پنجاب کے دور افتادہ مقامات سے پریمی سکھ جوق در جوق آتے۔ دو دن تو اس جگہ تل پھینکنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سبھی جمع ہوتے تھے۔ اتنی بھیڑ میں بھلا جگجیت سنگھ کی بیوی کا کیا پتہ چل سکتا تھا۔

لیکن وہ بیوی کو ڈھونڈے بغیر واپس نہ جا سکتا تھا۔ وہ کچھ عرصہ تک برما کے محاذ پر جانے والا تھا۔ اس نے بمشکل دو ہفتے کی چھٹی حاصل کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ان چھٹیوں میں وہ اپنی بیوی کو ہمراہ لے کر شملے چلا جائے۔ اس کی بیوی کی خواہش تھی کہ وہ کسی پہاڑی مقام کی سیر کرے، ہز مجسٹی کی

فوج کا لفٹینٹ ہونے کی حیثیت سے نہ معلوم کتنے عرصے تک اسے اپنی قوم اور ملک کی خدمت کرنی پڑے۔ ہندوستان کی خاک پاک کو لالچی اور خونخوار دشمنوں سے بچانے کے لیے نیز ہندوستان کی آزادی برقرار رکھنے کے لیے نہ معلوم کب تک اسے شمشیر بکف رہنا پڑے۔ ان حالات میں اس نے مناسب سمجھا کہ چند روز اپنی بیوی کی صحبت میں کسی پر فضا مقام پر گزارے۔

وہ آج صبح ہی گھر پہنچا تھا لیکن بیوی موجود نہ تھی صرف ماں بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔ گھر پہنچتے ہی اس اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ وہ منہ سے کچھ کہنے سے شرماتا تھا۔ شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ ماں بھانپ گئی۔ سوت کے ساتھ نئی پونی لگا کر بولی۔ ''لڑکیاں جوڑ میلے پر گئی ہیں۔ میرا بھی جی چاہتا تھا۔ لیکن میلے کے دنوں میں گھر اکیلا چھوڑ کر جانا مناسب نہیں اس لیے میں نے آج انھیں بھیج دیا۔ کل میں خود جاؤں گی۔''

پھر ماں نے بلائیں لے کر کہا۔ ''اچھا اب نہا دھو کر کچھ کھا پی لو۔''

''لیکن وہ کب آئیں گی ماں؟''

ماں ہنسنے لگی۔ ''چھوکریاں ہیں کون کہہ سکتا ہے کب آئیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ شام سے پہلے نہیں آئیں گی۔ آج دوپہر کا کھانا بھی وہ لنگر ہی سے کھائیں گی۔''

جگجیت سنگھ عجلت میں تھا۔ اس نے ماں کو اپنا سارا پروگرام بتایا۔ ماں کہنے لگی اب وہ تیرے ساتھ پہاڑ پر نہیں جاسکتی۔

''نہیں جاسکتی؟...... کیوں؟''

''احمق!'' اس کی ماں پُر معنی انداز میں ہنسنے لگی ''کہہ جو دیا وہ نہیں جاسکتی۔''

وہ کچھ نہ سمجھا۔ لیکن وہ بلا کچھ کھائے پیے بیوی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

شادی ہوئے چار پانچ مہینے ہی گزرے تھے۔ شادی کے بعد وہ ایک ماہ کے قریب اپنی بیوی کے ساتھ رہا۔ پھر اسے ملازمت پر جانا پڑا۔ اب یہی ایک موقع تھا۔ اس کے بعد نہ معلوم کب ملاقات ہو یا نہ ہو۔ اسے اپنی بیوی سے اتنی ہی محبت تھی جتنی کسی نوعمر جوشیلے نوجوان کو ہوسکتی ہے۔ اسے اس کا خوبصورت تیکھے خدوخال والا چہرہ بخوبی یاد تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوگی وہ اسے

پہچان لے گا۔

بھیڑ میں سے رستہ بناتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا۔ پہلے وہ خیموں کے عارضی بازار میں سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا ہوا گزر گیا۔ اس کی بیوی چٹ پٹی چیزیں کھانے کی بہت شوقین تھی۔ اس نے دور چاٹ والے کی دُکان پر چند عورتوں کا جمگھٹا دیکھا۔ وہ لپک کر وہاں پہنچا۔ عورتوں کی خاصی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ان میں اس کی بیوی شامل ہو یا نہ ہو۔ اگر وہ یوں ہی نظر اٹھا کر کسی غیر مرد کو دیکھ لے تو وہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے ہی پڑ جائے۔ چنانچہ وہ دو پیسے کے دہی بڑے لے کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور کنکھیوں سے عورتوں کا جائزہ لینے لگا۔ لیکن ان میں اس کی بیوی موجود نہ تھی۔ وہاں سے نکلا تو پرے مچھلی بیچنے والے کی دکان نظر آئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی مچھلی کے پکوڑے یا تلی ہوئی مچھلی بھی بڑی رغبت سے کھاتی تھی۔ ممکن ہے وہاں بینچ پر انگلیاں چاٹتی ہوئی سی سی کر رہی ہو۔ اس کی بیوی ابھی نو عمر لڑکی ہی تھی۔ یہی سولہ سترہ کا سن تھا۔ بڑی چنچل اور طرحدار۔ اسے دیکھ پائے گی تو بھلا وہ کس انداز سے مسکرانے لگے گی۔ وہ بھاگا بھاگا پہنچا۔ لیکن اس کی بیوی اس جگہ بھی موجود نہ تھی۔ اس طرح بھاگم بھاگ اس کی پگڑی بھی ڈھیلی ہو گئی۔ گردن کی جلد سرخ ہو گئی۔

بڑے گوردوارے کے اِرد گرد دور تک علیحدہ علیحدہ شامیانوں کے نیچے دیوان لگے ہوئے تھے۔ ان دیوانوں میں مرد بھی شامل تھے عورتیں بھی۔ اس نے سوچا ممکن ہے وہ کسی دیوان ہی میں بیٹھی ہو۔ وہ بھاگا بھاگا ایک دیوان میں گھس گیا۔ اسٹیج پر نئی روشنی کا ایک سکھ جنٹل مین کھڑا ہوا تھا۔ وہ سکھ قوم کے کسی مسئلہ پر جدید روشنی میں بحث کر رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے قد کا مختصر سا آدمی تھا۔ اگرچہ وہ بڑے جوش میں بول رہا تھا لیکن یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ دیہاتوں سے آئے ہوئے اکھڑ سکھ اس کے لکچر میں خاص دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ اس کی کمزور پتلی پتلی باہیں اور چھوٹی چھوٹی کسی ہوئی مٹھیاں، اس کی باریک زنانہ آواز اور پھر اس کی اردو ملی پنجابی بولی یا پنجابی ملی اردو سونے پہ سہاگہ کا کام کر رہی تھی۔

"میں آپ نوں یقین دلاتا ہاں۔ بلکہ ہم ایسی بات پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اسی یہ نتیجہ نکالن میں حق بجانب ہیں کہ سکھ قوم بڑی بہادر قوم تھی اور ہن بھی ہے، لیکن سکھ راج نیتی کے معاملے وچ کورے ہی ہیں۔ سیاست میں کوئی ٹاواں ٹاواں آدمی سمجھ دار بھی نظر آ جاندا ہے پر اس بات کی پنتھ

نوں ہمیشہ ہی کمی رہندی ہے...... جے آپ بکھیل سنگھ کی گل پر غور کرو۔ بھکیل سنگھ نے دلی پر قبضہ کر لیتا۔ دلی پر پنتھ کا نشان لہران لگ پیا۔ تو خالصہ صاحبو! دیوالی کے دن آگئے۔ سب سکھوں نے کہا کہ ایس دیوالی امرتسر مناونی ہے جی۔ اس گل نوں سن کر بکھیل سنگھ جی بولے "خالصہ جی بات ہم سویکار کرتے ہیں۔ ہن خالصہ جی امرتسر جی کی طرف کوچ کر دیو۔ اس وقت کسے نے کہیا "سردار صاحب! دلی دا کیا بنے گا؟" سردار بکھیل جی کہن لگے۔ "پھر فتح کر لیں گے۔" تو جی جیکارے بلا ندے اور واپس امرتسر آن دھمکے......"

جگجیت سنگھ اچک اچک کر عورتوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے اپنی بیوی کہیں بھی نظر نہ آئی۔ بچارا بہت پریشان تھا وہاں سے ہٹ کر بھیڑ میں دھکے کھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کوئی عورت اس کی نظر سے نہ بچتی تھی۔ وہ اور ایک دیوان میں جا نکلا۔ وہاں بھی لکچر ہو رہا تھا۔ یہ لکچر دینے والے سردار صاحب خوب لمبا سا لٹھ ہاتھ میں تھامے ہوئے تھے۔ وہ بڑے جوش میں بول رہے تھے۔ ان کی آواز گرج دار تھی اور صورت سے رعب ٹپکتا تھا۔ اس نے اپنے منہ کے دہانے کے آگے سے اپنی گھنی اور بڑی بڑی مونچھیں ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے کہا:۔

"پنتھ جیو! مجھے ایک بڑے وِدوان پروفیسر نے یہ بات بتائی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہندوستان کی ہسٹریاں لکھنے والے سب انگریز مصنف اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں انھیں مشرق میں سب سے سخت دشمن سکھ ہی ملے تھے۔ یہ بات کٹر سے کٹر انگریز بھی تسلیم کرتے ہیں...... آخر یہ جوش اور طاقت سکھوں میں کہاں سے آگئی؟ یہ شری گرو کلغی دھر کا بھرا ہوا جوش ہے اور یہ سب شری گورو لدر جن دیو جی مہاراج کی قربانیوں کا نتیجہ ہے...... میں آپ کو مزے کی بات سناتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ذرا زور کے ساتھ کھانسا۔ جگجیت سنگھ عورتوں کے جھرمٹ کے قریب چلا گیا۔ "یہ مہاراجہ رنجیب سنگھ کے زمانہ کی بات ہے۔ اس وقت مہاراجہ جی کے جرنیل ہری سنگھ نلوے کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ یہ وہی نلوا تھا جس نے کابل قندھار تک سکھوں کی تلوار کا سکہ بٹھا دیا تھا...... پٹھان مائیں اپنے روتے ہوئے بچوں کو اس کا نام لے کر چپ کراتی تھیں۔ انھیں دنوں کی بات ہے کہ انگریزوں نے کلکتہ میں ایک کانفرنس بلائی۔ اس میں ہندوستان کے بڑے بڑے حکمراں یا ان کے

نمائندے بھی مدعو کیے گئے۔ مہاراجہ رنجیب سنگھ نے ہری سنگھ نلوے کو روانہ کر دیا۔ جس دن پہلی میٹنگ ہونے والی تھی سردار ہری سنگھ نلوا وقت سے کچھ پہلے ہی وہاں جاکر بیٹھ گئے۔ ہری سنگھ بہت بھاری ڈیل ڈول والا شخص تھا۔ صورت ایسی ہیبت ناک اور پر جلال تھی کہ دیکھ کر دل تھرا جاتا تھا۔ آنکھوں میں ایسی تیزی تھی کہ کوئی شخص اس سے آنکھ نہیں ملا سکتا تھا۔ خیر! اس میٹنگ میں سبھی لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے۔ جو کوئی نلوے کو دیکھتا حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ میٹنگ کی کاروائی کا وقت آن پہنچا۔ لیکن حاضرین کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ ہری سنگھ نلوا کچھ دیر تک تو منتظر رہے پھر وہ کچھ بُرا مان گئے اور اسی دن پنجاب کی طرف روانہ ہو پڑے اور لاہور پہنچ کر مہاراج سے اس بات کی شکایت کی۔ مہاراج نے اسی وقت انگریزوں کو چٹھی لکھی کہ آپ لوگوں نے ہمارے نمائندے کی تضحیک کی ہے۔ وہ آپ کی کانفرنس میں شامل ہوا اور سب چپ چاپ بیٹھے رہے۔ اس بات پر انگریزوں نے جواب دیا کہ ہم معافی کے خواستگار ہیں۔ لیکن ہم لاچار تھے آپ کے جرنیل کا دبدبہ ہی کچھ ایسا تھا کہ یہاں پر کسی کو زبان ہلانے کی جرأت تک نہ ہوئی۔ سب ممبران یہی سوچتے رہ گئے کہ ممکن ہے وہ کوئی بات کہیں جو نلوے کو پسند نہ آئے اور وہ خفا ہو جائے...... سو یہ تھا ہمارے جرنیل ہری......"

جگجیت سنگھ آگے بڑھ گیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ اس نے صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جلدی سے اپنی بیوی کو ڈھونڈ کر لے آئے گا۔ پھر وہ نہا دھو کر کھانا کھائے گا۔ اور اس کی بیوی بھی شام تک تیاری کر لے گی۔ اگر اس طرح ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہی شام ہو گئی تو وہ آج نہ جا سکیں گے۔ جس کے معنی ہیں ایک دن ضایع ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ اور بھی سرگرمی سے بیوی کی تلاش کرنے لگا۔ اس کی پریشانی دیکھ کر کوئی سیوادار پوچھ بیٹھتا "کیوں سردار جی خیریت تو ہے۔ کوئی بچہ وچہ تو نہیں کھو گیا"۔ وہ مسکرا کر آگے بڑھ جاتا۔ واقعی اتنے بڑے میلے میں بیوی کو تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔

پرے گھاس کے ٹکڑے پر درخت کی چھاؤں تلے رنگ برنگ کے کپڑوں والی عورتیں بیٹھی تھی۔ اسے کچھ اس قسم کا دھوکا ہوا جیسے اس کی بیوی بھی انھیں میں شامل ہو۔ وہ بڑی امیدوں کے

ساتھ وہاں پہنچا۔ لیکن مایوس آنا پڑا۔

کئی طرحدار بانکی عورتوں کو پیچھے سے دیکھ کر اسے شک گزرتا ممکن ہے یہ میری بیوی ہی ہو۔ مگر جب قریب پہنچ کر ان کی طرف دیکھتا تو شرمندہ ہونا پڑتا۔ ادھر وہ عورتیں اپنی خوبصورت آنکھیں ایک مرتبہ تو حیرت سے اس کے چہرے پر گاڑ دیتیں۔ پھر وہ جلدی سے منہ پھیر کر چل دیتیں۔

ایک اور بڑے مجمع میں بہت سی عورتیں بیٹھی دکھائی دیں۔ وہ خود لمبے قد کا شخص تھا۔ لیکن اس کے آگے کھڑے ہوئے طرہ باز سکھ نوجوانوں کی پگڑیوں کے پھیلے ہوئے کلغے اس کے راستے میں حائل ہو جاتے تھے۔ وہ بھی مجمع میں گھس کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں ڈھڈ سارنگی والوں نے سماں باندھ رکھا تھا۔ ڈھڈ چھوٹی ڈھولک سی ہوتی ہے جسے ایک ہاتھ میں پکڑ کر دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے اسے بجایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ستار بجتا ہے۔ یہ دونوں ساز رزمیہ اور جوشیلے گانوں کے لیے مخصوص ہیں۔ سب سے زیادہ بھیڑ اسی جگہ تھی۔ عورتوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ جگجیت سنگھ کو پورا یقین تھا کہ اس کی بیوی اس جگہ ضرور مل جائے گی۔

وہ کچھ آگے بڑھا پھر رک گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر اس نے زیادہ دھما چوکڑی مچائی تو لوگ اسے نکال باہر کریں گے۔ وہ ایسے زاویہ پر کھڑا ہونا چاہتا تھا جہاں سے وہ عورتوں کو بخوبی دیکھ سکے۔ وہ کچھ دیر کے لیے ڈھڈ سارنگی والوں کے گیت سننے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

وہ تعداد میں تین تھے۔ تینوں شخص خوب پلے ہوئے بھینسوں کی طرح موٹے تازے تھے۔ رنگ تانبے کے مانند سرخ، گردن کی رگیں پھولی ہوئیں۔ جوش میں بپھرے ہوئے شیروں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ اس وقت وہ مشہور شاعر شاہ محمد کی لکھی ہوئی رزمیہ نظم سنا رہے تھے۔ اس نظم میں شاہ محمد نے بڑے پرجوش انداز میں سکھوں اور انگریزوں کی لڑائی کا حال بیان کیا ہے۔

ان تین اشخاص میں سے ایک کے ہاتھ میں ستار تھا۔ اور دو کے ہاتھ میں ڈھڈ کی دھپا دھپ کی آواز کے ساتھ ان کے ہاتھ اور سر بھی ہل رہے تھے حاضرین بیٹھے جھوم رہے تھے۔ ڈھڈ والوں میں ایک شخص کبھی نثر میں جنگ کا نقشہ کھینچتا اور پھر کوئی بول وہ تینوں ہم آواز ہو کر ایک ساتھ پرجوش انداز میں گانے لگتے۔

"صاحبان! یہ ایک غلط بات ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھوں نے جنگ کا آغاز کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ خود انگریزوں کی نیت خراب تھی۔ انھوں نے رشوت دے کر چند سکھ سرداروں کو اپنے ساتھ ملایا تھا مجبوراً سکھوں کو بھی لڑنا پڑا۔ یہ انگریزوں کی خوش قسمتی تھی اس وقت سکھوں کا کوئی رہنما نہ تھا۔ اگر یہ لڑائی مہاراجہ شیر پنجاب کی زندگی میں شروع ہو گئی ہوتی تو یقیناً آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ ایک طرف فرنگیوں نے کچھ ایسے حالات پیدا کر دیے کہ سکھوں کے لیے جنگ ناگزیر ہو گئی۔ اور جب سکھ مرنے یا مارنے پر تیار ہو گئے تو انگریزوں نے چاہا کہ طوفان تھم جائے۔ چنانچہ شاہ محمد فرماتے ہیں:

چٹھی لکھی فرنگیاں خالصے نوں

تُسی کاس نوں جنگ مچانوندے او

(انگریزوں نے سکھوں کو چٹھی لکھی کہ آپ جنگ کیوں چھیڑ رہے ہیں)

ہور دیے جو تس فرماندے او

(ہم سے لاکھوں روپیہ لے جاؤ اور اس کے علاوہ جو کچھ آپ طلب کریں ہم دینے کو تیار ہیں)

جگجیت سنگھ مایوس ہو کر مجمع سے باہر نکل آیا۔ اب کوئی چارہ باقی نہ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ پسینہ اس قدر زیادہ آیا تھا کہ اس کی بغلوں میں اس کا خاکی کوٹ تک بھیگ گیا تھا۔ پیٹ پیٹھ سے جا لگا تھا۔ شدت کی پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اپنی بیوی پر سخت غصہ آنے لگا۔ نہ معلوم کمبخت کہاں چھپ کر بیٹھ رہی ہے۔ اس کا سارا پروگرام درہم برہم ہوا جا رہا تھا...... اس نے سبیل سے دودھ کی کچی لسی پی اور لاہور کے قلعہ کی دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ وہ زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا۔ اس قدر شور و غل اور دھکم دھکے میں وہ بھوکا پیاسا صبح سے گھوم رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ کہیں لیٹ کر کمر سیدھی کر لے۔

یہ سوچ کر وہ میلے سے ذرا ہٹ کر ایک درخت کی طرف بڑھا۔ برگد کے پھیلے ہوئے درخت کے نیچے۔ گاؤں سے آئی ہوئی عورتیں بیل گاڑیوں کے نیچے بیٹھی ہوئی روٹیاں کھا رہی تھیں۔ وہ مایوس تھکا ہارا قدم بڑھائے چلا جا رہا تھا کہ اتنے میں ایک لڑکی بھاگتی ہوئی ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی...... اس نے آنکھیں اٹھائیں...... ارے اس کی چھوٹی بہن!...... "ستو! ستو!! تم لوگوں کو صبح سے

ڈھونڈ رہا ہوں۔ کہاں بیٹھی ہو تم لوگ؟"

بہن نے انگلی سے دور اشارہ کیا۔ وہ اس کے ساتھ چل دیا اور وہاں اس کی دوسری بہن اور بیوی صاحبہ بھی براجمان تھیں۔ بیوی حسب معمول چٹوری بلی کی طرح اپنے سامنے کئی چٹ پٹی چیزیں رکھے پوریاں کھانے میں مصروف تھی۔

دونوں کی نظریں ملیں تو بیوی دلفریب انداز سے مسکرا کر شرما گئی۔ کتنی محنت کے بعد بیوی کی صورت نظر آئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح سانولی سلونی ہی تھی۔ سرخ رنگ کی شلوار اور تنگ سی قمیص پہنے ہوئے جس میں اس کی چھاتیوں کی ابھری ہوئی گولائیاں صاف نظر آتی تھیں۔ اس کا جسم پہلے کی طرح جاذب تھا......

جگجیت سنگھ ان کے پاس بیٹھ گیا اور دو تین پوریاں بھی کھالیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنا رونا بھی روتا گیا۔ بیوی بولی "آخر میں کہیں گم تو نہ ہو جاتی، آپ گھر ہی پر کیوں نہ بیٹھے رہے...... اس قدر دھوپ میں...... خواہ مخواہ......"

اس نے بہنوں کی نظریں بچا کر اس کی بغل میں چٹکی لے لی اور بل کھا کر پرے سرک گئی۔ اس نے بتایا کہ وہ دونوں شملہ کو جانے والے تھے۔

اس کی بیوی حیران رہ گئی اس کے منہ کا نوالہ منہ ہی میں رہ گیا۔ حلق سے اترا ہی نہیں۔ بڑی خوش ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی کتنی خوش ہوگی۔

وہ لوگ جلدی سے میلے کو خیر باد کہہ کر گھر آئے۔ آتے ہی اس کی بیوی نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ ماں نے کہا۔ "وہ تیرے ساتھ کیسے جا سکتی ہے۔ ایک تو تم احمق ہو اور تم سے زیادہ وہ احمق ہے جو جھٹ تمہارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی"۔

ادھر اس کی بہنیں بھی واویلا کرنے لگیں کہ وہ بھی چلیں گی۔ نہیں تو بھابی کو بھی نہ جانے دیں گی۔ یہ نیا جھنجھٹ آن پڑا۔ اس نے ماں سے کہا "آخر حرج ہی کیا ہے۔ پہاڑ پر چلی جائے گی تو اس کی صحت اور اچھی ہو جائے گی۔"

اس پر اس کی ماں نے ناک چڑھا کر کہا "باگورو، باگورو، لفٹیننٹ بن گیا ہے پر اتنی عقل بھی

نہیں سر میں......"

پھر وہ اسے گھر کے ایک کونے میں لے گئی اور اس کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگی۔ جگجیت سنگھ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے منہ سے مسرت کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کی بیوی حاملہ تھی۔ اس نے ماں کو بازوؤں میں جکڑ کر اوپر اٹھالیا "افوہ میری اچھی ماں...... میری بہت ہی اچھی ماں...... بول تو کس چیز سے منہ میٹھا کرے گی۔"

ماں خوشی سے پھول کر کپا ہو گئی بولی "ارے پگلے! منہ تو میٹھا کر ہی لوں گی تو یہ بتا کہ میرا مطلب بھی سمجھ گیا کہ میں کیوں تجھے اسے ساتھ لے جانے سے منع کرتی تھی۔"

"لیکن ماں اس سے کیا ہوتا ہے وہ چلے گی میرے ساتھ، اچھا ہوا جو تو نے بتا دیا۔ میں اس کا سب خیال رکھوں گا...... میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔"

ماں بگڑ گئی "پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ جب میں نے کہہ دیا نہیں جائے گی۔"

"کیوں ماں! کیوں نہیں جائے گی؟"

"نہیں جائے گی ہزار بار لاکھ بار کہہ دیا نہیں جائے گی۔"

یہ نئی مشکل آن پڑی۔ اس نے منت کر کے کہا "ماں آخر تجھے ہو کیا گیا ہے؟"

"ارے جاہل، ہوش کی دوا لے۔ عورت کے پیٹ میں بچہ ہو اور پہاڑوں پر قلانچیں بھرتی پھرے۔ تیری عقل گھاس چرنے گئی ہے کیا۔"

وہ آگے بڑھ کر ماں کو سمجھانے لگا "ماں! دھیرج کر کے میری بات بھی تو سُن...... تین چار مہینے کا بچہ تو ہے ہی اس میں پریشانی کی بات کیا ہے؟"

اس پر ماں جھنجھلا کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس نے اس کا منہ بند کر کے کہا "میری بات تو سن لے پہلے مجھے یہ بتا کہ تو پہاڑ کو سمجھتی کیا ہے۔ وہاں ہموار سڑکیں ہوتی ہیں۔ پھر ہر قسم کی سواری مثلاً رکشا ڈانڈی وغیرہ۔ بھلا میں اسے پیدل گھماؤں گا۔ تو نے بھی مجھے ایسا ہی بے وقوف سمجھا ہے۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر دس قدم بھی جانا ہوگا تو میں اسے رکشا پر بٹھا کر لے جاؤں گا۔"

اَن پڑھ ماں نے روتی آواز میں کہا "ارے بیٹا رکشا کیا ہوتی ہے میں نے تو آج ہی نام سنا ہے۔

کیوں بناتا ہے مجھے......"

جگجیت سنگھ نے ماں کو سمجھانے میں اپنی ساری قابلیت صرف کر دی۔ ماں بڑی مشکل سے رضا مند تو ہو گئی لیکن اس کے دماغ میں اب بھی وہی خیال بیٹھا ہوا تھا کہ بیٹا غلطی کر رہا ہے۔ ماں سے جان چھوٹی اور سامان بندھنے لگا تو بہنیں بسورنے لگیں۔ آج اسے بہنوں پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ انھیں اتنی تعلیم بھی نہیں دی گئی کہ اگر میاں بیوی کسی جگہ تفریح کے لیے جا رہے ہوں تو دوسروں کو خواہ مخواہ اس میں اپنی ٹانگ نہ اڑانی چاہیے۔

وہ بہنوں کو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس موقع پر اس کی ماں نے دونوں لڑکیوں کو جھاڑ کر بٹھا دیا۔ "خبردار! چوٹی کاٹ کر پھینک دوں گی اگر تم میں سے کسی نے ساتھ جانے کا نام بھی لیا تو۔"

اب بہنیں بھائی کی طرف دیکھنے لگیں۔ بھائی نے سر اور آنکھوں کے اشارے سے ظاہر کیا کہ اب وہ کیا کر سکتا تھا۔

بچاری سیدھی سادی بہنیں سمجھتی رہیں کہ بھیا بچارا تو انھیں لے جانے کے لیے تیار تھا۔ ماں نے نہیں جانے دیا۔

ان سب باتوں سے فراغت پا کر اس نے گھڑی دیکھی تو چار بجے تھے ساڑھے آٹھ بجے گاڑی روانہ ہوتی تھی۔ ابھی کافی وقت باقی تھا۔ لیکن وہ دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی نئی رکاوٹ کھڑی نہ ہو جائے۔ اس لیے اس نے نوکر کو اسی وقت تانگہ لانے کے لیے بھیج دیا۔ ماں کہنے لگی "بیٹا ایسی بھی کیا جلدی ہے؟"

اس نے بہانہ کیا کہ گاڑی میں بہت تھوڑا وقت باقی رہ گیا ہے۔ تانگہ آیا اور وہ جلدی سے سامان رکھ کر تانگے میں بیٹھ گئے۔ ماں نے بلائیں لیں دونوں کو تانگہ چل دینے پر بھی پکار پکار کر قیمتی نصیحتیں کرتی رہی۔

جب گھر سے دور چلے آئے تو وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا "بھئی شکر ہے ہزار ہزار جان چھوٹ ہی گئی۔"

اس کی بیوی ہنس کر اس کے قریب ہو گئی اس نے بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، "اچھا اب تم بھی مجھ سے باتیں چھپانے لگیں؟"

"میں نے کیا بات چھپائی؟" اس کی بیوی لاعلمی میں آنکھیں جھپکا کر بولی۔

جگجیت سنگھ نے پیٹ کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر روٹھ گئی۔ "آپ بہت بے شرم ہیں اور نہیں تو۔"

"ہو، ہو۔" جگجیت نے کہا۔ "تم روٹھ گئیں۔ بھئی تمہیں منالینا کیا مشکل ہے۔ ابھی دو پیسے کے گول گپے کھلادوں تو خوش ہو جاؤ گی۔"

اس پر اس کی بیوی انگلیوں کے بیچ میں سے دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگی۔

"اچھا واقعی بتاؤ تو کیا کھاؤ گی؟ دہی بڑے، پکوڑے، کلفی، رس گلے، آئس کریم...... بتاؤ میری چٹوری بلی!"

"کھانے بیٹھ جائیں گے تو گاڑی جو چل دے گی۔"

"ہاہا...... آگئیں چکمے میں...... بھئی ابھی تو بہت وقت پڑا ہے۔ میں نے یونہی غپ اڑادی تھی۔ سوچا ذرا اِن لوگوں سے جان چھڑا کر بھاگیں۔"

وہ دونوں ایک بہت بڑے ہوٹل میں گھس گئے۔ وہ جان بوجھ کر بیوی کو اس ہوٹل میں لے گیا تھا۔ اب وہ لفٹنٹ ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا ذرا بیوی بھی اس کی شان دیکھ لے۔ وہ ایک علیحدہ باکس میں بیٹھ گئے۔ اس کی بیوی کے تر و تازہ حسین چہرے پر حیرت کے آثار کس قدر بھلے معلوم ہوتے تھے۔ پہلے بھی اس نے ہوٹلوں میں کھانا کھایا تھا لیکن ایسے شاندار ہوٹل میں آنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔

جگجیت سنگھ نے بٹن دبایا گھنٹی بجی۔ بیرا حاضر ہوا۔ اس نے آرڈر دیا۔

آج وہ بہت خوش تھا۔ اپنی محبوب بیوی کے ساتھ نہ پہلے کبھی اکیلے سفر کیا تھا نہ وہ کبھی اکیلے کسی مقام پر جا کر رہے تھے۔ پھر شملہ جیسے مقام پر وہ دونوں کس قدر لطف اندوز ہوں گے۔

موجودہ لمحہ سے لے کر مکمل دو ہفتوں کی چھٹیاں ختم ہونے تک وہ ایک ایک لمحہ مسرت اور شاد مانی میں گزارنا چاہتا تھا۔ آج صبح سے وہ عجب سراسیمگی میں گھومتا رہا۔ وہ سمجھنے لگا کہ یہ بھی 'واہگورو اکال پرکھ' کی کرپا تھی کہ اس کی سب مشکلات آنکھ جھپکتے میں دور ہو گئیں۔

کھانا آیا اور وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ اس کی بیوی کی شیریں آواز اس کے کانوں میں

امرت ٹپکاتی تھی۔ وہ بھی تو از حد خوش تھی۔ مینا کی طرح چہک چہک کر باتیں کر رہی تھی اس کی طفلانہ حرکتیں اور بھی زیادہ مزا دے رہی تھیں۔

وہ بولی ”کیوں جی! ہم گوردوارے میں ٹھہریں گے جا کر؟“

”نہیں مائی ڈارلنگ۔ ہم کسی شاندار ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ گوردوارے کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ گوردوارے پر بوجھ ڈالنے کے بجائے ہمیں اپنے ہاتھ سے وہاں دان کرنا چاہیے۔“

پھر اس نے بیوی کو پہاڑی مقامات کی بابت سب باتیں بتائیں۔ ”وہاں مکانات اوپر تلے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب بارش ہوتی ہے تو وہاں ہمارے شہروں کی طرح کیچڑ نہیں ہوتی بلکہ پانی فوراً بہہ جاتا ہے۔ سڑکیں دھل کر صاف ہو جاتی ہیں...... وہاں ہم زمین سے بہت اونچے ہو جائیں گے سمجھی...... یہ بادل جو آسمان پر نظر آتے ہیں ہمارے نیچے نظر آنے لگیں گے...... ہاں۔“

اس کی بیوی یہ باتیں سن کر بہت حیران ہوئی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں خوش خوش باتیں کرتے ہوئے اسٹیشن کی طرف چل دیے۔ تانگے سے سامان اتروا کر قلیوں کے حوالے کیا۔ ابھی گاڑی جانے میں آدھ گھنٹہ باقی تھا، اس نے سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ خرید لیے۔

جنگ کی وجہ سے بھیڑ بھاڑ بہت زیادہ تھی اس لیے وہ دونوں فوراً پلیٹ فارم کی طرف چل دیے۔ بیوی شوہر کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ اس کا طاقتور اور چوڑے چکلے جسم والا خاوند اس کی راہنمائی کر رہا تھا۔ گاڑی ٹھسا ٹھس بھری ہوئی تھی۔ سیکنڈ کلاس کے صرف ایک ڈبہ میں ایک انگریز کے سوا اور کوئی نظر نہ آتا تھا۔

جگجیت سنگھ دروازہ کھول کر اندر جانے لگا تو انگریز اٹھ کر دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ ”کسی اور ڈبہ میں بیٹھیے جا کر۔“

وہ بہت حیران ہوا۔ ”اور کوئی ڈبہ خالی نہیں ہے۔“

”خیر اس ڈبے میں نہیں بیٹھنے دوں گا۔“

”کیوں، کیا یہ ریزرو ہو چکا ہے؟“

انگریز نے نتھنے پھلا کر کہا ”ریزرو ہی سمجھ لو۔“

جگجیت سنگھ بہت پریشان ہوا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، کہیں بھی ریزرو لکھا ہوا نظر نہ آیا۔ "یہ ریزرو نہیں ہے۔" یہ کہہ وہ اندر داخل ہونے لگا، تو صاحب نے پھر راستہ روک دیا۔ اس بات پر کچھ تو تو میں میں ہو گئی۔ کچھ لوگ بھی جمع ہو گئے۔ اسٹیشن کا بابو بھی آ نکلا۔ جگجیت سنگھ نے بابو کو ساری بات سمجھائی۔ صاحب نے چلا کر کہا "میں اسے اپنے ڈبے میں سفر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

بابو نے کہا اسٹیشن ماسٹر سے کہیے۔ جگجیت سنگھ اسٹیشن ماسٹر کے پاس گیا۔ اس نے آکر صاحب کو سمجھایا لیکن صاحب نے سو سوالوں کا جواب ایک "نہیں" میں دے دیا۔ پولیس کے کانسٹبل چپ چاپ اِدھر اُدھر کھسک گئے۔

اسٹیشن ماسٹر نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو فون کیا۔ وہ دفتر میں نہیں تھا اس نے بھی لاچاری ظاہر کی آخر ہو بھی کیا سکتا تھا۔

گاڑی چلنے میں پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے جگجیت سنگھ پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ قلی سامان زمین پر رکھے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ اس کی سرمگیں آنکھوں والی بیوی سراسیمگی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ صاحب کھڑکی کے قریب بیٹھا اطمینان سے چرٹ پی رہا تھا۔

مادرِ وطن کے سینے پر مادرِ وطن کی ریل گاڑی کھڑی تھی اور مادرِ وطن کے ایک بیٹے کو اس سرزمین سے ہزارہا میل پر رہنے والا اجنبی گاڑی کے اندر داخل نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس کا یہ جائز حق کوئی قانون واپس نہ دلا سکتا تھا۔ جگجیت سنگھ کا جسم تنگ وردی میں جکڑن سی محسوس کرنے لگا......

دفعتاً اس نے قلیوں کو سامان اٹھانے کے لیے کہا اور بیوی کو ساتھ لے کر گاڑی کے اسی ڈبے کی طرف بڑھا۔ پیشتر اس کے کہ صاحب اٹھ کر اس کا راستہ روکے وہ پھرتی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ صاحب کی گردن پکڑی اور اس کی ٹانگوں میں ہاتھ دیا اور اچھال کر پلیٹ فارم پر پھینک دیا۔ بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے سیٹ پر بٹھایا۔ قلی سامان لے کر اندر آگئے اور اس نے صاحب کا سامان اٹھا اٹھا کر پلیٹ فارم پر پھینکنا شروع کر دیا۔

صاحب گاڑی کی طرف لپکا۔ جگجیت سنگھ نے گاڑی سے نیچے اتر کر اسے راستہ ہی میں جا لیا۔ اس کے گندم گوں ہاتھوں کی گرفت میں صاحب کی ٹائی آگئی اور دوسرے فولادی ہاتھوں کے

دو زناٹے کے تھپڑ اس کے منہ پر پڑے۔ صاحب کی بتیسی ہل گئی اور اسے دن میں تارے نظر آنے لگے۔ وہ تھپڑ کھا کر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے کی طرف اپنے کھلے سوٹ کیس میں جا دھنسا..... اس کش مکش میں اس کے سر سے ہیٹ گر کر جو لڑھکا تو ایک بازاری کتا اسے منہ میں داب کر لے بھاگا۔

اِس کے بعد صاحب کو آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ جونہی جگجیت سنگھ نے پائیدان پر پاؤں رکھا۔ گاڑی چل دی۔

جگجیت سنگھ بہت پریشان ہوا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، کہیں بھی ریزرو لکھا ہوا نظر نہ آیا۔ "یہ ریزرو نہیں ہے۔" یہ کہہ وہ اندر داخل ہونے لگا، تو صاحب نے پھر راستہ روک دیا۔ اس بات پر کچھ تو تو میں میں ہوگئی۔ کچھ لوگ بھی جمع ہوگئے۔ اسٹیشن کا بابو بھی آنکلا۔ جگجیت سنگھ نے بابو کو ساری بات سمجھائی۔ صاحب نے چلا کر کہا "میں اسے اپنے ڈبے میں سفر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

بابو نے کہا اسٹیشن ماسٹر سے کہیے۔ جگجیت سنگھ اسٹیشن ماسٹر کے پاس گیا۔ اس نے آکر صاحب کو سمجھایا لیکن صاحب نے سو سوالوں کا جواب ایک "نہیں" میں دے دیا۔ پولیس کے کانسٹبل چپ چاپ اِدھر اُدھر کھسک گئے۔

اسٹیشن ماسٹر نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو فون کیا۔ وہ دفتر میں نہیں تھا اس نے بھی لاچاری ظاہر کی آخر ہو بھی کیا سکتا تھا۔

گاڑی چلنے میں پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے جگجیت سنگھ پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ قلی سامان زمین پر رکھے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ اس کی سرمگیں آنکھوں والی بیوی سراسیمگی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ صاحب کھڑکی کے قریب بیٹھا اطمینان سے چرٹ پی رہا تھا۔

مادرِ وطن کے سینے پر مادرِ وطن کی ریل گاڑی کھڑی تھی اور مادرِ وطن کے ایک بیٹے کو اس سرزمین سے ہزار ہا میل پر رہنے والا اجنبی گاڑی کے اندر داخل نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس کا یہ جائز حق کوئی قانون واپس نہ دلا سکتا تھا۔ جگجیت سنگھ کا جسم تنگ وردی میں جکڑن سی محسوس کرنے لگا......

دفعتاً اس نے قلیوں کو سامان اٹھانے کے لیے کہا اور بیوی کو ساتھ لے کر گاڑی کے اسی ڈبے کی طرف بڑھا۔ پیشتر اس کے کہ صاحب اٹھ کر اس کا راستہ روکے وہ پھرتی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ صاحب کی گردن پکڑی اور اس کی ٹانگوں میں ہاتھ دیا اور اچھال کر پلیٹ فارم پر پھینک دیا۔ بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے سیٹ پر بٹھایا۔ قلی سامان لے کر اندر آگئے اور اس نے صاحب کا سامان اٹھا اٹھا کر پلیٹ فارم پر پھینکنا شروع کر دیا۔

صاحب گاڑی کی طرف لپکا۔ جگجیت سنگھ نے گاڑی سے نیچے اتر کر اسے راستہ ہی میں جالیا۔ اس کے گندم گوں ہاتھوں کی گرفت میں صاحب کی ٹائی آگئی اور دوسرے فولادی ہاتھوں کے

دوزناٹے کے تھپڑ اس کے منہ پر پڑے۔ صاحب کی بتیسی ہل گئی اور اسے دن میں تارے نظر آنے لگے۔ وہ تھپڑ کھا کر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے کی طرف اپنے کھلے سوٹ کیس میں جا دھنسا...... اس کش مکش میں اس کے سر سے ہیٹ گر کر جو لڑھکا تو ایک بازاری کتا اسے منہ میں داب کر لے بھاگا۔

اس کے بعد صاحب کو آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ جونہی جگجیت سنگھ نے پائیدان پر پاؤں رکھا۔ گاڑی چل دی۔

# ویہلے ۳۸

شہر کا وہ حصہ جسے پہلے واقعی شہر کا حصہ کہا جاسکتا تھا۔ اب بری طرح برباد ہوچکا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے مکانات دور سے دیکھنے والوں کو بالکل غیر آباد کھنڈرد کھائی دیتے تھے۔ اور اگر ان خستہ حال گلیوں میں مغربی پنجاب سے آئے ہوئے شرنار تھیوں کی چہل پہل نہ ہوتی تو شاید دن کے وقت بھی انسان کو وہاں جاتے ہوئے ڈر محسوس ہوتا۔

کچھ مدت پہلے یہاں کے اصل باشندوں یعنی مسلمانوں کو بے پناہ مصایب کا سامنا کرنا پڑا تھا جو کیفیت ان پر گزری تھی۔ اس کی داستان ان کھنڈروں کی زبانی سنی جاسکتی تھی۔ فسادات کے بعد جب کہ اصل باشندے ہجرت کر گئے تھے اور ابھی شرنار تھی آن کر بسے نہیں تھے اس بستی پر عجب کس مپرسی کی حالت طاری تھی۔ مکان گرائے گئے تھے، جلائے گئے تھے، الغرض ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی۔ مکانوں کے بغیر دروازوں کی چوکھٹیں گویا حیرت سے منہ کھولے کبھی واپس نہ آنے والے مکینوں کی راہ تک رہی تھیں۔ گرد آلود آسمان میں گدھ منڈلاتے تھے۔ کھجلی کے مارے ہوئے کتے کونے کھترے سونگھتے پھرتے تھے اور بھولی بھٹکی گائیں اینٹوں کے ڈھیر میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی تھیں۔

اس عالمگیر بربادی میں اگر ایک طرف ایک قوم کے مکانات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا تھا تو دوسری جانب دوسری اقوام کے اکاد کا مکانات صحیح وسالم کھڑے تھے۔ انھیں مکانوں میں سے ایک سردار بدھ سنگھ کا مکان بھی تھا۔

اس قدر اچھے نام والے حضرت بڑے بے تکے ڈیل ڈول کے مالک تھے۔ پست قد، کدو سا سر، چھوٹی چھوٹی متجسس آنکھیں، فربہ بدن، طویل لہراتی ہوئی داڑھی...... صبح وشام پاٹھ کرتے، مالا جپتے، یوں تو مالا ہر وقت کلائی سے لپٹی رہتی لیکن علی الصبح جب وہ سکھ منی صاحب کا طویل پاٹھ کرنے لگتے تو گھر کے افراد کی نیند اکھڑ جاتی۔ آپ گوردوارے میں بھی پاٹھ کرواتے رہتے تھے۔ دوسروں کو بھی پاٹھ کی تلقین کرتے تھے۔

فسادات کے زمانے کے قصے بڑے دردناک لہجے میں دہراتے تھے، کہتے ہیں یہ ساری آبادی مسلمانوں کی تھی۔ بس آبادی کے ایک سرے پر ہم لوگوں کے مکانات تھے۔ اسی لیے ان دنوں انھیں اپنا مکان چھوڑ کر ہندو محلے میں جانا پڑا۔ شہر میں ان کے کئی اور مکانات بھی تھے۔ لیکن وہ سب کرائے پر اٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان دنوں انھیں خاصی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔

ادھر جب پانسہ پلٹا تو انھوں نے خوف کے مارے بھاگتے ہوئے مسلمانوں کی ہزاروں کی جائدادیں کوڑیوں کے مول خرید لیں اور پھر دولت مند شرنارتھیوں کے ہاتھ زیادہ سے زیادہ داموں پر بیچ کر جی کھول کر منافع کمایا۔ پاٹھوں کی شدت اور بڑھی اور ان کا چہرہ نورِ معرفت سے دمک اٹھا۔

دور تک پھیلے ہوئے کھنڈروں کے ایک سرے پر کھڑے ہوئے چند صحیح وسالم مکانات عجب مضحکہ خیز منظر پیش کرتے تھے۔ ان میں سب سے اچھا مکان بدھ سنگھ کا تھا۔ دومنزلے مکان کا نچلا حصہ انھوں نے کرائے پر اٹھا دیا تھا اور اوپر والی منزل پر ان کی اپنی رہائش تھی۔ ان کے گھر کے قریب ہی ریل کا پل تھا۔ شب وروز ریل گاڑیاں ادھر سے گزرا کرتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر انجن کی سیٹیوں اور گاڑی کی گڑگڑاہٹ کا شور اس قدر شدید ہوتا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

شرنارتھیوں نے گھبراہٹ میں جو کام سامنے آیا شروع کر دیا۔ پے در پے مصائب جھیلنے کے باعث ان کے حواس قائم نہیں رہے تھے۔ بعض لوگوں کے عزیز مر کھپ گئے تھے، بعض یتیم یا بے

سہارا رہ گئے تھے۔ اس قسم کے بے شمار خاندانوں میں سے ایک خاندان بسا کھا سنگھ کا بھی تھا۔

بسا کھا سنگھ مغربی پنجاب کے ضلع لائل پور کا ایک معمولی زمیندار تھا۔ اس کے دو لڑکے تھے اور تین لڑکیاں۔ وہ خود سیاہی مائل گندمی رنگ کا دراز قد اور مضبوط انسان تھا۔ اس کے ہاتھ سچ مچ ہل کی ہتھی تھامنے کے لیے بنے تھے۔ اس کی شادی چھوٹی عمر ہی میں ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ ابھی سینتیس برس کا تھا اور اس کا بڑا لڑکا انیس برس کا ہو چکا تھا۔ اس سے چھوٹا لڑکا سترہ برس کا۔ لڑکیوں میں سب سے بڑی پندرہ کی تھی۔ چھوٹی بہنیں بھی چار پانچ برس تک جوان ہوا چاہتی تھیں۔

پہلے پہل اپنے گھروں سے نکل کر انھیں کیمپ میں دبکے رہنا پڑا۔ نہ کچھ کھانے کو نہ پینے کو۔ نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا اور نہ سر چھپانے کو کٹیا اس پر طرہ یہ کہ ہر دم جان کا خوف دامن گیر رہتا تھا۔ زندگی پل پل گزارنا بے حد تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔ یہ قافلہ عجب بے سروسامانی کی حالت میں مشرقی پنجاب کی جانب روانہ ہوا۔ بچے، بوڑھے، عورتیں اور مرد تکان زدہ قدموں کے ساتھ بھوکے پیاسے تھکے ہارے جانیں ہتھیلی پر دھرے منزل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ راستے میں فسادیوں کے ہجوم بڑھ بڑھ کر حملے کرتے تھے۔ قافلے میں کئی بہادر آدمی بھی تھے جو موقعہ پڑنے پر بڑی بے جگری سے لڑتے تھے لیکن بھوک اور پیاس کے مارے ہوؤں کا لڑنا بھڑنا بھی کیا تھا۔ بعض اوقات تاریک راتوں کو روکھی سوکھی کھا کر لوگ کھیتوں کی مینڈھوں پر ہی کروٹ بدل کر اونگھنے لگتے۔ جا بجا سلگتی ہوئی آگ میں سے چنگاریوں کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگتیں۔ کوئی آنکھوں سے اندھی بڑھیا پوپلے منہ سے لرزتی ہوئی بے سُری آواز میں شبد گانے لگتی تو دفعتاً شور و غور بلند ہوتا۔ فسادی شب خون مارتے۔ وہ بلا کھٹکے ڈیرے کے اندر در آتے۔ تاروں کی مدھم روشنی میں تیزی سے بڑھتے اور اچکتے ہوئے سائے دکھائی دیتے۔ افراتفری مچ جاتی۔ جب حملہ آور بچی کھچی گٹھڑیاں اور پوٹلیاں چھین لینے کی کوشش کرتے تو بعض عورتوں کی آہ و بکا سے آسمان گونج اٹھتا لیکن تارے چپ چاپ آنکھیں جھپکا جھپکا کر تماشا دیکھا کرتے۔ مذہبی نعروں، مارو مارو کا شور اور پہرے دار سپاہیوں کی بندوقوں کی تڑاتڑ کی صدائیں رفتہ رفتہ مدھم پڑ جاتیں۔ مجبور و معذور کراہتی ہوئی عورتیں اور زخمی انسانوں کے ستے ہوئے چہرے باقی رہ جاتے۔ یہ قافلہ پکے ہوئے پھوڑے کی مانند تھا جسے بار بار

چڑ کے دیے جاتے تھے اور جو سدار ستار ہتا تھا۔

بساکھا سنگھ نے خود بھی موقعہ پڑنے پر لڑنے بھڑنے سے گریز نہیں کیا۔ اسے اور اس کے دونوں لڑکوں کو بھی متعدد زخم آچکے تھے۔ بالآخر جب وہ یونین کے حدود میں داخل ہوئے تو ان کے دم میں دم آیا۔ وہاں انھیں دودھ اور جلیبیاں کھانے کو ملیں۔ آلو کچوریوں سے بھی تواضع ہوئی۔ اس وقت انھیں اس امر کو بے حد خوشی تھی کہ اب وہ آرام کی نیند سو سکیں گے۔ اب ان کا کوئی دشمن شب خون نہیں مارے گا۔ اب ان کی بہو بیٹیوں کی عزت و عفت کوئی نہیں لوٹے گا۔ اب ان کی جان و مال کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی۔

ہند یونین کے حدود کے اندر داخل ہوتے ہی قافلہ تسبیح کے دانوں کی مانند بکھرنے لگا۔ کچھ لوگ راستے میں جو شہر پڑتے وہاں رک جاتے۔ فرار شدہ مسلمانوں کے مکانوں پر قبضے ہونے لگے۔ بساکھا سنگھ نے بھی بدھ سنگھ کے پڑوس میں ایک بے حد بوسیدہ مکان میں ڈیرا جمادیا۔ یہ مکان دراصل اس قدر بری حالت میں تھا کہ اس وقت تک کسی کو اس پر قبضہ جمانے کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ چونکہ اور کوئی مکان خالی نہیں تھا اس لیے بساکھا سنگھ نے اسے غنیمت جانا۔

یہ عجیب قسم کی بستی تھی۔ لٹے ہوئے بدنصیب لوگوں کے ترک کردہ مکانوں میں تباہ حال، بدنصیب اور بے خانماں انسان آباد ہو رہے تھے۔ تاریخِ عالم میں انسانوں کے دو گروہوں نے ایک دوسرے سے اس قدر خوفناک مذاق کبھی نہیں کیا ہوگا۔

انسانی جسم کی ہڈیوں کا ڈھانچ ہیبت ناک اور عبرت ناک شے ہے لیکن جلی پھکی برباد شدہ بستی کا منظر بھی کچھ کم دہشت ناک اور عبرت انگیز نہیں ہے۔

اونچی نیچی ناہموار غلیظ گلیوں میں سُتے ہوئے چہروں والے نحیف ولاچار انسان حیران و ششدر دربدر گھوما کرتے تھے۔ یہ بستی دن کے کسی لمحے میں بھی دل خوش کن منظر پیش نہیں کرتی تھی۔ رات کی خواب ناک روشنی میں وہ ایک طویل و عریض قبرستان کے مانند دکھائی دیتی تھی۔ صبح کے وقت جب سورج کی تیز روشنی تاریکی کی چادر چاک کر دیتی تو یہ بستی زبانِ حال سے "عبرت! عبرت!" پکارنے لگتی تھی۔ سارا سارا دن بھٹکے بھٹکے لوگ اِدھر اُدھر گھوما کرتے، کتے بھونکتے، مریل

بلیاں ہڈیاں بھنبھوڑتیں اور مکھیاں بھنبھنایا کرتیں۔ شام کے وقت تنور اور چولھے روشن ہو جاتے۔ پہلے تو دھوئیں کی پتلی پتلی لکیریں اوپر کو اٹھنے لگتیں اور پھر دھوئیں کے ستون بن بن کر بوجھل بادلوں کے مانند آسمان کے اس سرے سے اس سرے تک پھیل جاتے۔ اس پھیلی پھیلی سیاہی تلے وہ بستی اور بھی حقیر اور بے کیف نظر آنے لگتی۔

پہلے پہل بساکھا سنگھ نے واہگورو کا ہزار ہزار شکر ادا کیا۔ آخر یہ اکال پُرکھ کی عنایت ہی تو تھی کہ وہ اپنے سارے کنبے سمیت ساری مشکلات میں سے بخیر و عافیت نکل آیا تھا...... رفتہ رفتہ روزی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ کنبے کا پیٹ پالنے کا سوال پیش نظر رہنے لگا۔ یوں تو ہر شخص کے لیے جما جمایا کام چھوٹ جانے کے بعد نئے سرے سے کام شروع کرنا بہت ہی مشکل مسئلہ تھا لیکن بساکھا سنگھ ایسے انسانوں کے لیے جو پہلے کھیتی باڑی کرتے تھے اور جو کسی بھی دوسرے ہنر سے واقف نہیں تھے۔ یہ مسئلہ قریب قریب ناقابلِ حل ہو کر رہ گیا تھا اور پھر بغیر پونجی کے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ نوبت مزدوری تک آن پہنچی۔ اس کے باوجود گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے۔ جان پہچان والوں کے سامنے اس قسم کا کام کرنے میں اور بھی ہیٹی ہوتی تھی۔ کیونکہ پہلے وہ ان کے روبرو خاصی عزت اور آبرو کی زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ القصہ اس طرح زندگی کی گاڑی چرخ چوں کرتی ہوئی گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔

بستی میں پہنچتے ہی گوردوارے میں سردار بدھ سنگھ سے اس کی ملاقات ہوئی۔ یونہی بدھ سنگھ کو اس کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ شام کے وقت بساکھا سنگھ ان کے ہاں چلا جاتا اور انھیں ان مصائب کے قصے سناتا جو انھیں راستے میں جھیلنے پڑتے تھے۔ بساکھا سنگھ کے دل میں ایک موہوم سی امید تھی کہ بدھ سنگھ سے ضرور اسے کچھ نہ کچھ فیض پہنچے گا۔ اسی لیے اس نے اس کے ہاں آمد و رفت جاری رکھی۔

بساکھا سنگھ کے دل میں بدھ سنگھ کے لیے بڑا احترام تھا۔ ایک تو بدھ سنگھ صورت ہی سے بڑا گورمکھ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی وہ چوڑی پیشانی، روشن آنکھیں، پُر نور لانبی داڑھی جس کے بیشتر بال سفید ہو چکے تھے، پریم رس میں ڈوبی ہوئی اس کی وہ میٹھی میٹھی باتیں اور اس پر طرہ یہ کہ صبح شام پاٹھ کیا کرتا تھا۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ اسے دنیا کے موہ مایا کے جال سے مطلقاً کوئی سروکار نہیں

ہے۔ وہ بساکھا سنگھ کے مصائب کا حال بڑے دھیان سے سنتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان پر کیے گئے مظالم کا حال سن سن کر اس کا دل موم کے مانند پگھلا جا رہا ہے۔ اس پر بساکھا سنگھ کا دل بھر آتا اور وہ گلوگیر آواز میں اپنے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کا ذکر کرتا۔ جہاں ہر سال لکھوکھا سنہری بالیاں ہوا میں جھوما کرتی تھیں۔ وہ گندم کے ان ذخیروں کا ذکر کرتا جو اس کے مکان کے اندر بھڑولوں میں ٹھسا ٹھس بھرے رہتے تھے۔ اپنے بیلوں، اپنی بھوری اور کالی بھینسوں، اپنے مکان غرض ہر شے کی کہانی سناتا۔ بظاہر بدھ سنگھ بہت متاثر نظر آتا تھا۔ وہ شخص جس کی بابت کہا جاتا تھا کہ اس کے پاس لاکھوں روپیہ نقد موجود ہے مکان ہیں، کارخانے ہیں۔ لیکن بساکھا سنگھ کی باتیں سننے کے بعد وہ بڑی متین صورت بنا کر سر ہلاتا اور کہتا۔ "بساکھا سنگھ جی پاٹھ کیا کرو۔"

چنانچہ بساکھا سنگھ نے خوب پاٹھ کرنے شروع کر دیے۔ خود بھی کیے اور بیوی بچوں سے بھی کروائے۔ لیکن جب ان کا کچھ نتیجہ نہ نکلتا تو بساکھا سنگھ کہتا۔ "سردار صاحب جی! دیکھیے جوان لڑکیوں کا بھی دل پر کس قدر بوجھ ہوتا ہے۔ سنتو بڑی ہو گئی ہے۔ اوپر سے کلجگ کا خیال کیجیے۔ میرے پاس تین چار سو روپیہ بھی ہو تو میں کسی نہ کسی طرح بڑی لڑکی کے بوجھ سے سبکدوش ہو جاؤں۔"

"واہگورو! واہگورو!!" بدھ سنگھ جواب دیتا۔ "بساسنگھ جی نام جپا کرو نام۔ نام میں بڑی شکتی ہے۔"

بساکھا سنگھ نے نام جپنا شروع کر دیا۔ خوب جی بھر کر نام جپا۔ یہاں تک کہ ایک مالا بھی خرید ڈالی۔ ہر وقت انگلیوں میں منکے گھومتے رہتے تھے۔ ایک پہر رات باقی ہوتی کہ وہ جاگ اٹھتا، اشنان کرتا اور پھر ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر مالا جپنے لگتا...... سارا دن کام کاج کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔ بیٹے الگ خوار ہوتے تھے۔ لیکن نتیجہ وہی صفر کا صفر۔

بساکھا سنگھ کہتا۔ "مہاراج جی! اگر میرے پاس کہیں سے پانچ سو روپیہ بھی آ جائے تو کوئی چھوٹی موٹی دکان ہی کھول ڈالوں۔"

جواب ملتا۔ "بساکھا سنگھ جی! گوردوارے جایا کرو۔ سارے پریوار کو لے جایا کرو۔ گورو کے گھر میں کیا نہیں ہے جو مانگو سو ملے گا۔ گورو کے گھر میں کسی شے کی کمی نہیں ہے خالصہ جی!...... لیکن شردھا شرط ہے۔ بغیر شردھا کے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اجی بابا بھیکھ سنگھ جی کہہ گئے ہیں کہ

شردھا ضرور پھل لاتی ہے۔ خواہ یہ پھل دو، چار، دس، بیس، پچاس برس کے بعد ہی کیوں نہ ملے......
لیکن شردھا کا پھل ملتا ضرور ہے......"

چنانچہ اب گوردوارے کا طواف ہونے لگا۔ اس کی بیوی اس کی ان حرکات سے پریشان ہو گئی۔ ایک روز بساکھا سنگھ نے آنکھیں موند کر بڑے پریم سے کہا "سنتو کی ماں! شردھا کا پھل ضرور ملتا ہے۔ خواہ دو، چار، دس، بیس یا پچاس برس کی بعد ہی ملے......"

یہ سن کر دکھوں کی ماری عورت نے دفعتاً اپنی میلی میلی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ پہلے چند لمحوں تک تو اس کی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکل سکا۔ پھر بمشکل رک رک کر گلو گیر آواز میں بولی......
"دس، بیس، پچاس برس؟"......اور پھر اس کی کانپتی ہوئی آواز بند ہو گئی۔ سر میں جنبش پیدا ہوئی اور اس کے ہونٹ لرز کر اور نتھنے پھڑک کر رہ گئے......

اس کے بعد کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ کیا سنتو اور اس کی بہنیں چالیس پچاس برس تک شردھا کے پھل کا انتظار کر سکتی تھیں۔ کیا اس کے نوخیز لڑکے شردھا کے پھل کے انتظار میں بوڑھے نہ ہو جائیں گے۔ کیا دنیا کے کسی انسان کی اتنی بساط بھی ہے کہ وہ دس، بیس، چالیس......

بساکھا سنگھ کے دماغ میں کھلبلی سی مچ گئی۔

اس رات چراغ کی مدھم روشنی میں وہ ٹانگیں سمیٹے، دونوں گھٹنوں کو بازوؤں کے کلو نچے میں لیے دیوار سے پیٹھ لگائے اپنے خیالات میں دیر تک گم رہا۔ اس کی گھنی بھنوؤں تلے سیاہ پتلیاں بڑے تجسس سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ چراغ کی تھرتھراتی لو میں گھر کے افراد متحرک سایوں کے مانند دکھائی دیتے تھے۔ تاحدِ نگاہ رات کی دھواں دھواں سی فضا میں ٹوٹے پھوٹے مکانات کے سلسلے عجب ہیبت ناک منظر پیش کر رہے تھے۔ جس مکان میں وہ خود مقیم تھا اس کا بیشتر حصہ گر چکا تھا۔ غالباً فسادیوں نے ہی اسے آگ لگائی ہو گی۔ دیواریں اور چھت کی کڑیاں کچھ جل جانے کے باعث اور کچھ دھواں لگنے کی وجہ سے بالکل سیاہ پڑ گئی تھیں اس کے مکینوں کو ہر وقت ان کے گر جانے کا خطرہ لاحق رہتا۔ اس روز آٹے کی عدم موجودگی میں کھچڑی پکائی گئی تھی اور گھر کے

سب لوگ اسی پر اکتفا کرنے پر مجبور تھے۔ اس کی اوپر تلے کی تین لڑکیاں، وہ انھیں ٹکٹکی باندھ کر کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے اس نے انھیں پہلے کبھی نہ دیکھا ہو...... یہ صورتیں کیسی ہیں، کون ہیں، کہاں سے آئیں اور سب سے اہم سوال یہ تھا کہ وہ جائیں گی کہاں۔ اس کے دونوں بیٹے ننگے سر بیٹھے کھچڑی کھارہے تھے، بار بار نوالے کے لیے منہ پھاڑتے تھے۔ ان کے جوڑوں میں نکل کر اوپر کو لہراتے ہوئے بالوں کے گچھے مرغ کی کلغی کے مانند دکھائی دیتے تھے۔ وہ مسلسل منہ ہلائے جارہے تھے۔ بساکھا سنگھ پر عجب بے حسی طاری تھی جیسے اس کا اس ماحول سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے وہ سب سے ارفع اور الگ بیٹھا اس دنیا کے کھیل دیکھ رہا ہو لیکن وہ زیادہ دیر تک اس خواب ناک کیفیت میں گم نہیں رہ سکا۔ اسے جلد ہی اس امر کا احساس ہو گیا کہ یہ سب کچھ خواب نہیں تھا اور نہ وہ ان سے الگ تھا۔ کس قدر عجیب بات تھی کہ کالے کوسوں تک پھیلی ہوئی زمین پر گیہوں کے سنہرے خوشوں سے لدے ہوئے پودے کھڑے تھے۔ وسیع آسمان تلے 'واہگورو اکال پرکھ' کی وسیع زمین موجود تھی، لیکن اس کے بندوں کو نہ کھانے کو اناج ملتا تھا اور نہ سر چھپانے کو جگہ میسر آتی تھی...... تعجب! بدھ سنگھ کے پاس اس قدر روپیہ ہے، مکان ہیں، کارخانے ہیں، بے فکری ہے، آنند ہے......

دوسرے روز شام کے وقت بساکھا سنگھ بستی میں بے مہار گھومتا پھر رہا تھا۔ اس کا ذہن عجب مخمصے میں گرفتار تھا۔ گھریلو پریشانیاں روز بروز بڑھتی جارہی تھیں۔ ان کا کوئی حل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ فسادات سے پہلے اسے کبھی گہرا غور اور فکر کرنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوئی تھی۔ اسے یاد تھا کہ وہ دو بھائی تھے اور ایک بہن۔ ان کے باپ کو ان سب سے بڑی محبت تھی۔ لڑکپن اور آغاز، جوانی کا زمانہ اس نے بڑی بے فکری سے گزارا تھا۔ کھیل کود، گیت اور الغوزوں اور عشق و محبت کے سوا اس نے اور کسی چیز کے متعلق سوچا ہی نہ تھا۔

جب وہ جوان ہو گیا تو بے فکری کے باعث جب اور کچھ نہ سوجھا تو اس نے چوروں اور ڈاکوؤں سے یارانہ گانٹھا۔ دو تین برس اسی قسم کے مشاغل میں گزر گئے۔ جب باپ نے دیکھا کہ بیٹا سیدھے راستے سے بھٹک کر اپنی زندگی خراب کرنے پر تلا ہوا ہے تو اس نے اس کی شادی کردی۔ ازدواجی زندگی کے بندھن کچھ ایسے مضبوط ثابت ہوئے کہ ذمہ دار انسانوں کی سی زندگی بسر کرنے لگا۔

شادی کے بعد بال بچے بھی ہوئے۔ جیون کے دشوار گزار اتار چڑھاؤ سے ہو کر بھی گزرنا پڑا۔ لیکن اسے آج تک ایسا تلخ تجربہ حاصل نہیں ہوا تھا کہ انسان پیٹ کی روٹی اور تن کے کپڑے کے لیے ایمان داری سے کام کرنا چاہے تو اسے کام ہی نہ ملے۔ جدید معاشی پیچیدگیاں اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آتی تھیں۔ اسے یہ سب چیزیں قطعاً غیر فطری دکھائی دیتی تھیں۔ لیکن اس کا ذہن ان مسائل کا خاطر خواہ حل پیش کرنے سے قاصر تھا۔

وہ کوچہ بہ کوچہ گھومتا پھرا۔ گندی گندی گلیاں جہاں رُکے ہوئے پانی کی نالیوں میں ایسی سخت بدبو اڑتی تھی کہ دماغ پھٹا جاتا تھا۔ جابجا گلی سڑی سبزیوں، پیاز کے چھلکوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر دکھائی دیتے تھے۔ اونچی اونچی گلیوں میں جابجا ٹوٹے پھوٹے مکانوں کی اینٹیں، مٹی، چونا اور روڑی پھیلی ہوئی تھی۔ مٹیالے رنگ کی بھدی اور گندی دیواریں طبیعت کو اور زیادہ پراگندہ کر دیتی تھیں۔ پھٹے پرانے چیتھڑے لٹکائے چھوٹے بڑے بچے چیختے اور چلاتے ہوئے ایک دوسرے سے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ مکانوں میں زیادہ تعداد ایسے مکانوں کی تھی جن کے باہر کے دروازے تک جل گئے تھے۔ ان کے اندر صحن کے مناظر صاف دکھائی دیتے تھے۔ ڈھیلی رسیوں والی چارپائیاں ،ان پر بیٹھی ہوئی میلے کچیلے دوپٹوں کے آنچل اڑاتی ہوئی عورتیں اور ان کے بھوک سے بلکتے ہوئے بچے جو چیخ چیخ کر ماؤں کی چھاتیوں کو ٹٹولتے تھے، حالانکہ ان چھاتیوں میں اب دودھ کہاں رہ گیا تھا۔ بعض جگہ ہلکی ہلکی آنچ پر تین تین دنوں کی باسی روٹیاں ابالی جارہی تھیں۔

گھوم پھر کر بسا کھا سنگھ بدھ سنگھ کے مکان کے آگے پہنچ کر رک گیا۔

شام کے وقت بدھ سنگھ کے درشن کرنا......اس کے معمول میں داخل تھا۔ بدھ سنگھ کو (جسے گھر میں بڑے سردار جی کے نام سے پکارا جاتا تھا) گوربانی کی باتیں کرنے اور ویاکھیان دینے کا بڑا چسکا تھا۔ چنانچہ وہ اس قسم کے لوگوں سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا جو اس کی روحانیت کے قائل ہو کر اس کی باتیں انہماک سے سننا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ گرنتھ صاحب میں سے شلوک پڑھے جاتے اور گیان اور معرفت کے دریا بہائے جاتے۔

اس نے ڈیوڑھی میں سے اوپر کو جاتی ہوئی کشادہ اور صاف ستھری سیڑھیوں کی جانب دیکھا جو

ابھی ابھی دھوئی گئی تھیں۔ سیڑھیوں کے اوپر والے دروازے میں سے افق میں چمکتے ہوئے سورج کی تیز روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ نور کا دریا تھا کہ نچلی سیڑھیوں تک بہتا چلا آرہا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

ملازم کی زبانی معلوم ہوا کہ بڑے سردار جی گھر ہی میں ہیں۔ وہ قدم بہ قدم سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ اوپر کے دروازے کے دائیں جانب سارا خاندان رہتا تھا اور بائیں طرف کا حصہ جو دو کمروں اور ایک صحن پر مشتمل تھا بڑے سردار صاحب کے لیے مخصوص تھا۔ بڑے حصے سے چھوٹے حصے تک ایک چوڑا راستہ تھا جس کے دونوں جانب پھولوں کے گملے دھرے تھے۔

بساکھا سنگھ اوپر پہنچا تو اس وقت سردار صاحب صحن میں چبوترے پر آسن بچھائے براجمان تھے۔ قریب ہی چوکی پر پانی کا لوٹا اور انگوچھا دھرا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی پاٹھ سے فارغ ہوئے ہیں...... سورج افق تک پہنچا ہوا تھا اور بادل کا ایک ٹکڑا اسے اپنے دامن میں چھپا لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ آگے بڑھا تو سردار صاحب نے پاؤں کی آہٹ پا کر پیچھے کی جانب گھوم کر دیکھا۔ اس نے ست سری اکال کا نعرہ بلند کیا۔ سردار صاحب کی مونچھوں تلے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "آیئے آیئے بساکھا سنگھ جی، کہیے کیا حال ہے۔"

"کرپا ہے...... اپنی کہیے۔"

بڑے سردار صاحب نے سر پر لپٹی ہوئی چھوٹی دستار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ابھی ابھی رہ راس کا پاٹھ کیا ہے...... ذرا سامنے کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

منظر؟

بساکھا سنگھ نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ اسے کوئی ایسا منظر دکھائی نہیں دیا۔ جس سے وہ بھی لطف اندوز ہو سکتا۔ گرد آلود فضا میں خستہ حال جلے بھنے مکانوں کے سلسلے اور ان کی نیم تاریک غلیظ گلیوں میں حقیر کیڑوں کے مانند رینگنے والے دکھی انسانوں میں سے کوئی بھی ایسا منظر پیش نہیں کرتا تھا جس سے لطف اٹھایا جا سکے...... سچ مچ بڑوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔

وہ اور قریب پہنچا تو سردار صاحب نے کمال مہربانی سے چوکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"پگڑی اور انگوچھا منڈیر پر رکھ کر چوکی پر بیٹھ جائیے۔"

بساکھا سنگھ نے حکم کی تعمیل کی۔

اس نے اپنے گرد سے اٹے ہوئے بوسیدہ جوتوں کی جانب چھپی نظروں سے دیکھا اور گرد آلود ٹخنوں کو تہبند کے پلوؤں سے ڈھانپتے ہوئے پاؤں سمیٹ لیے۔

"واہگورو! واہگورو!!" سردار صاحب کی گھنی مونچھوں میں سے آواز نکلی۔ "دیکھیے سردار صاحب! کرتار کی لیلا بھی کیسی نیاری ہے...... میں دن رات سوچا کرتا ہوں کہ آخر یہ جگ مایا ہی تو ہے۔ یہ مکان، یہ زمین، یہ آرام بھوگنے کے سب سامان ایک روز دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ دھنیہ ہیں وہ لوگ جو روکھی سوکھی کھا کر بھی واہگورو کے نام کا سمرن کرتے ہیں۔ سورگ بھی تو اکال پرکھ نے ایسے ہی لوگوں کے لیے بنایا ہے۔ ہم لوگ تو گنہگار ہیں، پاپی ہیں۔ ہے واہگورو ہے واہگورو......"

اس کے بعد انھوں نے ایک گورو بھگت کی کتھا سنائی۔ وہ سادھو تھا۔ رام نام کا پیاسا۔ اس کا جی چاہا کہ کھیر کھائے۔ عقل نے کہا کہ مورکھ! تو سادھو ہے، سنیاسی ہے، تجھے ان چیزوں سے کیا تعلق ہے؟ من نہیں مانا تو اس نے اپنی پریمی کے گھر جا کر کھیر کھائی اتنی کھائی کہ من بس بس پکار اٹھا، لیکن اب بس کہاں۔ سادھو تو من کو سبق سکھانا چاہتا تھا۔

یہ کتھا سنا کر بڑے سردار صاحب نے مسکین صورت بنائی اور آنکھیں مٹکا کر آسمان کی جانب دیکھا جو اس وقت خون کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔

پہلے جب بساکھا سنگھ ان کی یہ باتیں سنتا تو اس پر وجد طاری ہو جاتا تھا لیکن آج اسے یہ باتیں بڑی عجیب سی معلوم ہو رہی تھیں اور پھر سردار صاحب کی زبانی وہ اور بھی انوکھی معلوم ہوتی تھیں۔ بساکھا سنگھ پر یہ راز تو اب کھلا تھا کہ خالی پیٹ طویل پاٹھ کرنا تو رہا ایک طرف، انسان کے منہ سے ایک شبد 'واہگورو' تک نکلنا ناممکن ہے۔ اسے خیال آیا کہ اس شخص کے ماحول کے اجلے پن میں ہزاروں غریبوں کی تمناؤں کے خون کی سرخی بڑی چابک دستی سے چھپا دی گئی ہے۔

بڑے سردار کی باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔

دھوئیں کے ستون بستی سے اوپر اٹھنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ یکجا ہو کر بوجھل بادلوں کی صورت اختیار کر رہے تھے۔ مکان کے بڑے حصے کی جانب سے سفید اور اجلی دیواروں کے سلسلوں میں سے ہنستے، کھیلتے، بولتے، چہکتے، بچوں اور عورتوں کی نقرئی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

دفعتاً سردار صاحب بولے۔ ''آیئے بساکھا سنگھ جی اندر چلیں۔ سردی بڑھتی جا رہی ہے۔''

سردار جی کمرے کی طرف بڑھے۔ ان کے پیچھے چلتے ہوئے بساکھا سنگھ نے گھوم کر دیکھا کہ افق پر غروب ہوتے سورج کے سر پر بدلیوں کے چند ٹکڑے مچل رہے ہیں اور خون سے لتھڑی ہوئے سنگین کی طرح آفتاب کی ایک طویل کرن مٹیالے آسمان کے سینے کے پار ہو گئی ہے۔

دو کمروں میں سے ایک میں گرو گرنتھ صاحب کا پرکاش کیا گیا تھا۔ اس کمرے میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ گورو گرنتھ صاحب اونچے چبوترے پر رنگین رومالوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ ان کے آگے دری پر بچھے ہوئے رومال کے دامن میں چند رنگین پھول دکھائی دے رہے تھے۔ مکھیاں جھلنے کی چوری کے سفید بال گھوڑے کی ایال کی طرح ایک جانب کو لٹکے ہوئے تھے۔ دائیں بائیں چھوٹے چھوٹے گلدان اور ان میں باسی گھاس میں چند پھول اڑے سے دکھائی دے رہے تھے۔ چونکہ بجلی ابھی وہاں نہیں آئی تھی۔ اس لیے ایک چھوٹا سا خوبصورت لیمپ چوکی پر دھرا تھا۔

بڑے سردار صاحب کا کمرا بھی بڑا تھا۔ فرش پر دری اور دری پر دو چھوٹے چھوٹے پرانے غالیچے بچھے تھے۔ سردار صاحب اجلے بستر پر بیٹھ گئے۔ سرہانے کے قریب رکھی ہوئی تپائی پر ایک بہت بڑا اور خوبصورت تیل کا لیمپ روشن تھا۔

بساکھا سنگھ کے لیے وہی جانا پہچانا ماحول تھا۔ ایک طرف دیوار پر گورونانک صاحب کی بڑی سی تصویر تھی۔ جس میں وہ نام جپتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ آنکھیں بھگتی رس میں ڈوبی ہوئیں، ہاتھ میں مالا ''نام خماری نانکا چڑھی رہے دن رین۔'' انھوں نے لوگوں کی گاڑھی کمائی کا روپیہ نہیں کھایا تھا بلکہ انھوں نے سچا سودا کیا تھا جس پر باپ نے انھیں بری طرح پیٹا تھا۔ مذہبی واقعات کے متعلق اور بھی کئی تصاویر لگی تھیں۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل رکھا تھا جس پر کنگھے، برش، تیل کی شیشیاں بے ترتیبی سے دھری تھیں غالباً بچے انھیں وہاں بھول گئے تھے۔

سردار جی نے گاؤ تکیہ بغل میں دبایا اور قریب کی الماری میں سے سبز رنگ کی جلد والی ایک موٹی سی کتاب نکالی۔ اس میں مختلف بھگتوں کا کلام مع تشریح کے درج تھا۔ سردار جی نے بڑے انہماک سے کلام سنانا شروع کیا۔ بساکھا سنگھ کرسی پر بھونڈے انداز میں بیٹھا بظاہر سن رہا تھا لیکن درحقیقت اس کا ان چیزوں میں دھیان نہیں تھا بلکہ بعض اوقات خود سردار صاحب بھی پڑوس کے کمہار کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ میں سطر بھول کر کہیں اور جا پڑتے تھے۔

بالآخر یہ پروگرام ختم ہو گیا تو سردار صاحب نے کتاب بند کر کے تپائی پر رکھ دی۔ آسمان پر اکا دُکا تارے جھلملانے لگے تھے۔

دفعتاً سردار صاحب بولے۔ "آج میں نے ایک پستول خریدا ہے......"

"پستول؟" بساکھا سنگھ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں۔" یہ کہہ کر سردار صاحب الماری کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"وہ کیوں؟" بساکھا سنگھ نے تعجب سے پوچھا۔

سردار صاحب نے قدرے تامل کیا اور پھر ایک چپٹا ڈبہ نکال کر لائے۔ "دیکھئے نا آج کل زمانہ بڑا خراب ہے۔ دنیا میں کسی کا کوئی دھرم ایمان ہی نہیں رہا۔ ہم یہاں رہتے تو ہیں لیکن ہمیشہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں اِدھر اُدھر کے اچکوں میں سے کوئی گھر میں گھس آئے تو کیا ہو۔ واہگورو...... واہگورو...... آج کل تو لوگ خواہ مخواہ ہاتھاپائی پر اتر آتے ہیں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے پستول کی جھلک دکھائی۔ بساکھا سنگھ نے دیسی ساخت کے پستول تو دیکھے تھے لیکن اس قدر اچھا پستول دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

سردار صاحب کہنے لگے۔ "یہ وسیلے کمپنی کا بنا ہوا ہے۔ بہت اچھی کمپنی ہے۔ اسٹینڈرڈ چیز ہے...... آٹومیٹک ہے...... اڑتیس بور ہے۔"

بساکھا سنگھ چپ چاپ پستول کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"آپ جانتے ہی ہیں آج کل زمانہ خراب ہے، کبھی وقت بے وقت اِدھر اُدھر آنا جانا پڑتا ہے۔ رات کو بھی اسے تکیے کے نیچے رکھ کر سویا جائے تو خاصی بے فکری سی محسوس ہوتی ہے۔"

بساکھا سنگھ نے گردن قدرے آگے بڑھا کر پوچھا۔ "کیوں جی اس کی قیمت کیا ہو گی؟"

سردار صاحب نے لاپروائی سے کہا۔ "یہ تو سستا ہی مل گیا۔ اجی آج کل یہ چیز بالکل نایاب ہو گئی ہے۔ مجھے تو چودہ سو روپے میں مل گیا ہے۔"

"چودہ سو؟...... یعنی ایک ہزار چار سو میں......" یہ کہتے کہتے بساکھا سنگھ کا حلق خشک ہو گیا۔ اور اس کی آواز بھی پھنس کر رہ گئی۔

"یہ دیکھیے......ادھر سے کارتوسوں کی میگزین اندر داخل کی جاتی ہے۔ آٹھ کارتوس ہوتے ہیں ایک میگزین میں۔ یکے بعد دیگرے آٹھ گولیاں چل سکتی ہیں۔"

بساکھا سنگھ نے دیکھنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ سردار صاحب نے پستول اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "خیال رہے بھرا ہوا ہے۔ گھوڑا دبانے کی کسر ہے...... انگلی لبلبی سے دور ہی رہے......"

اس لوہے کے سرد ہتھیار کو پکڑتے وقت پہلے تو بساکھا سنگھ کا ہاتھ کپکپایا اور پھر اس نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اسے اِدھر اُدھر گھما کر دیکھا۔ پھر دستہ مٹھی میں لے کر انگلی لبلبی پر رکھ دی۔

سردار صاحب نے اک دم ہاتھ آگے بڑھایا۔ "ارے چل نہ جائے......"

بساکھا سنگھ نے پستول والا ہاتھ فوراً پیچھے ہٹا لیا اور پھر اس نے دھیرے دھیرے سر اوپر اٹھایا۔ اس کے ہونٹوں پر موہوم سی مسکراہٹ پیدا ہو کر رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی۔ اس کی آنکھیں راکھ کی طرح سیاہ اور بے کیف دکھائی دے رہی تھیں۔

سردار صاحب پیچھے ہٹ گئے۔ ان کے سر پر چھوٹی ململ کی زرد سی دستار لپٹی ہوئی تھی۔ داڑھی لٹک رہی تھی۔ آنکھوں سے سمجھ میں نہ آنے والی کیفیت ہویدا تھی۔ انھوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "خاموش کیوں ہو، کیا تم سوچ رہے ہو کہ اگر اس وقت تمہارے دشمن تمہارے سامنے ہوں تو تم انھیں چنوں کی طرح بھون ڈالو؟"

"کون دشمن؟" بساکھا سنگھ نے بے رس آواز میں پوچھا اور پھر وہ سمجھ گیا کہ سردار صاحب کے اس اشارے کا کیا مطلب ہے۔

وہ اٹھ کر کرسی سے الگ کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھاری آواز میں کہنا شروع کیا۔ "صبح سے شام تک اپنی پیشانی سے ایڑی تک پسینہ بہانے والا کوئی شخص بھی میرا دشمن نہیں ہو سکتا۔ اب مذہب

صرف دو رہ گئے ہیں۔ ایک دوسروں کا خون چوسنے اور انھیں لوٹنے والوں کا مذہب اور دوسرا اپنا خون دینے والوں اور لٹنے والوں کا مذہب۔ اس کے علاوہ اور کوئی مذہب نہیں ہے۔ آپ سمجھے ...... آپ نہ معلوم کون سے گیان دھیان کی باتیں کرتے ہیں ...... وہ باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آتیں ...... شاید اس لیے کہ میں بھوکا ہوں، میرے بچے بھوکے ہیں، میری بیوی بھوکی ہے ...... میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضرورت کے لیے ترستا ہوں......"

پھر وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ اس نے دوبارہ چودہ سو روپے والے پستول کی طرف دیکھا اور نظریں سردار جی کی نظروں سے ملائیں۔

سردار جی ہڑبڑا کر چارپائی سے اٹھ بیٹھے۔ تپائی کو دھچکا لگا تو لمپ نیچے گر پڑا۔ تیل بہہ نکلا اور غالیچے کو آگ لگ گئی۔

بڑے سردار صاحب کے لیے باہر جانے کا راستہ بالکل بند تھا۔ راستے میں لمبا تڑنگا بسا کھا سنگھ کھڑا تھا، اس کے چوڑے شانے، مضبوط ٹانگیں، مچھلیوں والے بھرپور بازو، تنی ہوئی گردن، چوڑے چکلے ہاتھ ...... یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بدن میں نسوں کے بجائے فولاد کی تاریں کھینچ دی گئی ہیں ...... مضبوط، مغرور، اٹل ...... بڑے سردار صاحب دیوار سے چپکے کھڑے تھے۔ رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ سانس تیزی سے چل رہی تھی، پلپلا پیٹ نیچے اوپر ہو رہا تھا۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑی تھیں۔ وہ اس قدر دہشت زدہ ہو چکے تھے کہ حلق میں سے کوئی آواز تک نہیں نکل پاتی تھی۔ وہ بت بنے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اجڈ کسان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دفعتاً شور سا بپا ہو گیا۔ کمہاروں کے گدھے زور زور سے ہنہنانے لگے۔ ادھر سے ریل گاڑی گڑگڑاہٹ کا شور مچاتی پل پر سے گزر رہی تھی اور ادھر انجن اپنے پھٹکے ہوئے سینے سے مہیب چیخوں کی صدائیں فضا میں بکھیر رہا تھا۔

غالیچے کو لگی ہوئی آگ لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

# پہلا پتھر

تب شاستری اور فریسی ایک عورت کو لائے جو بدکاری میں پکڑی گئی تھی، اور اس کو بیچ میں کھڑا کر کے کہا

اے استاد! یہ عورت بدکاری کرتی ہوئی پکڑی گئی ہے۔

موسیٰ کے قانون کے مطابق ایسی عورت کو سنگسار کرنا جائز ہے۔ سو تو اس عورت کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

جب وہ اس سے پوچھتے رہے تو اس نے سیدھے ہو کر ان سے کہا: "تم میں سے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ وہ پہلے اس کو پتھر مارے۔"

(یوحنا رسول: آیت ۳، ۴، ۵، ۷ تا ۷)

(۱)

رندہ ہاتھ سے رکھ کر باج سنگھ نے چوکنا تیتر کی طرح گردن دروازے سے باہر نکالی اور ایک نظر شاہی اصطبل پر ڈالی...... کوئی خاص چیز دکھائی نہیں دی۔ حالانکہ اسے شبہ یہی ہوا تھا کہ گھکی بڑے دروازے میں کھڑی کسی کو آواز دے رہی تھی۔ وہ اس خیال سے اٹھا تھا کہ اندھیرے میں جھکی

کی ایک آدھ چمی لے لینا مشکل نہ ہوگا۔

'شاہی اصطبل' دراصل اصطبل نہیں تھا بلکہ یہ سردار ودھاوا سنگھ کی شاندار حویلی تھی جسے باج سنگھ عرف باج اور اس کے چیلے چانٹے شاہی اصطبل کے نام سے پکارتے تھے۔ حویلی کی سب سے بڑی خوبی تھی اس کی کشادگی۔ یہ حویلی ایک بہت بڑے صندوق کے مانند تھی۔ چھت کا طول و عرض اتنا کہ پوری بارات کے لیے چارپائیاں بچھائی جاسکتی تھیں۔ بڑے بڑے ہال کمرے، دروازے آٹھ آٹھ فٹ اونچے۔ ان ہال کمروں میں عظیم الجثہ سردار ودھاوا سنگھ فیل پا کے باعث زخمی شیر کی طرح اینڈھ کر چلا کرتے تھے۔ حویلی کا ایک حصہ لیبل پرنٹنگ پریس کے لیے وقف تھا۔ اس کے علاوہ حویلی کے اندر کے جانب بڑے دالان کے گوشے میں نانک فرنیچر مارٹ کے مالک بھی سردار جی ہی تھے۔ فرنیچر کا کارخانہ یہاں تھا اور شوروم حویلی کی دوسری طرف یعنی عین برلب سڑک۔

باج ہیڈ مستری تھا۔ ہاتھ کی صفائی اور حرامزدگی کی 'چستی' کے باعث سب کارندوں کا، خواہ وہ کارخانے کے ہوں یا پریس کے، وہ استاد سمجھا جاتا تھا۔

حویلی کے بغل میں سڑک کی جانب چند دُکانیں تھیں مع مکانات کے یہ سب سردار جی کی ملکیت تھیں۔ آخر ان کے آباء واجداد جالندھر شہر ہی میں رہتے آئے تھے۔ اس لیے اتنی سی جائداد کا بن جانا غیر معمولی بات نہیں تھی۔

جب ۱۹۴۷ء کے آغاز میں مغربی پنجاب کے مسلمان بھائیوں نے اپنے کراڑ اور سکھ بھائیوں کا ناکہ بند کر دیا تو رفیوجیوں کی ایک بڑی تعداد مشرقی پنجاب میں آگئی۔ ان میں گھکی کا باپ دیوی داس بھی تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ بنیا تھا۔ چنانچہ سردار جی نے حویلی کے بالکل بغل والا دُکان اور مکان ازراہِ کرم اسے کرایہ پر دے ڈالا۔ اور وہ وہاں پنساری کی دُکان کرنے لگا۔ اس کی بیوی کو مسلمان بھائیوں نے ہلاک کر دیا تھا۔ لیکن اس کا اپنی تین جوان لڑکیوں سمیت صحیح سلامت نکل آنا معجزے سے کم نہیں تھا۔ ان میں سے سب سے بڑی کا نام گھکی، اس سے چھوٹی کا نام نکی اور سب سے چھوٹی کا سانولی تھا۔ سانولی اندھی تھی۔

گھکی خوبصورت اور بانکی لڑکی تھی۔ موقعہ پا کر سب سے پہلے باج سنگھ نے اس کی چمی لی تھی۔

بوسہ لینے کے سلسلے میں کھل جا سم سم تو باج نے کی۔ لیکن اس کے بعد باقی لوگوں کا راستہ بھی صاف ہو گیا۔ اس میں امیر و غریب کی تخصیص نہیں تھی۔ سردار صاحب کے بیٹے، ان بیٹوں کے دوست اور کارندے وغیرہ سب ایک آدھ چمی کی تاک میں رہتے۔ یہ بات نہیں تھی کہ ان میں سے ہر ایک کا داؤ چل ہی جاتا ہو۔ بعض تو دور ہی سے چٹخارے لینے والوں میں سے تھے۔ کیونکہ گھکی بقول لیبل کاٹنے والے چرن کے "بڑی چلتی پرزی" تھی۔ پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتی تھی کسی کو۔ اور تو اور خود باج سنگھ جو بڑا دیدہ دلیر اور گھسٹرم گھساڑ قسم کا آدمی تھا چمی سے آگے نہ بڑھ پایا تھا، تو بھلا دوسروں کو وہ قریب کہاں پھٹکنے دیتی تھی۔

مایوس ہو کر باج سنگھ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کارخانے کے دروازے ہی میں کھڑا رہ گیا۔ اس کے بازو کہنیوں تک لکڑی کے برادے سے سنے ہوئے تھے۔ پینتالیس بہاریں دیکھنے کے بعد بھی اس کا بدن اکہرا اور مضبوط تھا۔ صورت گھناؤنی ہونے سے بال بال بچی تھی۔ مونچھوں کے بال جھڑ بیڑھی کے کانٹوں کی طرح ہو گئے تھے، ہونٹ موٹے، ایک آنکھ میں پھولا، اونٹ کے کوہاں کی طرح ناک کے نتھنوں میں سے بال باہر نکل آیا کرتے تھے۔ جنھیں وہ چٹی سے کھینچ ڈالتا۔ آج سے دس برس پہلے اس کی بیوی مر گئی۔ بیوی کے چھ مہینے بعد اس کی اکلوتی بچی بھی چل بسی۔

وہاں کھڑے کھڑے باج نے دیکھا کہ جس ہل چل کا اسے احساس ہوا تھا، وہ بالکل بے معنی نہیں تھی۔ کیونکہ حویلی کے یکے بعد دیگرے چار دروازوں سے پرے باہر والے برآمدے میں برقی روشنی ہو رہی تھی۔ لکڑی کے چھوٹے سے پھاٹک میں سے کچھ سامان اندر لایا جا رہا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ضرور کوئی نیا مہمان آیا ہے۔ جب سے مغربی پنجاب میں گڑبڑ شروع ہوئی تھی۔ سردار جی کے یہاں کافی مہمان آ رہے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے ان کے ایک ہندو دوست اپنے بال بچوں سمیت آ گئے۔ ان کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ چمن ......! اس کی گردن مور کی سی تھی اور آنکھیں سرمیلی۔ وہ بھی گھکی کو دلچسپی کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ باج کے چیلے چانٹوں کا خیال تھا کہ گھکی بھی اس پر مرتی تھی۔ باج کے دل میں حسد پیدا نہیں ہوا۔ وہ ان چیزوں سے بالاتر تھا، کہتا "ارے ہمارا کیا ہے، ہم نے آتے ہی گھکی کی چمیاں لے کر اسے کانی کر ڈالا۔ اب چاہے ٹنڈا لاٹ بھی اس کی چمی لیا

کرے ہمارے ...... سے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی ایک ثابت اور دوسری پھولا ماری آنکھ سے سب کے چہروں کا جائزہ لیتا۔

جب چمن کے گھر والے الگ مکان لے کر رہنے لگے تو پھر بھی سردار جی کے یہاں چمن کی آمدورفت جاری رہی۔ ادھر باج نے گھکی سے زیادہ اس کی چھوٹی بہن نکی کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔

دروازے میں کھڑے کھڑے پہلے تو باج کے دل میں آئی کہ جا کر نئے مہمانوں کو دیکھے۔ شاید کوئی 'لنڈیا' بھی ان میں شامل ہو لیکن آج کل کام بہت آیا ہوا تھا جسے جلد از جلد ختم کرنا ضروری تھا۔

"ہٹاؤ" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "صبح سب کچھ سامنے آجائے گا۔"

(۲)

دوسرے روز آنکھ کھلی تو باج نے جلتا پھنکتا سورج اپنی پیشانی پر چمکتا ہوا پایا۔

ادھر یہ ہڑبڑا کر اٹھا، ادھر بڑی سردارنی حسبِ معمول بھوری بھینس کی طرح کدو کدو بھر چھاتیاں تھلتھلاتی، سینہ زوریاں دکھلاتی، آگ جلانے کے لیے برادہ لینے کے واسطے چھاج ہاتھ میں پکڑے اس کی جانب بڑھی۔

بڑی سردارنی کے جسم کا ہر عضو اپنے نقطہ عروج تک پہنچ چکا تھا یعنی جو چیز جتنی موٹی، جتنی بھدی، جتنی کشادہ ہو سکتی تھی، ہو چکی تھی، چلتی تو یوں معلوم پڑتا جیسے تنور ڈھانپنے والے چاپڑ کو پاؤں لگ گئے ہوں۔

ایسی ڈبل ڈوز سردارنی بھی سردار جی کے لیے ناکافی ثابت ہوئی۔ چنانچہ انھیں ایک چھوٹی سردارنی بھی کہیں سے اڑا کر لانی پڑی۔ لیکن جب سے ان کے فوطوں میں پانی بھر آیا تھا۔ تب سے انھوں نے سردارنیوں سے توجہ ہٹا کر ہر روز کئی کئی گھنٹے مسلسل گوربانی کے پاٹھ پر مرکوز کر دی تھی۔

موقعہ ملنے پر بڑی سردارنی ضرورت سے زیادہ دیر تک باج کے پاس کھڑی رہتی۔ کیونکہ باج نہایت مسکین بن کر کئی بار کہہ چکا تھا۔ "پر وڈھی سردارنی آپ بیالیس برس کی تو نہیں دکھائی دیتیں جی!......جی! آپ تو مشکل سے تیس برس کی دکھائی دیتی ہیں۔"

اس پر بڑی سردارنی دل ہی دل میں چہک اٹھتیں اور غین (غ) کی طرح منہ بنا کر فرماتیں۔

"ہٹ وے پراں۔ کون کہتا ہے میں بیالیس برس کی ہوں۔"

اس کے بعد وہ دروازے سے کندھا بھڑائے جی کھڑی رہتیں۔ ایک ٹانگ سیدھی رکھتیں اور دوسری ٹانگ کو دھیرے دھیرے حرکت دیتی رہتیں۔ ڈھکے ہوئے پپوٹوں تلے دبی ہوئی پتلیاں باج کے چہرے پر جمائے رکھتیں۔

باج دل ہی دل میں سوچتا کہ گھکی کی کمر تو بڑی سردارنی کی پنڈلی سے بھی پتلی ہوگی۔

بالآخر جب سردارنی ٹوٹے ہوئے چھاج میں برادہ بھر کر لوٹیں تو ان کے پچھواڑے کا نظارہ دیکھ کر باج کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "بلے بلے" پھر اپنے ایک نوجوان ساتھی بونگے سے مخاطب ہو کر بولا "کیوں او بونگیا! اگر سردار جی پھیل بے جنجیر ہیں تو سردارنی بھی وہ چٹان ہے جو جتنی جمین سے باہر ہے اس سے چار گنا جمین کے اندر دھنسی ہوئی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے پھلاہ کی داتن منہ میں ڈالی تو اس کی چرمراہٹ سے اس کا بدصورت چہرہ اور زیادہ بھدا ہو گیا۔

بونگے نے جواب دیا۔ "ابے تو سردار جی کو کیا سمجھتا ہے۔ اگر سردارنی چار گنا زمین کے اندر ہے تو سردار جی دس گنا جمین میں دھنسے ہیں۔"

باج نے بیٹھے بیٹھے مریل بونگے کو لات رسید کرتے ہوئے کہا۔ "اوئے چل اوئے موں دیا متراڑا۔" جو بات یاد آئی تو پھر بولا۔ "پر بونگیا گھکی کی کمر تو سردارنی کی پنڈلی سے بھی کم موٹی ہوگی......"

"تو پھر؟"

"تانا...... سوچو بھلا اتنی پتلی کمر...... بہت پتلی کمر ہے جار! اتنا ناجک لک۔"

"او ہٹ!" بونگے نے مشفقانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ "عورت کی کمر میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ مرد کی ساری طاقت چھاتی اور عورت کی کمر میں ہوتی ہے۔"

"سمجھا!!" گھاگ باج نے گال کے اندر زبان گھمائی۔

اسی اثناء میں چمن بھی ادھر آ نکلا۔ وہ ہر وقت چمکتا رہتا تھا۔ باچھوں میں سے ہنسی یوں پھوٹی پڑتی تھی جیسے وہ ریوڑیاں کھا رہا ہو۔ چلتا تو لہرا کے۔ بات کرتا تو بل کھا کے۔

بونگے نے کہا۔ "لے بھئی! گھنیا جی تو آ گے۔"

"گوپی بھی آتی ہی ہو گی۔" باج نے چھدرے دانتوں کی نمائش کی اور منہ سے ٹپکتی ہوئی رال کو بمشکل روکا۔

بونگے نے پہلے تو چمن کو دل پھینک انداز سے دیکھا اور پھر ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ باج کی بغیر پھولے والی آنکھ سے ملائی اور گھی میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔ "جار! جیہ لونڈیا بھی گوپی سے کم نمکین نہیں ہے۔"

باج نے ایک اور لات رسید کی۔ "بڑا ٹھرکی ہے بے تو۔"

بونگے نے بھاؤ بنا کر گانا شروع کیا۔ "اوئے بھگت لبوب کبیر بھی تو فرما گئے ہیں کہ اوئے کچا منڈا رن ورگا......"

عین اس وقت چھوٹی سردارنی بھی کوٹھے مٹکاتی دھم دھم کرتی دروازے سے نکل کر صحن میں آن پہنچیں۔

کہنے کو تو وہ چھوٹی سردارنی تھیں لیکن ڈیل ڈول کے لحاظ سے اگر بڑی بیس تھی تو وہ اکیس۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دھنیے نے منوں روئی دھنک کر ہوا میں اڑا دی ہو۔ البتہ نقوش تیکھے تھے، رنگ نکھرا ہوا تھا، چہرہ چکنا چپڑا، اگلے دو دانتوں میں سونے کی میخیں۔

مشہور تھا کہ وہ سردار جی کی بیاہتا نہیں تھیں۔ بقول باج کچھ جیر جبر معاملہ تھا۔ باوجود موٹاپے کے چھوٹی سردارنی کی بوٹی بوٹی تھرکتی تھی۔ بڑی سردارنی کو حالات نے ذرا فلسفی بنا دیا تھا اور حالات ہی نے چھوٹی سردارنی کو 'چل چل چنبیلی باغ میں میوہ ...... الخ۔" بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑی سردارنی کے سامنے لونڈے لونڈیاں آپس میں ہنسی ٹھٹھول کرنے سے کتراتی تھیں۔ لیکن چھوٹی سردارنی کے سامنے کھلے بندوں چھیڑ چھاڑ کا بازار گرم رہتا۔ گرما گرمی میں چھوٹی سردارنی کی کمر میں بھی ایک آدھ چٹکی بھر لی جاتی۔ جس پر وہ نوخیز لڑکی کے مانند کلبلاتی، بل کھاتی اور کھل کھلاتی تھیں۔ وہ رنگین محفلوں کی جان تھیں۔ ان کی عمر اگرچہ پینتیس سے تجاوز کر چکی تھی، تاہم سردار جی اب بھی ان کی نگرانی کرتے تھے۔ کیونکہ چھوٹی سردارنی چلتی تو جھمکڑے کے ساتھ، بیٹھتی تو جھمکڑے

کے ساتھ۔ اس کی بے تکلفانہ محفلوں میں آنکھیں لڑانے، چٹکیاں لینے اور ہائے وائے کرنے کے مواقع بڑی آسانی سے فراہم ہو جاتے تھے۔ شاذ و نادر وہ ایک آدھ بد تمیزی پر چیں بر جبیں بھی ہو جاتیں تو سب لڑکے اور لڑکیاں انھیں منانے لگتے۔ ان کے بدن کو سہلایا جاتا۔ ان سے لپٹ لپٹ کر خوشامدیں کی جاتیں آخر کار وہ من جاتیں۔

چنانچہ اب جو وہ صحن میں داخل ہوئیں تو گویا نسیم سحری کی طرح آئیں اور اپنے ہمرکاب نہ صرف بوئے چمن لائیں بلکہ اپنے اوٹ میں نرگس، نسرین اور گلاب وغیرہ بھی لائیں یعنی گھکی، نکی اور سانولی اور دیگر لڑکیاں بھی ان کے پیچھے چھپی چھپی آ رہی تھیں۔ مقصود اس سے حاضرین کو تعجب انگیز مسرت بہم پہنچانا تھا۔ وہی بات ہوئی کہ دفعتہً "اوئے" کے شور سے فضا گونج اٹھی اور کچے کنوارے قہقہوں کی مسلسل موسیقی سے سارا صحن رسمسا گیا۔

ان سب سے دور، سڑک والے کمرے میں کسی جٹاجوٹ سنیاسی کی طرح پاٹھ کرتے ہوئے سردار جی کے کان بھی ان آوازوں سے تھرتھرائے، پیشانی کے خطوط گہرے ہو گئے انھوں نے جلدی سے اپنے بڑے بڑے دانتوں پر ہونٹ پھسلا کر بے چینی سے پہلو بدلا اور غرا کر کہا:

"باگورو نام جہاز ہے، جو چڑھے سو اترے پار۔"

(۳)

داتن کی آخری منزل پر پہنچ کر باج نے بڑا کنستر اٹھایا اور صحن کے پرلے گوشے میں دستی نلکے کے قریب پہنچا۔

اب فضا نسبتاً پر سکون تھی۔ کچھ لوگ تو چھوٹی سردارنی کو گھیرے تھے باقی اپنے اپنے مشاغل میں محو تھے۔

کنستر نلکے کے نیچے رکھ کر باج نے دستی کے دو چار ہاتھ ہی چلائے ہوں گے کہ سامنے سے نکی جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی اس کی جانب آئی اور آتے ہی بولی: "کنستر اٹھاؤ تو......"

باج کی خوشی کا بھلا کیا ٹھکانہ تھا۔ داتن چباتے چباتے اس کا منہ رک گیا۔ آنکھوں کے گوشے

شرارت اور حرامزدگی کے باعث سمٹ گئے۔ "نی کڑیے کی گل اے۔"

"اے دیکھ گل دل کچھ نہیں۔ کنستر ہٹا جھٹ پٹ۔"

باج نے دانت پیس کر ہاتھ پھینکا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نکی پہلے ہی سے تیار تھی۔ جھپ سے پیچھے ہٹ کر بدن چرا گئی اور نیم معشوقانہ انداز سے چلا کر بولی۔ "ہم کیا کہہ رہے ہیں کنستر ہٹا، نا۔"

"اری کنستر سے کیا بیر ہے...... ہماری ہر چیز سے بدکتی ہو۔"

"پانی پئیں گے۔"

باج نے کنستر ہٹا دیا۔ "لو جانی پیو اور جیو۔ جیو اور پیو۔"

نکی نے نل کے نیچے ہاتھ رکھ دیا اور قدرے انتظار کے بعد انجن کی سیٹی کی سی آواز میں چلائی "اے ہے...... دستی ہلاؤ۔"

باج نے صوفیانہ رمز کے ساتھ جواب دیا۔ "تم ہی ہلاؤ نا دستی......"

"دیکھو تنگ مت کرو۔"

"اری نام نکی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تو سچ مچ نکی (چھوٹی) ہے۔"

"چھوٹی نہیں تو کیا بڑی ہوں۔" نکی نے نچلا ہونٹ ڈھیلا چھوڑ کر شکایت آمیز نگاہ اس پر ڈالی۔

اب باج نے بڑی فراخ دلانہ ہنسی ہنس کر دستی ہلانا شروع کی۔

پانی پی کر نکی بھاگنے لگی تو باج نے فوراً اس کی کلائی دبوچ کر ہلکا سا مروڑا دے دیا۔

"اوئی۔"

"کیا ہے؟"

"میری کلائی ٹوٹ جائے گی۔"

"یہاں دل جو ٹوٹا پڑا ہے۔"

"چھوڑ نا! کوئی دیکھ لے گا۔"

"اری کبھی ہم سے بھی دو بات کر لیا کر۔"

"کہا نا، کوئی دیکھ لے گا۔"

"تو پھر آئے گی نا ہمارے پاس۔"

"میں نہیں جانتی۔"

ایک اور مروڑا۔ نکی کو واقعی سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ جان چھڑانے کے لیے بولی۔ "اچھا آ جاؤں گی۔"

"پکا وعدہ۔"

"ہاں۔"

"مار ہاتھ پر ہاتھ۔"

ہاتھ پر ہاتھ مارا گیا۔

"اچھا دیکھ! اب کلائی چھوڑے دیتا ہوں۔ پر ایک شرط ہے ..... تو بھاگے گی نہیں۔

"اچھا نہیں بھاگوں گی۔ چھوڑ اب کوئی دیکھ لے گا۔"

"بس دو ملٹ بات کر لے ہم سے۔ جا در کھیو جو ہمیں دھوکا دیا تو بانس پر لٹکا دوں گا۔"

ہاتھ چھوٹنے پر نکی ننھی سی خوش وضع ناک چڑھائے اور ابرو پر بل ڈالے نیم رضامندی سے رکی رہی اور جب کہ باج اس نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ ٹھنک کر بولی۔

"کہہ اب۔"

"بات کرتی ہو کہ ڈھیلے مارتی ہو۔"

"اب جو تم سمجھو۔ جلدی سے بات کہہ ڈالو۔ اتا بخت (وقت) نہیں ہے۔"

"بخت (وقت) نہیں ہے۔ کیا کسی جار (یار) سے ملنے جانا ہے۔"

"دھت۔ کوئی سن لے گا۔ تم بڑے ......"

"بڑے کیا؟"

"بدماس ہو۔"

"ہائے سریپ جادی ..... کبھی کبھار بدماس سے بھی ایک آدھ بات کر لیا کر ...... اچھا نکی یہ بتا کہ تیری عمر کتی ہے۔"

"سولہ برس۔"

"کیسی میٹھی عمر ہے۔"

"ہو گی۔ بس جائیں اب۔"

"گھکی کی بھلا کیا عمر ہو گی؟"

"مجھ سے ڈیڑھ سال بڑی ہو گی۔"

"اور سانولی......"

"چودہ کی ہو گی۔"

"لیکن نکی تو تو چودہ کی بھی نہیں دِکھتی۔"

"دکھتی کیسے نہیں۔"

"جرا نجیک (نزدیک) آنا! دیکھوں۔"

"ہٹ۔"

"آج کل مستی جھاڑ رہی ہو۔ پہلے تو گھکی ہی تھی۔ اب تم نے بھی پر نکال لیے ہیں...... تم کیا اب تو سانولی بھی رنگ دکھلا رہی ہے۔"

"ارے دیکھ سانولی کو کچھ مت کہیو۔ وہ بچاری اندھی ہے۔ اس سے بری بھلی بات مت کرنا۔"

"اری نکی جوانی بن بولے بات کرتی ہے۔ اس کو اندھی کہتی ہو۔ کھد مجاا اڑاتی ہو...... لو وہ رہی سانولی۔ چپ چاپ دروجے میں بیٹھی ہے۔"

صحن کے دوسرے کونے میں دروازے کی دہلیز پر اندھی سانولی الگ تھلگ چپ چاپ بیٹھی تھی۔

نکی نے ادھر دیکھا تو باج نے پوچھا۔ "سانولی جنم کی اندھی ہے کیا؟"

"نہیں۔"

"تو کیسے ہوئی اندھی۔"

"دیکھو بیکار بیکار باتیں کرتے ہو۔ ہم جاتے ہیں۔"

"ٹھہر نا جرا۔ بتا تو دے۔" باج نے اصرار کیا۔ وہ قرب یار کو طول دینے کے لیے بے معنی باتیں کیے جا رہا تھا۔

"بھئی ہم کچھ نہیں جانتے۔ لالہ (باپ) کہتا ہے کہ وہ بچپن میں اندھی ہو گئی تھی۔ اب میں کیا

جانوں۔ لو ہم چلے۔"

"ارے ہیں درو۔ جے میں سانولی کے پاس کون کھڑا ہے؟"

نکی چلتے چلتے رک گئی۔ "ہم نہیں جانتے۔"

باج باچھوں کو خوب کھینچ کر ہنسا۔ "تجھے معلوم نہیں...... کبھی تو تیرے جار ہیں۔"

"دیکھ ہم سے بکواس مت کر...... ہم اسے کیا جانیں۔ رات ہی تو آیا ہے۔"

"ارے رات والا...... اچھا اچھا یاد آیا۔ میں نے اس وقت اندر سے سر نکالا۔ سچ نکی میں سمجھا تم ہو...... لیکن نکی تم......"

نکی نے جھنجھلا کر قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو ہم چلے۔"

اس پر باج نے زور سے ناک صاف کی اور دستی ہلانے لگا۔

(۴)

لڈو سرپٹ بھاگتا ہوا آیا اور کارخانے کے دروازے کے دونوں پٹ اس قدر دھماکے کے ساتھ کھولے کہ اندر کام کرتے ہوئے باج اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ رک گئے۔ وہ قدرے حیران ہو کر اس کا منہ تکنے لگے کہ لڈو لیبلوں کی گڈیاں باندھنی چھوڑ کر بے وقت یہاں کیسے آن ٹپکا۔

اندر پہنچ کر خود لڈو کو اس بات کا احساس ہوا کہ اس قدر دھماکے سے اپنی آمد کے جواز کے لیے جو مواد اس کے پاس ہے وہ کافی اور مناسب ہے بھی یا نہیں۔ بہر حال اس نے ہانپتے ہوئے گردن گھما کر سب کی طرف دیکھا اور بولا۔ "جارو! آج بڑی مزے کی بات دیکھنے میں آئی۔"

مزے کی بات!!...... اس وقت گیارہ بجنے کو تھے۔ کاریگر مسلسل کام کر رہے تھے۔ اس لیے وہ مزے کی بات سننے کے موڈ میں تھے۔ اُدھر باج سنگھ نے صبح باسی مٹھے سے سر دھویا تھا۔ اس کے بالوں سے ابھی سڑی لسی کی بساند دور نہیں ہوئی تھی۔ اس نے بھی موقعہ غنیمت جانا کہ مزے کی بات سننے کے ساتھ ساتھ وہ بالوں میں کنگھا کر لے گا۔ اس طرح جب اس کے بالوں کے اندر تک ہوا پہنچے گی تو بال سوکھنے کے ساتھ بساند بھی دور ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے اپنا پھاوڑا سا کنگھا اٹھایا

اور اسے داڑھی میں اڑس کر بولا:

"ابے لڈو ماؤں کے متراڑ، جب سے تو پیدا ہوا ہے۔ آج تک تو نے کوئی مجے دار بات نہیں سنائی لیکن آج تو مینڈکی کو بھی زکام والی مثال تجھ پر لاگو ہوتی ہے......اچھا بول بیٹے بجورے۔"

حالات موافق پاکر باقی کاریگر بھی پنڈے کھجاتے ہوئے لڈو کے قریب آگئے۔ ان میں مونوں (منڈے ہوئے سر والوں) نے بیڑیاں جلا کر دانتوں میں داب لیں۔

اس غیر متوقع خوش آمدید سے لڈو کی جان میں جان آئی۔ اس نے گھگھیا کر ایک بیڑی طلب کی......جو قدرے ناک بھوں چڑھانے کے بعد دے دی گئی۔ اب لڈو نے بڑے اہتمام کے ساتھ بیڑی کو جلایا یہ توقف حاضرین کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ باج نے دولتی رسید کرنے کے انداز سے پاؤں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "اوئے بھین کے بگن جلدی سے اُگل ڈال۔ سالے ہم تیرے بے بے کے نوکر تو نہیں ہیں کہ بیٹھے منہ تکتے رہیں تیرا......"

"جار آج بڑے مجے کی بات ہوئی۔" لڈو نے اس طرح بات شروع کی جیسے اُبلتے ہوئے پانی کی کیتلی کا ڈھکنا بھک سے اڑ جائے۔ "آج صبح جب باج نکی سے......باج نکی سے......"

باج نے خونخوار تیور بنا کر کہا۔ "اوئے تیری بہن کو چور لے جائیں...... ہماری ہی بات ملی سنانے کو......"

"نئیں نئیں جی۔" لڈو نے خالص پنجابی لہجے میں حلق سے گھسا کر آواز نکالی۔ "پادشاہو! آپ کی بات نہیں ہے۔ وہ تو گھکی کی بات ہے۔"

ایک کاریگر نے اشارہ کر کے ساتھیوں سے کہا۔ "یہ چونگا بھی ٹھرکی ہے اور گھکی پر ٹھرک جھاڑنے والوں میں شامل ہے، ہاں تو برخوردار کیا بات ہے گھکی کی......"

"او جی جب چھوٹی سردارنی اکھبار میں لگی ہوئی ماسٹر تارا سنگھ کی تصویر سب کو دکھال رہی تھیں تو گھکی اور چمن کی نجریں ملیں......میں دیکھ رہا تھا چپکے سے۔"

"تو تو دیکھا ہی کرتا ہے گھکی کو، پر سالے چمن نے جتنی چمیاں لی ہیں تو نے اُتی ٹھوکریں نہ کھائی ہوں گی گھکی کی۔"

اس پر لڈو نے روٹھنے کے انداز سے منہ بسورا تو کسی نے ہمدردی جتائی۔ "بھئی ایسا مت کہو بچارے کو۔ گھکی کی ٹھوکروں میں کیا کم مجا ہے۔ کسیوں نے تو ٹھوکر بھی نہ کھائی ہو گی اس کی...... ہاں تو بول بیٹا بول...... بول بجورے بول۔"

"بس پھر کیا تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوئے، ابرو ہلے۔ اور پھر گھکی بڑی مسومی کے ساتھ اٹھ کر ٹھمک ٹھمک چل دی۔"

"کہاں چھت کو۔"

"اے نہیں...... اس بکت تو وہ اپنے گھر کو گئی۔ تھوڑی دیر بعد چمن نے کہا کہ جرا پکھانے جاؤں گا۔ سردارے (سردار جی کا بڑا لڑکا) نے کھانس کر کہا۔ بئی جلدی آنا۔ نہ جانے پکھانے میں بند کیا کرتے ہو۔ اس پر چمن بڑی میٹھی ہنسی ہنستا ہوا پچھلے کمرے میں چلا گیا جہاں سے کہ چھت کو سیڑھیاں جاتی ہیں۔"

ایک دو نے جماہی لے کر کہا۔ "اے لڈو کے گھسے۔ یہ سب پرانی باتیں ہیں، روج کا قصہ ہے......"

"اے سن تو۔" لڈو نے سرزنش کی۔ "سب کی نجر بچا کر میں بھی گیا پیچھے۔ اور بئی جب اوپر پہنچا تو دیکھا کہ سیڑھیوں کا دروجہ بند ہے۔ بس بئی یہ دیکھ کر میری پھونک نکل گئی۔"

باج ہنسا۔ "سالے تیری پھونک تو اچھی طرح نکلنی چاہیے پھول کے گبارہ ہو رہا ہے۔"

لڈو نے سُنی ان سنی کرتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "پہلے تو میں سمجھا کہ دروجے کے پاس ہی کھڑے ہوں گے، مگر کوئی آواج سنائی نہیں دی۔ دراڑ میں سے جھانکا تو چھت پر بھی کوئی صورت نہیں دکھائی دی۔ پھر میں نے سوچا کہ جرور برساتی کے اندر بیٹھے ہوں گے۔"

"بڑی جسوسی دکھائی تو نے۔"

لڈو نے بیڑی کا کش لیا۔ "میں نے نیچے اوپر سے ہاتھ ڈال کر چٹکنی سرکا دی۔ یہ دیکھو میری بانہہ پر خون جم گیا ہے......"

"آگے بول۔"

"چھت پر سے ہوتا ہوا میں برساتی کی طرف بڑھا۔ اینٹوں کی جالی میں سے دیکھا کہ وہ دونوں

اندر چارپائی پر کچھ بیٹھے اور کچھ لیٹے ہیں۔"

ایک کاریگر بولا۔ "لیکن گھکی وہاں کیسے پہنچی۔"

لڈو کو اس کی حماقت پر بڑا رحم آیا۔ "جار! تم بھی بس...... چھت سے چھت ملی ہوئی جو ہے۔"

"ہئی تو بڑا اعکلبند (عقل مند) ہے۔ اب آگے چل۔"

"بس آگے کیا پوچھتے ہو، بڑے مجے میں تھے دونوں۔ گھکی کا منہ تو لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اتی پیاری لگ رہی تھی کہ جی چاہا کہ بس جا کر لپٹ ہی جاؤں۔"

"واہ رے بجورے۔" باج بولا۔ "اب تو یہ بات پکی ہو گئی کہ معاملہ چمی چاٹی تک ہی نہیں ہے...... اچھا پھر کیا ہوا؟"

"بڑے پریم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ چمن نے گھکی کے منہ کے آگے سے بال ہٹا کر کھوب بھینچ بھینچ کر......"

"ارے یہ سب تو ہوا ہی ہو گا۔ جیہہ تو بتا کہ باتیں بھی ہو رہی تھیں کچھ؟ جیہہ تو مالوم ہو کیا ارادے ہیں ان کے۔"

"پھر گھکی نے بڑے پیار سے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر پوچھا "چمن تم سچ مچ مجھی سے پیار کرتے ہو"...... چمن نے مور کی طرح گردن ہلائی اور بولا "سچ مچ۔"

"مجھے اکین نہیں آتا۔"

"جالم۔ جالم۔ اری ہم تو جان پھدا کرتے ہیں۔"

گھکی نے یہ سن کر سر نیچا کر لیا اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس پر چمن نے پھر اسے سمیٹ کر اپنی گود میں لے لیا اور کہنے لگا "کہو تو آسمان سے تارے توڑ لاؤں، کہو تو اپنی چھاتی چیر کر......" گھکی نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور پھر ایسے بولی جیسے سپنے میں بول رہی ہو۔ 'تم تارے مت توڑو۔ اپنی چھاتی مت چیرو...... مجھے...... مجھے اپنی داسی بنا لو۔"

"داسی! داسی؟ ارے تم رانی ہو رانی۔ داس تو ہم ہیں تمہارے۔"

"گھکی کچھ دیر چپ رہی۔ پھر بولی۔ ہم میرا امتبل نہیں سمجھے۔ مجھ سے سادی کر لو نا۔"

جیہہ سن کر چمن بدک گیا۔ جیسے گھکی کھوب صورت لڑکی نہیں، ناگن ہو اور وہ اسے بڑی

عجیب نجروں سے دیکھنے لگا۔ اس بجت گھکی کا سر جھکا ہوا تھا۔ سالی اپنے کھیال میں مگن بولی۔ ''میں گریب کی لڑکی ہوں۔ ہر کوئی مجھے بھوکی نجروں سے دیکھتا ہے۔ ہر کوئی مجھے کھانا چاہتا ہے...... گھر سے باہر پاؤں رکھنا مسکل ہو گیا ہے۔ پھر بھی میں نے اجت بچا کر رکھی۔ مگر تمہارے آگے میرا کوئی بس نہیں چلا۔ سو چو اگر مجھے کچھ ہو گیا تو؟''

''جیہہ کہہ کر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اس پر چمن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''اری واہ روتی کاہے کو ہے۔ بے پھکر رہو، تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ پریم میں ایسی باتیں دن رات ہوتی رہتی ہیں۔ تم بڑی وہمن ہو۔''

''مگر میں تمہاری ہو چکی ہوں۔ سدا کے لیے تمہاری۔ جیہہ کہہ کر اس نے اپنے پیلے رنگ کے کرتے سے آنکھیں پونچھیں لیکن آنسو نہیں تھمتے تھے۔ ہچکیاں بھرتی ہوئی بولی۔ ''چمن! میں عمر بھر تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیوں گی۔ تمہاری نوکر رہوں گی۔ تمہارے اشارے پر ناچوں گی۔ لالہ کو میری بڑی پھکر لگی ہے۔ ماں ہے نہیں۔ میں ہی سب میں بڑی ہوں۔ مجھے چھوٹی بہنوں کا بھی کھیال کرنا ہے۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ مجھے چھوڑنا نہیں۔''

''اے ہے ہے۔ تمہیں کون چھوڑتا ہے۔ پگلی ہوئی ہو کیا؟''

''اس پر گھکی نے بھیگی آنکھوں سے چمن کی طرف دیکھا اور بولی ''نہیں تم وادا کرو کہ مجھ سے سادی کر لو گے ...... میں بڑی منہ پھٹ ہوں۔ بے سرمی ما پھ کرو۔ مجھے اپنی بنالو۔ میں خوب پڑھ لکھ لوں گی اور جیسا تم کہو گے ویسا ہی کروں گی۔''

''جیہہ کہتے کہتے گھکی کا سر جھک گیا اور اس نے مدھم آواج میں پوچھا۔ ''کہو مجھی سے سادی کرو گے؟'' اور جب اس نے پھر چمن کی طرپھ دیکھنے کو سر اٹھایا تو چمن نے جھٹ سے اس کا سر دبا کر چھاتی سے لگا لیا۔ ''ہاں ہاں بھئی۔ تجھی سے سادی رچاؤں گا۔ اری تم میں کمی کس بات کی ہے۔ تم سندر ہو۔ ہجاروں میں ایک ہو...... لو اب چلیں تم بھی گھر کو جاؤ۔ نہیں تو نیچے والے سک کریں گے......''

''جیہہ سن کر میں جھٹ بھاگا وہاں سے۔''

(۵)

دوپہر کے وقت گرمی کی وہ شدت ہوتی تھی کہ کیا کارخانے اور کیا پریس کے کاریگر سبھی کام چھوڑ کر الگ بیٹھ جاتے۔ دن کا یہ حصہ سب سے زیادہ دلچسپ ہوتا تھا۔ فرصت کا سماں ہوتا تھا۔ حویلی جی بھر کر کشادہ تھی۔ چھوٹے بڑے متعدد کمرے ان میں اونچی اونچی الماریاں، کرسیاں، میزیں، پلنگ، صندوق...... غرض آنکھ مچولی کھیلنے کا پورا سامان میسر تھا۔

باج سنگھ تنور سے روٹی کھا کر لوٹا تو سیدھا حویلی کے اندر داخل ہو گیا۔ بڑے سردار جی کے سوا حسب معمول سبھی لوگ موجود تھے لیکن بڑی سردارنی سب سے الگ تھلگ پہلے بڑے کمرے میں براجمان تھیں۔ دوسرے کمرے سے ہنسی ٹھٹھول اور خوش گپیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

آج تنور پر روٹی کھانے کا باج کو کچھ مزا نہیں آیا تھا۔ دال میں کنکر، راشن کے آٹے میں ریت۔ تنور والوں کی ایسی تیسی کر کے پیٹ بھرے بغیر ہی وہ لوٹ آیا تھا۔ جب وہ حویلی میں داخل ہوا تو قدرتی طور پر سب سے پہلے اس کی نگاہ سردارنی پر پڑی۔ تعجب! آج وہ پان چبا رہی تھی۔ چھوٹی سردارنی تو خیر ہر کھانے کے بعد ایک عدد پان کلّے میں دبا لیتیں۔ نہ جانے کہاں سے لت لگی تھی انھیں۔ بڑی سردارنی کو پان چباتے ہوئے اس نے پہلی بار ہی دیکھا تھا۔ ان کی باچھوں اور ہونٹوں پر گہرے سرخ رنگ کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ نظریں چار ہوتے ہی بڑی سردارنی اس قدر بے دریغ انداز میں مسکرائیں کہ ایک بار تو باج بدک گیا لیکن پھر سنبھل کر وہیں اینٹوں کے فرش پر بیٹھ گیا اور اپنے ٹخنوں اور پنڈلیوں پر سے لکڑی کا برادہ جھاڑنے لگا۔

بڑی سردارنی نے اس کی جانب چوکی دھکیلتے ہوئے کہا۔ "ہائے ہائے! جمین پر کاہے بیٹھتے ہو چوکی پر بیٹھو۔"

"نہیں بڑی سردارنی! اینٹیں ٹھنڈی لگ رہی ہیں، مجا آ رہا ہے۔ اچھا کریں ہیں آپ جو دوپہر کو پھرش پر پانی پھکرا دے ہیں۔ سچ بڑی سردارنی بڑی دور کی سوجھے ہے آپ کو...... سچ۔"

یہ سن کر سردارنی نے چاہا کہ مارے خوشی کے پھولی نہ سمائے لیکن اب اور پھولنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ چنانچہ اس نے پہلے تو کمال انکسار سے سر جھکا دیا۔ پھر قدرے بھونڈے مستانہ پن سے

نظریں اٹھائیں۔

باج کو کوئی بات سوجھ نہیں رہی تھی۔ اس لیے اس نے پگڑی کے اندر دو انگلیاں داخل کر کے سر کھجانا شروع کر دیا۔ سردارنی محققانہ انداز میں بولی:

"روٹی کھا کر آ رہے ہو؟"

"جھر مار کر کے آ رہے ہیں۔"

باج کو برہم پا کر سردارنی بڑے مبالغے کے ساتھ پریشان ہوئیں۔ "آ کھر ماجرا کیا ہے؟"

باج نے ماجرا سنایا اور نتیجہ یہ بر آمد کیا کہ "روٹی! ہائے روٹی! تو بڑی سردارنی آپ کی ہوتی ہے۔ مکھن سسرا روٹی کی نس نس میں رچ جاتا ہے۔ نوالہ منہ میں رکتا ہی نہیں۔ بتاشے کی طرح گھلا اور چل اندر۔"

بڑی سردارنی کو تعریف و توصیف کے یہ فقرے ہضم کرنے کے لیے خاصا پرانا یام Deepbreathing کرنا پڑا۔ جب دم میں دم آیا تو ایک خاص سر تال میں بولیں:

"کبھی ہمارے یہاں کھاتے بھی ہو۔"

"کبھی کھلاتی بھی ہیں آپ۔" چالاک! باج نے اسی سر تال میں برجستہ جواب دیا۔

اس پر جلال میں آ کر جو بڑی سردارنی اٹھیں تو باج کو یوں محسوس ہوا جیسے زمین سے آسمان تک اودی گھٹا چھا گئی ہو۔

روٹی کھاتے کھاتے باج نے پوچھا۔ "کیوں جی! آج بڑے سردار جی بیٹھک میں کس سے بات چیت کر رہے ہیں؟"

سردارنی نے جھالر دار پنکھا جھلتے ہوئے جواب دیا۔ "معلوم نہیں۔"

گھر میں ایک ہی ٹیبل فین تھا بجلی کا، اور وہ جدھر بڑے سردار جی جاتے ان کا پیچھا کرتا۔

باج نے نمک حلال کر ڈالنے کے خیال سے کہا۔ کیوں مجاخ کرتی ہیں سردارنی! بھلا یہ کبھی ہو سکتا ہے کہ ادھر بات چیت ہو رہی ہو اور آپ کو کھبر نہ ہو۔"

سردارنی نے بڑے کی طرح منہ کھولا لیکن دفعتاً اس کا دہانہ تنگ کر کے بولیں۔ "جسوس چھوڑ

رکھے ہیں ابھی مالوم ہو جائے گا سب کچھ۔"

اسی اثناء میں چھوٹی سردارنی بغل والے کمرے سے نکل کر ان کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ بتیسی نکلی پڑتی تھی۔ سنہری کیلیں چمک رہی تھیں۔ حسبِ معمول لڑکیاں ان کے ساتھ تھیں۔ جب لڑکیاں ساتھ تھیں تو قدرتی طور پر لڑکے بھی ساتھ تھے......

بڑی سردارنی کو چھوٹی سردارنی کے یہ لچھن پسند نہیں تھے اور پھر اس موقعہ پر؟ چنانچہ اس نے چپکے سے ناک بھوں چڑھا کر ہاتھ کو ذرا Slow motion سے گھما کر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اسے یقین تھا کہ باج بھی اس معاملے میں اس سے متفق ہے لیکن باج نے بڑی دیدہ دلیری سے اپنے بے ڈول دانتوں کی نمائش کی اور ترمال اپنے سامنے پا کر اس نے دل ہی دل میں نعرہ لگایا۔ "جو بولے سو نہال......"

چھوٹی سردارنی معہ کم سن پریوں کے اور جنات کے دھوم دھڑاک سے آگے بڑھیں۔ ان کے پہلو بہ پہلوان کا ہاتھ جھلاتی گھکی چہکتی، پھدکتی چلی آ رہی تھی۔ گھکی محض بانکی نہیں تھی بلکہ اسے اپنے بانکپن کا احساس بھی تھا۔ ہر نگاہ جو اس کے چہرے یا جسم پر پڑتی تھی۔ اس کا ردِ عمل اس کی ابروؤں کی لرزش، ہونٹوں کی پھڑکن یا جسم کی کسی نہ کسی حرکت سے ظاہر ہو جاتا۔

اس کے بعد نکی...... گھکی نوک پلک اور چہرے کے خدوخال کے لحاظ سے غضب تھی تو نکی بدن کے اعضا کی متناسب بناوٹ، تناؤ اور تڑپ کے اعتبار سے قیامت تھی۔ اس کی نظریں بڑی بہن کی طرح دور تک نہیں پہنچتی تھیں۔ وہ اس انسان کے مانند دکھائی دیتی تھی جو ویرانے میں بھٹکتا بھٹکتا دفعتاً میلے میں آ نکلے......

نکی کی چندری کا دامن اندھی سانولی کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا چہرہ اوپر کو اٹھا رہتا۔ وہ بڑی دونوں بہنوں سے کم گوری تھی۔ خدوخال گوارا لیکن چہرہ بحیثیت مجموعی پرکشش تھا۔ اسے اس بات کا مطلقاً احساس نہیں تھا کہ مزلی والا اس کے بدن میں عمر کے ساتھ ساتھ کیا کیا تبدیلیاں کر رہا ہے۔ کیونکہ اس معمے کا احساس تو لڑکی کو آنکھیں چار ہونے پر ہی ہو سکتا ہے۔ وہاں ایک بھی دیکھنے والی آنکھ نہیں تھی۔ اس لیے آنکھیں چار ہونے کا دچار ہی پیدا نہیں ہوتا تھا......

"بلے بلے۔" باج کو اپنے کان میں آواز سنائی دی۔ دیکھا کہ بونگا بھی اسے کارخانے میں نہ پاکر وہاں آن پہنچا تھا اور پھر رال ٹپکاتے ہوئے بولا۔ "جار! گھکی کی کمر تو دیکھو۔ کیسی پتلی۔ کیسی لچکدار ہے۔ آنکھ نہیں ٹکتی اس پر......"

"اوے میں جٹی پنجاب دی،
میرا ریشم برگا لک......"

معاً باج نے بونگے کو کہنی کا ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔ "دیکھ اوے جل ککڑ!!"

جل ککڑ پریس میں لیبل پرنٹ کیا کرتا تھا۔ اس کی عمر چونتیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ دو بچے بھی تھے۔ تعجب! وہ بھی سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہو گیا تھا۔ یہ راز باج کی سمجھ میں اب تک نہ آیا تھا۔ لیکن آج اس نے دیکھا کہ کیسے جل ککڑ نے دیدہ دانستہ نکی کو دھکا دیا اور کیسے نکی نے معشوقانہ ادا کے ساتھ اس کی اس حرکت کو برداشت کیا لیکن آخر جل ککڑ میں رکھا ہی کیا تھا۔ اس کی مضحکہ خیز صورت کی وجہ سے ہی تو یاروں نے اس کا نام جل ککڑ تجویز کیا تھا...... مگر عورت کے دل کو کون پا سکتا ہے......

بونگے نے کہا۔ "جار یہ تو دور مار توپ نکلا۔ کیسا مسکین بنتا تھا۔"

آج کل جل ککڑ زیادہ تر رنگین بشرٹ پہنے رہتا تھا۔ جس کے کپڑے پر چینی طرز کے اژدہا ناچتے دکھائی دیتے تھے۔

سردار جی کے لڑکے بھی "چل کبڈی تارا۔ سلطان بیگ مارا۔" کہتے ہوئے ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے اور ان کے پیچھے وہ نوجوان تھا۔ جو وہاں کوئی امتحان دینے کے لیے نیا نیا آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی باج نے پوچھا۔ "اوے ماں دیا مترا! ایہہ کون ہے۔"

"اوئے جیہہ بھی اپنا منڈا ہے۔ نواں داخل ہویا اے۔ عسک دے مدرسے دے بچ۔"

"اچھا اچھا...... ایہہ تاں پرسوں ہی آیا ہے۔"

"آہو جی لونڈوں کی باتیں چھوڑو۔ اب ناریوں کی باتیں کرو"

پریوں کے اس قافلے نے زمین پر ڈیرے ڈال دیے اور اس کی خوش نوائیوں میں بڑی سرداری

اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگی۔

"اوئے پرجی چمن کہاں ہے؟"

ایک چھوٹا لڑکا (غالباً بڑی سردارنی کا جاسوس) جو بیٹھک سے اسی وقت وہاں آیا تھا بولا۔ "چمن ادھر بیٹھک میں بیٹھا ہے۔"

باج کو حیرت ہو رہی تھی، یہ کیا؟ گل اِدھر اور بلبل ادھر؟ پھر اسی جذبے کے تحت اس نے گھکی کی جانب دیکھا۔ وہ نظروں ہی نظروں میں سب کچھ سمجھ گئی۔ اس کے ابرو لرزے، پلکیں جھپکیں، کمر لچکی اور پھر وہ ساکت ہو گئی۔ باج نے دل پھینک تیور بنا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھایا کہ لو ہم تفتیش کرتے ہیں اور حسن کے چور کو حسن کے حضور میں حاضر کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نے بلند آواز میں پوچھا۔ "لیکن ہئی وہ وہاں کیا کر رہا ہے؟"

"اُدھر ایک جرنیل صاحب بیٹھے ہیں۔"

باج نے سوچا کوئی فوجی افسر ہو گا۔ یہ لونڈے ہر ایسے افسر کو ایک دم جرنیل بنا دیتے ہیں۔ پھر بولا۔ "پر بائی! چمن کا وہاں کیا کام؟"

"چمن کے بابو جی بھی بیٹھے ہیں۔"

اس سے مراد یہ کہ چمن کو باپ کی وجہ سے مجبوراً وہاں بیٹھنا پڑ رہا ہے۔ "اچھا تو بچو چمن کو انھوں نے وہاں کس لیے پھانس رکھا ہے۔" باج نے جرح کی۔

"وہ پھوج میں بھرتی ہو رہا ہے۔" لڑکے نے ٹیں سے جواب دیا۔

اب باج نے ایک نظر بڑی سردارنی پر ڈالنا ضروری سمجھا اور پھر منہ ٹیڑھا کر کے اس کے ایک کونے میں سے سانپ کی پھنکار کی سی آواز نکالتے ہوئے بولا۔ "اے جی آپ کا جسوس تو بڑا ہسیار نکلا۔"

داد پا کر سردارنی ہاتھی کی طرح جھومنے لگیں اور عرصہ تک جھومتی رہیں۔

جب جسوس لونڈے کو محسوس ہوا کہ وہ ایسی باتیں کہہ رہا ہے جن سے سب کو بڑی دلچسپی محسوس ہو رہی ہے تو اس نے مزید معلومات بہم پہنچانے کے لیے کہا۔ "چمن ماہاؤ جا رہا ہے۔"

"اوئے ماہاؤ کون جگہ کا نام ہے۔ وہاں تیری ماؤں (ماں) رہتی ہے کیا؟" بونگے نے دبی زبان میں

کہا تا کہ صرف باج سن سکے۔

سردارے نے کہا۔ "اوئے ماہاؤ نہیں مہو کہو مہو۔"

"کیا چمن مہو جا رہا ہے؟" سردار جی کے چھوٹے لڑکے نے سوال کیا اور ساتھ ہی پہلے تو مصنوعی تعجب کے مارے دونوں ٹانگیں خوب پھیلا کر اور پاؤں فرش پر جما کر بالکل بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اور پھر سمٹ کر جو کودا تو کمرے سے باہر اور بیٹھک کے اندر:

"اوئے چمن ہم کو چھوڑ کر مہو جا رہا ہے اور ہم کو خبر تک نہیں دی۔"

لفظ "ہم" سے اس کا اشارہ گھکی کی طرف تھا۔ یہ الفاظ اس نے کھڑے ہو کر کہے۔ اس وقت اس کی میلی کچھ کا اور بھی میلا ازار بند اس کے دونوں گھٹنوں کے بیچ میں جھول رہا تھا اور اس نے پر معنی انداز میں کنکھیوں سے گھکی کی جانب دیکھا۔ بھلا گھکی کو اس کی بات کا مطلب پا لینے میں کیا مشکل پیش آ سکتی تھی۔ اس کے دل میں ایسی گدگدی پیدا ہوئی کہ وہ اٹھ کر رقصاں و شاداں چھوٹی سردارنی کے ایک بازو سے اٹھ کر اس کے دوسرے پہلو میں جا بیٹھی اور بے حد سریلی آواز میں بولی۔ "ہمیں پہلے ہی سے معلوم تھا۔"

گھکی نے یہ بات زیادہ زور سے نہیں کہی لیکن یہ اتنی ضرور تھی کہ باج اُسے آسانی سے سن سکے۔

اس پر باج ٹھنڈا ہو کر ٹھنڈے فرش پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے غبارے میں سے دفعتاً ساری ہوا نکل جائے اور پھر اس نے ابرو ہلا کر اور مونچھیں پھڑکا کر بونگے کے کان میں کہا:

"جا را سچ مچ یہ لونڈیا بڑی چلتی پُر جی ہے۔"

(۲)

ایت وار!

آج سردار جی کے دونوں لڑکے دس بجے کا انگریزی شو دیکھنے جا رہے تھے۔ بڑے زور شور کے ساتھ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ نہ جانے کب کی پرانی نکلائیاں بر آمد کی گئیں۔ ایک مسہری لگانے کے بانس کے سرے پر بندھی تھی اور دوسری بڑے ٹرنک کے پیچھے سے گیند کی طرح گول مول کی ہوئی نکلی۔

چونکہ اس وقت چھوٹی سردارنی غسل کر رہی تھیں اس لیے ان کی چیلیاں بے جان سی ہو کر اِدھر اُدھر لٹک رہی تھیں۔ نئی بڑی سردارنی کے ساتھ باورچی خانے کے اندر بیٹھی تھی۔ سانولی پرے نل کے پاس بیٹھی ایڑیوں کو رگڑ رگڑ کر دھو رہی تھی۔ دستی ہلانے والا نیا نوجوان تھا۔ گھکی حویلی کے بڑے دروازے کے آگے بنی ہوئی چند پختہ سیڑھیوں کے بیچ والے حصے پر بیٹھی تھی اس کی دونوں کہنیاں اس کے گھٹنوں پر ٹکی تھیں اور دونوں ہتھیلیوں کے بیچ میں اس کے چہرہ پھنسا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اداس تھیں۔ چمن کو گئے پچیس دن گزر گئے تھے لیکن گھکی کو اس کا ایک خط تک نہ آیا تھا۔ حالانکہ دوسروں کو اس کی چٹھیاں آچکی تھیں......

اتوار کی وجہ سے چھٹی تھی، اس لیے کاریگروں کی گہما گہمی نہیں تھی۔ البتہ باج اور بونگا موجود تھے کیونکہ وہ مستقل طور سے وہیں پر مقیم تھے۔

دیواروں کی سفیدی کرنے کے کام میں آنے والے پانچ فٹ اونچے اسٹول پر پاؤں کے بل بیٹھا باج داتن چبا رہا تھا۔ اسٹول کے ساتھ سٹ کر زمین پر بیٹھا ہوا بونگا آئینے میں دیکھ دیکھ کر چمٹی سے ناک کے بال نوچ نوچ کر پھینک رہا تھا۔

دور بیٹھک کی طرف سے ایک بڑے سنکھ کی سی آواز میں سردار جی پاٹھ کر رہے تھے۔ سردار جی کا پاٹھ اور باج کی داتن دونوں مشہور چیزیں تھیں۔ ادھر سردار جی مسلسل کئی کئی گھنٹے پاٹھ کرنے میں جٹے رہتے۔ ادھر اتوار کو فرصت پاکر باج علی الصبح ہی منہ میں یہ لمبی داتن اڑس کر بیٹھ جاتا۔ پہلے اسے چباتا پھر دانتوں پر گھساتا۔ پھر چباتا اور دانتوں پر گھساتا۔ یہاں تک کہ داتن ختم ہو جاتی۔

بونگے نے اپنے کام سے فرصت پاکر اطمینان سے ٹانگیں زمین پر پھیلا دیں۔

بلند نشین باج نے اپنے تیزی سے ہلتے ہوئے منہ کو لحہ بھر کے لیے روکا اور بونگے سے مخاطب ہو کر دبی زبان میں پھنکار کر بولا۔ "بونگیا! آج گھکی کچھ اداس ہے۔ شاید چھوٹی سردارنی کا انتجار ہو رہا ہے۔"

اس طرح بولنے سے باج کی مونچھوں میں پھنسے ہوئے تھوک کے قطرے اڑ کر بونگے کے چیچک مارے چہرے پر پڑے اور اس نے بھڑک کر اسٹول کو ذرا سا ہلا دیا اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں لال

چنگاری بنا کر کہا۔ "اوئے ابھی ہلادوں تو راج سنگھاسن سے سر کے بل نیچے گر پڑے، ہم پر تھوکتا ہے؟"

اسٹول کے قدرے ہل جانے پر باج نے گدھ کے مانند بازو پھڑ پھڑائے اور اس کی طرف دھیان دیے بغیر بولا۔ "کیوں یہی بات ہے نا! ملکاں (چھوٹی سردارنی) کا انتجار ہو رہا ہے۔"

"اوئے نئیں۔" بونگے نے نتھنے پھلا کر عالمانہ انداز میں جواب دیا۔ "ہیر کو رانجھے کا۔ سسی کو پنوں کا۔ گوپی کو کنھیا کا انتجار ہے، سمجھے؟"

"سمجھا۔" باج سے بھلا کیا بات چھپی تھی۔ اس نے بونگے کو محض گرمانے اور پھر اس کی حرکت بازی کا لطف اٹھانے کے لیے انجان کا ثبوت پیش کیا تھا۔

اب بونگے نے احتیاطاً اِدھر اُدھر دیکھا اور کسی کو قریب نہ پاکر ہلکا سا نعرہ بلند کیا۔ "ہائے۔" روئے سخن کھکی کی جانب۔

"کیا ہے؟" باج نے پوچھا اور سمجھ گیا کہ بونگے کو خر مستی سوجھ رہی ہے۔

"درد۔" بونگے نے جواب دیا۔

"کہاں؟"

"جیبہہ تو میں مر جاواں تاں بھی نہ دساں۔" بونگے نے خاص زنانہ آواز میں جواب دیا اور پھر قدرے سکوت کے بعد گانے لگا۔

"چھوڑ گئے بالم!

اکیلی مجھ نوں چھوڑ گئے۔"

فضا بونگے کی ٹرٹراتی آواز سے گونج اٹھی۔

اب دونوں چھوٹے سردار تیار ہو کر اندر سے نکلے تو اس شان سے کہ پہلے تو بڑے بھائی نے اندر سے چھلانگ لگائی تو کھکی کے اوپر سے کود کر صحن میں۔ وہ سمجھنے بھی نہ پائی تھی کہ دوسرا بھائی صاف کود گیا اوپر سے۔ کھکی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ چمک کر بولی۔ "ہمیں نہیں اچھا لگتا ایسا مجاخ، اگر ہماری گردن ٹوٹ جاتی تو؟"

اس پر چھوٹے بھائی نے پنجاب کے مشہور لوک ناچ بھنگڑا کے انداز میں چند چک پھیریاں لیں اور گلے کی گہرائیوں میں سے نہایت گھگیائی ہوئی آواز نکال کر گیت کا بول دُہرایا:

"چھوڑ گئے بالم!"

ادھر بونگا بھی بس تیار ہی بیٹھا تھا۔ فی الفور چھاتی پر دوہتڑ مار کر بین سر میں گا اُٹھا:

"اکیلی مجھ کو چھوڑ گئے۔"

اس پر باج نے جو قہقہے لگائے تو وہ سیدھے آسمان کے اس پار پہنچے۔ بڑی سردارنی معہ نکی کے باورچی خانے کے دروازے میں آن کھڑی ہوئیں۔ چھوٹی سردارنی بھی غسل سے فارغ ہو کر نکل آئیں۔ سانولی سمجھی ضرور کوئی مزے دار بات ہو رہی ہے۔ چنانچہ وہ نل کے پاس بیٹھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

چلتے چلتے چھوٹا سردار وہی بول دہراتا گیا اور بونگا بھی گرمی کھا کر سینے پر دوہتڑ مار مار جواب دیتا گیا۔ صحن میں قیامت کا شور سن کر بڑے سردار جی اندر سے ہی کڑکے ...... تو چھوٹے سردار جی بگٹٹ بھاگے۔ باج اسٹول سے کودا اور بونگے سمیت کارخانے میں جا گھسا۔ بڑی سردارنی اور نکی نے اندر سے باورچی خانے کا دروازہ بھیڑ دیا۔ گھکی اچھلی اور چھوٹی سردارنی نے اسے بغل میں دابا اور ایک بار پھر غسل خانے کے اندر......

(۷)

دیوی داس کے مکان اور دُکان کے آگے سڑک کے آرپار کاغذ کی رنگ برنگی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ باجے بج رہے تھے۔ گھر کے اندر کسی تاریک گوشے میں چند عورتیں بطخوں کی قیں قیں کی سی آواز میں ٹوٹے پھوٹے گیت گا رہی تھیں۔

گھکی کی شادی ہو رہی تھی!

چمن کے ساتھ؟ نہیں۔

بارات آنے والی تھی۔ محلے کے لونڈے دوڑ دوڑ کر دولھا کی پیشوائی کو جاتے لیکن بڑے بوڑھوں کی زبانی یہ سن کر کہ ابھی بارات نہیں آئی تو مایوس ہو جاتے اور چپ چاپ چڑوے ریوڑیاں چبانے لگتے۔

بیٹھک میں بڑے سردار جی اور ان کے چند معزز اور بزرگ ساتھی کاٹھ کے الوؤں کی طرح ساکت بیٹھے تھے۔ کبھی ایک آدھ بات ہو جاتی تو سب اثبات میں سر ہلا ہلا کر اظہارِ اطمینان کرتے۔

پریس کے کاریگر سڑک کی جانب برآمدے میں کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ادھر کارخانے کے کاریگر بغلیں بجاتے چھت پر چڑھ گئے۔ وہاں سے دیوی داس کی نیچی چھت صاف دکھائی دیتی تھی۔ اس کی چھت پر دس پندرہ چارپائیاں بچھی تھیں۔ کیونکہ زیادہ براتیوں کے آنے کی اُمید نہیں تھی۔ چند بچے اور عورتیں بے جان رنگوں کے کپڑے پہنے سست قدموں سے اِدھر اُدھر کے کام کرتی پھرتی تھیں۔ قریب والے پیپل کے پیڑ کا تاریک سایہ چھت پر پھیل رہا تھا...... اور باجے الگ کراہ رہے تھے۔

چھت والے کاریگروں میں سے ایک سر ہلا کر بولا۔ "تت تت عورت کی بے وفائی کے بارے میں سنا تھا۔ لیکن آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔"

بونگے نے نتھنے پھلا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ کہنے کے لیے منہ پھلایا...... اور پھر نتھنے اور منہ دونوں سکوڑ کر رُخ دوسری جانب پھیر لیا۔

کاریگر کو تعجب ہوا۔ اس نے باج کو کندھا مار کر کہا۔ "کہو استاد! آج بونگے کو کیا ہو گیا ہے۔"

باج نے پہلے پھولے ماری آنکھ دکھا کر بے رخی برتی۔ لیکن پھر چشم بینا سے شرارے برسا کر کہا۔ "عورت کی بیوفائی نہیں، مرد کی بیوفائی کہو۔"

"یعنی؟"

"یعنی جیسے کہ چمن کو یہاں سے گئے تین مہینے گزر چکے ہیں اس نے ایک سطر تک نہیں لکھی گھکی کو......"

"اور گھکی نے؟"

"اس نے اپنے ہاتھ سے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں اسے کئی چٹھیاں لکھیں لیکن ایک کا بھی جواب نہیں آیا۔"

اب بونگے نے بھی بولنا شروع کر دیا۔ "چمن نے اپنے چار دوستوں کو لکھا کہ کسی نہ کسی طرح گھکی کو چٹھی لکھنے سے روکا جائے۔ ہر چٹھی اس کی اس بات سے کہ اگر میرے پر ہوتے تو میں اڑ کر

آپ کے پاس آجاتی۔ ”تنگ آگیا ہوں۔“

”اُدھر کہیں چمن کے پتا جی وہاں جانکلے۔“ باج نے بات آگے بڑھائی۔ ”ان کی موجودگی میں کہیں کوئی کھت آیا تو انھوں نے پڑھ لیا۔ پہلے بیٹے کے کان مروڑے اور پھر یہاں آکر بڑے سردار جی کو بتایا۔ سردار جی نے دیوی داس کو بلایا اور کہا۔ ”اوئے لونڈیا کی سادی کردے جھٹ پٹ، پندرہ دن کے اندر۔ نہیں تو دُکان کھالی کردے اور اٹھا بوریا بستر مکان سے بھی۔“ ایسے مسکل سمیں میں بھلا دیوی داس کہاں جاتا۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ پر جی گریب کی لڑکی کی سادی بھلا اتی جلدی کہاں ہوسکتی ہے؟ چمن کے باپ نے کہا۔ ”آکھر تمہاری لونڈیا کو ایسے کھت لکھنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ جمین کی کھاک سر کو چڑھے، بڑے سردار جی نے ڈانٹ پلائی۔ اب میں نے کہہ دیا۔ جیادہ ریائت نہیں نا ہوسکتی۔ پندرہ دن کے اندر اندر سادی کر ڈال کہیں، نہیں تو مکان اور دُکان دونوں سے کھارج۔“

گفتگو اسی منزل پر پہنچی تھی کہ بڑی سردارنی جی بھی اوپر آنکلیں اور حسبِ عادت باج کے قریب کھڑی ہوگئیں۔ اپنی آمد پر سب کو چپ دیکھ کر بولیں، ”بارات نہ جانے کب آئے گی؟“

اب کی بات ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ لوگ بھاگ چلا اٹھے۔ ”بارات آگئی۔ بارات آگئی!“

شہنائیاں اور زور سے کائیں کرنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد سردار جی کا چھوٹا لڑکا دوڑا دوڑا آیا۔ ”اوئے لٹیا ڈوب گئی۔ دھت تیری کی۔“

”کیوں کھیریت؟ دولھا دیکھا؟ کیسا ہے؟“ سب نے ایک زبان ہو کر پوچھا۔

لڑکے نے بڑے واہیات انداز سے بازو ادھر اُدھر پھینک کر جواب دیا۔ ”دھت تیری کی...... چڑی مار...... بالکل چڑی مار دکھائی دیتا ہے۔“

(۸)

اگست ۴۷ء کے فسادات زور شور سے شروع ہوئے تو حویلی کے مکینوں اور کاریگروں کے وقت کا کچھ حصہ قتل و غارت، ہندوؤں اور سکھوں پر ڈھائے گئے مظالم اور ان کے خواتین کی

آبروریزی جیسے موضوعات پر صرف ہونے لگا۔ لیکن وہاں کی روز مرہ کی زندگی اور چہل پہل میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ سوائے اس کے کہ گھکی کی شادی کو تین ساڑھے تین ماہ گزر چکے تھے۔ ان تین مہینوں کے دوران میں چمن دو چار دن کے لیے جالندھر آیا۔ انھوں نے الگ مکان کا انتظام کر لیا تھا۔ پھر بھی چمن سردار جی کے گھر چوری چھپے آتا رہا۔ وہ گھکی سے بچ کر رہتا تھا۔ خود گھکی نے بھی بطورِ خاص اس امر کی احتیاط برتی کہ اس کی چمن سے مڈبھیڑ نہ ہو۔

چمن نے سردار جی کے لڑکوں کو بتایا کہ مہو میں اس کی زندگی بڑے مزے اور چین میں کٹ رہی تھی۔ ارد گرد معشوقوں کی بھی کچھ کمی نہیں تھی۔ اس نے ایک نیا آرٹ سیکھا تھا۔ جس کا مظاہرہ اس نے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بنا بنا کر کیا۔ اگر گھکی کی کوئی بات چلتی تو کہتا۔ ”ہندوستانی لڑکیاں بھی بس ”عجیب“ ہوتی ہیں۔ ذرا ہنس کر بات کر لو تو گلے کا ہار ہو جاتی ہیں۔ فُلش Foolish چائلڈش Childish!!“

بالآخر وہ گھکی سے ایک بات کیے بغیر ہی واپس چلا گیا۔

بظاہر گھکی پر اس کا کوئی خاص ردِ عمل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ اب بھی چھوٹی سردارنی کے ساتھ اٹھتی بیٹھی، ہنستی بولتی، لیکن اس کے دل کو گھن لگ چکا تھا۔ اس کا جسم نرم اور کمزور تو پہلے ہی تھا۔ لیکن اب تو بالکل ہی ہڈیوں کا ڈھانچ سا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ نہایت نازک اور شگفتہ پھول کے مانند تھی اسے اگر مناسب حالات میسر آ جاتے تو یقیناً اس کی مہک دور دور تک پھیلتی۔ لیکن اب وہ درد دبا کر خاموش ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے سے ایسا سنجیدہ وقار ٹپکتا تھا کہ اب کسی کو اس سے چہل بازی کرنے کی جرأت تک نہیں ہوتی تھی۔ اُسے کھانسی آنے لگی تھی۔ جب کھانسی چھوٹتی تو وہ اپنے کمزور سینہ کو چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے تھام کر کھانستے کھانستے بے حال ہو جاتی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ بعض دیکھنے والوں کو اس کی حالت پر ترس آنے لگتا۔ لیکن وہ مسکراتی ہوئی اپنے خوش وضع سر کو پیچھے کی جانب پھینک کر اسے دائیں بائیں دو چار جھٹکے دیتی اور پھر بات چیت میں مصروف ہو جاتی۔

نکی، البتہ اب اُڑ نکلی تھی۔ اسے بات بے بات پر اس قدر ہنسی چھوٹتی تھی کہ بس لوٹ پوٹ

ہو جاتی۔ پہلے گھکی ان محفلوں کی جان تھی تو اب نکی! گھکی کا رویہ پہلے بھی پر وقار تھا۔ اب سینہ پر زخم کھا کر وہ اور سنجیدہ ہو گئی تھی۔ مگر نکی شروع ہی سے شوخ تھی۔ اور اب میدان صاف پا کر وہ تڑپتی ہوئی بجلی بن گئی تھی۔ چھیڑ چھاڑ کی اس میں بہت برداشت تھی۔ اس لیے وہ گھکی سے زیادہ مقبول تھی۔ خفا ہونا تو اسے آتا ہی نہیں تھا۔ سمٹنا، بننا، بچنا، جھوٹوں ہی ابرو پہ بل ڈالنا، پٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دینا، یہ سب درست، پھر بھی وہ خفا نہیں ہوتی تھی۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ اس کی چہک اور مہک میں فرق نہیں آتا تھا۔

اب نکتہ سنجوں کو یہ بھی کوئی راز کی بات نہ رہی تھی کہ نکی کا خاص منظورِ نظر پریس کا وہی آدمی تھا جسے سب جل ککڑ کہتے تھے لیکن سمجھ میں نہ آنے والی بات یہ تھی کہ آخر اس کے پاس کون سی ایسی گیدڑ سنگی تھی جس کی وجہ سے نکی سب کو چھوڑ چھاڑ کر اس کی بغل گرم کرتی تھی۔

ایک روز شام کے وقت ایک بہت بڑے زمین دوز چولھے پر لوہے کی کڑاہی جمائی گئی جسے دیکھ کر سب کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کیونکہ چند مہینوں کے وقفے کے بعد یہ وہ شام ہوتی تھی، جب بڑی سردارنی کڑاہی میں ریت گرم کر کے اس میں مکی، چنا اور چاول بھونتیں، گڑ ملا کر ان کے مرونڈے تیار کرتیں اور سب کو جی بھر کر کھلاتیں۔ چنانچہ جب کارخانے کے اندر تیشہ چلاتے ہوئے باج سنگھ کو بونگے نے خبر سنائی کہ آج صحن میں کڑاہی جمائی گئی ہے اور بڑی سردارنی کے کیا تیور ہیں تو اس سے نہ رہا گیا۔ وہ تیشہ ویشہ پھینک کر فوراً باہر نکلا اور دیکھا کہ بونگے نے جو زیادہ تر جھوٹ بولا کرتا تھا، اب کے جھوٹ نہیں کہا تھا۔

بڑی سردارنی نے جب باج کو دیکھا تو اس انداز سے مسکرائی کہ جیسے اسے پہلے ہی سے یقین تھا کہ باج سب کام چھوڑ چھاڑ کر فوراً باہر آئے گا۔ آج سردارنی نے جامنی رنگ کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ یوں تو اسے کوئی بھی رنگ نہیں پھبتا تھا لیکن جامنی رنگ تو بہت ہی بھونڈا لگ رہا تھا۔ اس رنگ کے تلے اس کے پلپلے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی جا رہی تھی۔ باج سے آنکھیں چار ہوتے ہی وہ بامعنی انداز سے ٹھمک کر باورچی خانے میں داخل ہو گئی۔

رفتہ رفتہ سب قسم کے دانے بھن چکے تو پھر نکی کی مدد سے بڑی سردارنی نے سوندھی سوندھی

بو والے دانوں کو گڑ میں ملا کر الگ الگ قسم کے مرونڈے تیار کیے۔

چرن منت کی خبر پریس میں پہنچا رہا تھا۔ کارخانے کے کاریگر چونکہ باورچی خانے کے زیادہ نزدیک تھے، اس لیے وہ کام میں من لگا ہی نہیں سکے۔ وہ اس بات کے منتظر تھے کب سردارنی اپنی لوچدار آواز میں انھیں کھانے کی دعوت دے اور کب وہ پل پڑیں میٹھے مرونڈوں پر۔

سب سے پہلے سردارنی نے گھکی کو آواز دی۔ اب اسے گھکی پر پیار سا آنے لگا تھا۔ گھکی دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے اور منہ بازوؤں میں چھپائے کھانس رہی تھی۔ کھانس چکی تو حسبِ عادت اس نے سر کو پیچھے کو جانب پھینک کر دائیں بائیں دو چار جھٹکے دیے اور پھر ہنسنے لگی...... اس کی ہنسی خوب فراخ ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے پر عجیب کیفیت طاری رہتی تھی۔ اب اس پر پہلے والے لطیف ردِ عمل نہیں ہوتے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ خود اپنے لیے ہنس رہی ہے...... اسی طرح کھل کھلا کر ہنستی ہوئی وہ آگے بڑھی اور اس نے دونوں ہاتھ ایسے پھیلائے جیسے اسے مندر یا گوردوارے سے پرشاد مل رہا ہو۔

بڑی سردارنی نے سب کو نام لے لے کر بلایا۔ "وے بونگیا، وے چرن، نی سانو لیے، نی پریمو......" باج اپنے محبوب اسٹول پر ٹنگا ہوا تھا۔

اسے نہیں بلایا گیا۔

نہیں، اسے نام لے کر نہیں بلایا گیا۔ بلکہ سب کی نظریں بچا کر سردارنی جی اسے ابروؤں، آنکھوں اور سر کے اشاروں سے بلاتی رہیں۔ گویا اس کے لیے مخصوص پیغامات بھیجے جا رہے تھے۔ باج بھی ایک کائیاں تھا۔ جی میں حیران بھی تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کسی روز سردارنی بغل گیر ہو جائے۔ کچھ دیر سردارنی کی حرکات سے محظوظ ہونے کے بعد وہ قلانچ بھر کر اسٹول سے اترا اور دوسری قلانچ میں وہ سردارنی کے قریب پہنچا۔ مرونڈے لیتے وقت اس نے سردارنی کی پسلیوں میں کہنی کا ایک ٹھوکا بھی دیا۔ کیونکہ...... اب اتنا حق تو ضرور تھا سردارنی کا اس پر۔

بونگا آج بہت لاڈ میں آیا ہوا تھا۔ باج کے پاس بیٹھنے کے بجائے وہ چھوٹی سردارنی کے قریب جا بیٹھا اور بندر کی طرح بڑے مبالغے کے ساتھ منہ آگے کو بڑھا کر اور چپ چپاچپ کی آوازیں نکالتا

ہوا مرنڈے چبانے لگا۔ اسی وقت نکی کو قریب سے خاص انداز میں اٹھتے اور ذرا غیر قدرتی انداز میں چلتے دیکھ کر بونگے نے چھوٹی سردارنی سے مخاطب ہوتے ہوئے بڑی بیباکی سے کہا:

''او جی! نکی کا پاؤں تو بھاری دکھائی دیتا ہے۔''

باج نے بھی یہ بات سن لی۔ اس نے غور سے دیکھا تو اسے بھی یقین سا ہونے لگا۔ اس نے سوچا، آخر بات کیا ہے۔ آج بونگا سچ ہی بولے جا رہا ہے۔

(۹)

رفتہ رفتہ نکی کا پاؤں اور زیادہ بھاری ہو گیا تو حویلی میں کچھ چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور پھر دفعتہً نکی غائب ہو گئی۔ پہلے تو یہ افواہ اڑی کہ وہ جل ککڑ کے ساتھ غائب ہوئی لیکن جل ککڑ حسبِ معمول کام پر آتا رہا۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ جس روز نکی غائب ہوئی تو اس کے گھر والوں نے پریشانی کا اظہار بالکل نہیں کیا۔ تیسرے دن گھکی نے دبی زبان سے اعتراف کیا کہ موسی گاؤں سے آئی تھی۔ وہ اسی کے ساتھ چلی گئی تھی۔ موسی کب آئی تھی؟ بس وہ آئی اور چلی گئی۔ لیکن نکی نے کبھی کہیں جانے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا...... ان سب سوالوں کا ٹال مٹول کے سوا کوئی جواب نہیں تھا...... اگر کوئی اور زیادہ کرید کر پوچھتا تو گھکی کو کھانسی چھڑ جاتی۔ وہ کھانستے کھانستے بے حال ہوتی۔ یہاں تک کہ بات آئی گئی ہو جاتی۔

ماہِ اکتوبر ختم ہونے کو تھا لیکن اگست سے جو فسادات شروع ہوئے تھے، ختم ہونے ہی میں نہ آتے تھے۔

حویلی کے طویل و عریض صحن کے اردگرد متعدد کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ بہت سے کاریگر شہر کے خطرناک حصوں سے نکل کر معہ بال بچوں کے عارضی طور پر وہاں مقیم تھے۔ چنانچہ رات کو کارخانے میں کافی رونق ہو جاتی۔ کھانے سے فارغ ہو کر کاریگر گئی رات تک آپس میں گپ شپ ہانکتے اور مغربی پنجاب میں جو مظالم ہندوؤں اور سکھوں پر ڈھائے جا رہے تھے۔ ان کی دل کھول کر

مذمت کرتے۔

ایسی ہی ایک رات تھی۔

کھانا کھانے کے بعد کاریگروں کا ایک گروہ کارخانے میں گھسا گپ شپ میں مصروف تھا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ اسی لیے اندر سے کنڈی چڑھادی گئی تھی بلکہ بونگا تو سلگتے ہوئے اپلوں کی مٹی کی انگیٹھی رانوں میں دبائے بیٹھا تھا۔ کسی نے آوازہ کسا:

"ابے بونگے اچھی جوانی ہے سالے، انگیٹھی رانوں میں دابے ہے۔"

"جار! جن انگیٹھیوں کی گرمی تھی ان سے ایک کی سادی ہوگئی اور دوسری گائب......"

"ہاں بھئی ڈیڑھ مہینہ ہوگیا نکی کو گیب ہوئے۔"

ایک بولا۔ "جار اچھی بات جاد دلائی مجھے، آج ایک آدمی ملا تھا جو نکی کی موسی کے گاؤں کے قریب والے گاؤں میں رہتا ہے۔"

"کیا نکی کی کوئی کھبر ملی؟" ایک دو نے دلچسپی لی۔

"ہاں۔"

"کیا؟"

"اس نے کنویں میں چھلانگ لگادی تھی۔"

"ہرے رام!!"

"اس نے جیہہ بھی بتایا کہ اس کے بچہ ہونے والا تھا۔"

"ہو......او......پھر؟"

"اس نے بتایا جیادہ کھبر نہیں۔ سنا تھا کہ لڑکی بچ جائے گی۔"

باج نے رائے دی۔ "میرے کھیال میں تو دیوی داس نے اس کی حالت دیکھ کر گاؤں بھیج دیا ہوگا تاکہ وہیں کہیں بچے سے جان چھڑا کر لوٹ آئے گی تو جلدی سے سادی کردی جائے گی اس کی۔"

اس افسوس ناک واقعہ کا سب کے دلوں پر اثر ہوا اور ہنستی بولتی محفل پر خاموشی طاری ہوگئی......اتنے میں دروازے پر دستک کی آواز آئی۔

"کون؟" باج نے دریافت کیا۔ لیکن جواب میں پھر مسلسل دستک کی ہلکی ہلکی آوازیں آتی رہیں۔

سب کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی۔ باج اپنی جگہ سے اٹھا لیکن اس کے دل میں کھد بد کھد بد ہو رہی تھی کہ کہیں بڑی سردارنی نہ ہو۔ موقعہ پا کر اس نے چڑھائی کر دی ہو شاید۔

باج نے کنڈی کھول دی۔

باہر سے دروازے کو بہت آہستہ آہستہ دھکیلا گیا۔

چراغ کی تھرتھراتی ہوئی لو کی مدھم روشنی میں ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔

سانولی!!

باج دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

حاضرین میں سے سب کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ سانولی کو دیکھ کر قریب تھا کہ ان کے منہ سے بے اختیار مختلف آوازیں نکل جائیں۔ لیکن باج کے اشارے پر وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔

سانولی اور آگے بڑھی۔ اس کا گول چہرہ، نوخیز جوانی کی حدت سے تمتمائے ہوئے چہرے کی جلد، قدرے موٹے اور بھرپور ہونٹ۔ چکنے گال...... ان سب چیزوں کے حسن کو پہلے کسی نے قابلِ توجہ نہیں سمجھا تھا۔ ان سب دل لیوا خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر شیر خوار بچے کا سا بھولپن ہویدا تھا۔

لیکن اتنی گئی رات کو وہ وہاں کیا کرنے آئی تھی؟

سانولی نے ہاتھ پھیلا کر اس کی اونچی اور بھاری بھرکم میز کا سہارا لیا۔ جس پر باج فرنیچر بناتے وقت مختلف حصوں پر رندہ کیا کرتا تھا۔ لڑکی نے منہ کھولا اور سرگوشی میں بولی: "باج، چاچا!"

"ہاں۔" باج نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

سانولی نے گردن اِدھر اُدھر گھما کر کوئی اور آواز سننے کی ناکام کوشش کی۔ اس وقت اس کے نیم وا منہ کے اندر دانتوں کی قطار کے پیچھے اس کی جیبھ چھوٹی سی مچھلی کی طرح متحرک تھی۔ پھر اس

نے رازدارانہ لہجے میں دریافت کیا۔ "تم اکیلے ہو؟"

یہ سن کر سب نے گردنیں آگے کو بڑھائیں۔ اُن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ باج نے آواز کا لہجہ بدلے بغیر جواب دیا۔

"ہاں سانولی! میں اکیلاں ہوں۔"

"کہاں ہو؟" یہ کہہ کر وہ بازو پھیلا کر ہاتھ ہلاتی ہوئی آگے بڑھی۔ پھر اس نے اسے چھو لیا۔

"یہ رہے تم!" وہ اسے چھو کر بہت خوش ہوئی۔

"سانولی! تم اس بخت یہاں کیوں آئی ہو؟"

"کیوں اس وخت کیا ہے؟"

"اس بخت رات ہے تم...... تم جوان ہو...... کریب کریب۔"

"میرے لیے رات اور دن ایک برابر ہیں۔"

"لیکن اس بخت رات کے گیارہ بج چکے ہیں...... اور پھر تم اکیلی ہو۔"

یہ سُن کر سانولی کے صاف ستھرے چہرے پر اذیت کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ حیران ہو کر بولی:

"پر باج چاچا! بھلا تمہارے پاس آنے میں کیا برائی ہو سکتی ہے۔ تم تو دیوتا ہو......"

باج ٹھٹھک کر پیچھے ہٹا۔

"تم نہیں جانتے چاچا۔" سانولی نے پھر کہنا شروع کیا۔ "تمہاری دنیا اور ہے اور اندھوں کی دنیا اور۔ چاچا تم کتنے اچھے، کتنے مہربان ہو۔ جب میں تمہاری آواج سنتی ہوں تو گھنٹوں اس کی مٹھاس اور پیار کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ جب کبھی لالہ (باپ) مجھے گسے ہوتا ہے تو میں سوچتی ہوں کہ کوئی بات نہیں میرا باج چاچا جو ہے۔ وہ مجھے لالہ سے کم پیار تو نہیں کرتا...... ٹھیک ہے نا۔"

اس دوران میں باج مونچھ کا ایک سرا دانتوں میں ہلکے ہلکے چباتا رہا اس کی بات ختم ہو جانے پر اس نے تامل کیا اور پھر اس کے بدنما چہرے پر ایک دل کش مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اپنا کھردرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر بولا۔ "ہاں سانولی! یہ سچ ہے...... لیکن...... اس بخت تم جاؤ۔"

"نہیں، نہیں چاچا میں تم سے باتیں کرنے آئی ہوں۔"

"اچھی لڑکی بنو سانولی! اس ٹیم جاؤ۔ کل کریں گے باتیں......"

"او نہیں چاچا، کل تک صبر ہو سکتا تو میں بستر سے اٹھ کر کیوں آتی؟"

سب دم بخود۔

کارخانے کے کمرے میں ایک بار پھر سانولی کی آواز گھنٹی کی طرح گونج اٹھی۔ "باج چاچا! تم سمجھتے نہیں۔ میں تم سے باتیں کرنے آئی ہوں۔ اس بخت یہاں کوئی نہیں۔ جبھی تو میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا باتیں کرنا چاہتی ہو؟"

"باج چاچا!" اب سانولی کی آواز بدل گئی۔ اس نے توقف کیا اور پھر بولی۔ "باج چاچا!...... کلدیپ بابو بہت اچھے ہیں...... وہ کہتے تھے کہ میری آنکھیں ٹھیک ہو سکتی ہیں۔ میں جنم کی اندھی نہیں ہوں نا! اس لیے...... اور...... وہ...... کہتے تھے کہ تم سے بیاہ...... بیاہ کروں گا۔"

اس پر باج نے اپنی داڑھی کو مضبوطی سے مٹھی میں پکڑ لیا۔ "کون کلدیپ؟"

"وہ جو نئے آئے تھے، وہی ناں!"

"کیا کہتا تھا وہ......"

"وہ کہتے تھے سانولی! تم مجھے بڑی پیاری لگتی ہو۔ میں کہتی میں اندھی ہوں، بھلا اندھی لڑکیاں بھی کسی کو پیاری لگتی ہیں۔ وہ کہتے باؤلی! پیار کیا نہیں جاتا، ہو جاتا ہے۔ میں تمہیں پیار کرتا ہوں اور پھر تم جنم کی اندھی نہیں ہو۔ تمہارا علاج ہو سکتا ہے۔ تم دیکھنے لگو گی...... پر چاچا! ان کو گئے پندرہ دن ہو چکے ہیں۔ لوٹ کے نہیں آئے...... اور...... اور......"

یہ کہتے کہتے سانولی نے اپنی بے نور آنکھوں کو اور پھیلایا جیسے کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو اور پھر جھینپ کر بولی: "...... اور میرا پاؤں بھی بھاری ہے......"

باج نے دفعتاً کھل جانے والے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

سانولی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی اور بغیر جوش و خروش کے ذرا غم میں ڈوبی ہوئی آواز میں اس نے پھر سلسلۂ کلام جاری کر دیا۔ "آج بستر پر لیٹے لیٹے میں سوچ رہی تھی کہ اگر وہ نہ آئے تو......؟ لالہ بہت دکھی ہے۔ وہ کہتا ہے گھگھی اور نکی دونوں کھراب ہیں۔ ایک کو ایسا روگ لگ گیا ہے جس سے بچنا محال ہے۔ دوسری کا پاؤں...... سچ باج چاچا۔ لالہ بے حد دُکھی ہے۔ وہ رات رات بھر

روتا رہتا ہے...... وہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ مجھے گلے سے لگا کر کہتا ہے۔ یہ میری رانی بٹیا ہے۔ اسے باپ چھو کر بھی نہیں گیا...... لیکن اسے نہیں ملوم کہ میرا پاؤں بھی...... میں سوچتی ہو کہ اگر کلدیپ بابو نہ آئے تو...... لالہ کو ملوم ہو جائے گا۔ وہ مر جائے گا۔ ایک دم مر جائے گا...... یہ سوچتے سوچتے مجھے رونا آگیا۔ مجھے کچھ نہیں سوجھا تو جی کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے تمہارے پاس چلی آئی...... لیکن وہ جرور آئیں گے...... ہیں نا! چاچا! وہ آئیں گے نا؟"

سب لوگ دم سادھے بیٹھے رہے۔

باج نے ایک بار پھر اپنا بھاری بھر کم ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں سانولی! کلدیپ آئے گا...... وہ جرور آئے گا......"

تھر تھراتی ہوئی مدھم روشنی میں باج نے دیکھا کہ سانولی کی بے نور آنکھوں کے گوشوں میں آنسو دمک رہے ہیں......

"اور اب سانولی تمہیں واپس جانا چاہیے۔"

یہ کہہ کر باج نے دروازہ آہستہ سے کھولا اور سانولی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اسے آگے بڑھایا۔ وہ قدم بہ قدم چلنے لگی۔

باج دروازے پر ہی رک گیا۔ وہ سانولی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ہر چہار جانب خاموشی کی حکومت تھی۔ تاروں کی مدھم روشنی میں سانولی ایک سائے کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے لیے اندھیرا اجالا ایک برابر تھا۔ وہ بلا کسی ہچکچاہٹ کے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

باورچی خانے کے کونے سے گزر کر حویلی کی پر شکوہ لیکن سیاہ دیوار کے سیاہ تر سائے تلے سے ہوتی ہوئی جب وہ بڑے پھاٹک پر بنی ہوئی اس اونچی محراب کے تلے پہنچی، جس کے نیچے سے تین ہاتھی اوپر تلے آسانی سے گزر سکتے تھے تو باج کو میلے کچیلے کپڑے پہنے وہ ابھرے بدن کی ہلکی پھلکی اندھی لڑکی بہت کمزور، بے حقیقت اور بے دست و پا دکھائی دی۔ جیسے وہ کوئی رینگتا ہوا حقیر کیڑا ہو۔

باج وہیں پر کھڑا رہا۔ اس نے آسمان کی وسعتوں، حویلی کی بلند و بالا دیواروں، بے جان عمارتوں کے سلسلوں اور پھر اس طویل و عریض دالان پر نگاہ دوڑائی جس کی فضا میں کئی کچے کنوارے قہقہے گونجتے گونجتے دفعتہً دردناک چیخوں میں تبدیل ہو گئے تھے......

رات، کوئی رات اس قدر کالی اس کے دیکھنے میں پہلے کبھی نہیں آئی تھی......اور تارے خون کی چھینٹوں کے مانند دکھائی دے رہے تھے۔

(۱۰)

جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے۔ توں توں سانولی کے رازداں کاریگروں، خصوصاً باج کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سانولی اپنی بہنوں کی طرح برباد ہو۔ نل کے پاس یا دروازے کی سیڑھیوں پر یا اونچی محراب تلے بیٹھی ہوئی اندھی سانولی کی حالت انھیں بڑی قابل رحم دکھائی دیتی تھی۔ آتے جاتے جب بھی ان کی اُس سے مڈبھیڑ ہوتی تو سانولی نے کبھی ان سے یا باج سے دوبارہ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔

بیس دن اور بیت گئے۔

پنجاب برباد ہو رہا تھا۔ وارث شاہ کا پنجاب، گندم کے سنہرے خوشوں والا پنجاب، شہد بھرے گیتوں والا پنجاب، ہیر کا پنجاب، کونجوں اور رہٹوں والا پنجاب!! اور اس کی ایک بے نور آنکھوں والی حقیر سی بیٹی بھی برباد ہو رہی تھی۔

ایک رات جب کہ سب کاریگر کھانے دانے سے فارغ ہو کر حسبِ معمول کارخانے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو قدرتی طور پر سانولی کا ذکر شروع ہو گیا۔ ان سب کی دلی تمنا یہی تھی کہ کاش! سانولی کا اپنی بہنوں کا سا حال نہ ہو۔ لیکن وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ یہ ناممکن ہے اور یہ سوچنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔

باج کھلے دروازے میں کھڑا کالے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بونگے کو سردی محسوس ہوئی تو اس نے چلا کر کہا۔ "اوئے مٹوں دیا متر اڑا دروا جا بند کر دے، سالے تو تو سانڈ ہو رہا ہے پھول کر، ہم غریبوں کا تو خیال کر۔"

اور کوئی موقعہ ہوتا تو باج بونگے کی گالی کے جواب میں کوئی نئی اور بھاری بھرکم گالی کی اختراع کرتا۔ لیکن اس وقت اس نے چپکے سے دروازہ بھیڑ دیا اور خود بڑی میز پر ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔
سب اسے ہنسنے بولنے کے لیے اکساتے رہے لیکن جب اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا تو انھوں نے

بڑے اصرار سے پوچھا۔ "بی باج! آج کیا بات ہے۔"

"میں سوچ رہا ہوں۔"

بونگے نے سردی لگنے کے باوجود اٹھ کر جھٹ سے کبڈی کھیلنے والے کھلاڑی کا سا پوز بنایا اور قریب آکر بولا۔ "سچے بادشاہو! کیا سوچ رہے ہو؟"

باج نے اس کی جانب فلسفیانہ انداز سے دیکھا تو اسے ہنسی آگئی۔ لیکن باج کے تیور ویسے کے ویسے رہے۔

بونگے کو تمسخرانہ انداز سے اپنی جانب دیکھتے ہوئے باج نے کلے کے اندر زبان گھمائی اور پھر سر کو حرکت دے کر اس نے بونگے اور دیگر ساتھیوں پر چھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور کہا:

"میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔"

"کیا؟" سب کو اس کا فلسفیانہ موڈ دیکھ کر ہنسی آرہی تھی جسے وہ بمشکل روکے ہوئے تھے۔

باج نے سر کو یوں جھٹکا دیا جیسے وہ بہت بھاری جہاں دیدہ بزرگ ہو اور پھر میز کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر بولا۔

"پنجاب میں کتنا جلم ہو رہا ہے۔ ایسا کھون کھرابا نہ دیکھا نہ سنا ٹھیک؟"

"ٹھیک۔"

"......اور پھر ہندو اور سکھ عورتوں کی جو بجتی (بے عزتی) پچھمی پنجاب میں مسلمان کر رہے ہیں۔ وہ سب تم کو مالوم ہے۔ ٹھیک؟"

"ٹھیک۔" سب نے ذرا جوش میں آکر جواب دیا۔

اب کچھ دیر تامل کرنے کے بعد دھیرے دھیرے سپاہیانہ انداز میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا:

"پر ...... میں سوچتا ہوں کہ مسلمان گسے میں آکر جو بیا کو بھی (بیوقوفی) کر رہے ہیں، وہی بیا کو بھی ہم چنگے بھلے اپنی بہنوں اور بہو بیٹیوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔ بتاؤ مسلمانوں کو دوش دینے سے پہلے ہمیں کھد کو شرم محسوس نہیں ہونی چاہیے۔"

محفل پر سناٹا چھا گیا۔

ننھے سے چراغ کی پتلی سی تھر تھراتی لو کی روشنی میں باج نے اپنی موٹی اور لمبی انگلی اٹھاتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا:

''ایسے ہی پاکستان میں گھکی، نکی اور سانولی کی ہزاروں لاکھوں بہنیں ہوں گی، تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم یا وہ کس عجت (عزت) کے لیے لڑ رہے ہیں۔ کیوں ایک دوسرے کو جانگلی کہتے ہیں؟''

اتنے میں دروازہ بڑے دھماکے کے ساتھ کھلا۔ سب نے ادھر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ سانولی دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی ہے۔ اس کے روکھے سوکھے بال روئی کی طرح دُھنے ہوئے ہیں۔ اس کے بازو پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے اعضا میں لرزش ہے۔ پیشتر اس کے کہ کوئی بولتا، وہ زور سے چلائی:

''باج چاچا! باج چاچا!''

زندگی میں پہلی بار باج کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

''باج چاچا! باج چاچا!''

سانولی کی آواز فضا میں دوبارہ گونجی

''ہاں، ہاں سانولی بول۔ گھبرائی ہوئی کیوں ہے تو، بول......''

''وہ آگئے؟''

''کون؟''

''کلدیپ بابو آگئے۔''

''آگیا وہ؟'' سب خوشی کے مارے چلا اٹھے۔

''اور آتے ہی وہ مجھے ڈاکدار کے پاس لے گئے۔ ڈاکدار نے کہا آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔ لیکن علاج بہت دن کرنا پڑے گا......''

باج نے بڑھ کر سانولی کے دونوں کمزور کندھوں کو اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیا اور اسے ہلا کر بولا:

''سچ، کب؟''

"ہاں سچ ان کی ماتا جی بھی ساتھ آئی ہیں۔"

"اری تو وہ اتنے دن کہاں گیب رہا۔"

"انھوں نے مجھے بتایا کہ پہلے ان کی بات کوئی نہیں مانتا تھا۔ انھوں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ بڑی مشکلوں سے انھوں نے ان کی بات مان لی۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا رگڑا جھگڑا ہوا کہ میں کھت بھی نہ لکھ سکا۔ لکھتا بھی تو کیا لکھتا......"

"او ہو ہو ہو۔" سب بے اختیار ہنسے۔

سانولی نے جھوم کر کہا۔

"وہ میری منتیں کرنے لگے، کہنے لگے، سانولی مجھے ماپھ کر دو...... اگر تمہیں کوئی دُکھ پہنچا ہو۔ ہم کوئی امیر نہیں ہیں، لیکن سب کام ٹھیک ہو جائیں گے...... ہم تمہیں دلی لے جائیں گے......"

اب سب لوگ سانولی کی طرف بڑھے اور اپنے اپنے انداز اور لہجے میں خوشی کا اظہار کرنے لگے۔

آخر باج نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا:

"بھائیو! ٹھہرو۔ میرے کھیال میں اب سانولی کو آرام کرنا چاہیے اسے رات کے سمے گھر سے باہر نہیں رہنا چاہیے...... سانولی ہم بوہت کھش ہیں۔ اب کل باتیں ہوں گی۔ چلو...... اب تم جلدی سے گھر جاؤ۔"

سانولی کے ساتھ کسی کا جانا مناسب نہیں تھا۔ کیونکہ وہ گھر والوں سے چوری چھپے آئی تھی۔ سب اسے انتہائی پیار سے کارخانے کے دروازے تک چھوڑنے گئے۔

آٹھ دس منٹ بعد جب سارا ٹولہ بازار جانے کا پروگرام بنا کر باہر نکلا تو اونچی محراب تلے سے گزرتے وقت انھیں دیوار کے ساتھ ایک مٹیالا بت سا نظر آیا۔

وہ سب رُک گئے۔

باج نے آگے بڑھ کر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ سانولی ہے۔

"سانولی! تم ابھی گھر نہیں گئیں؟"

سانولی نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

"باج چاچا! نہ جانے میرے دل کو کیا ہو گیا ہے۔ کچھ سوجھتا ہی نہیں کہ کیا کروں۔ ذرا دم لینے کے لیے رک گئی...... باج چاچا! سوچتی ہوں۔ ایسی کھشی کی بات کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن چاچا تمہیں میری بات پر اکین ہے نا؟"

باج نے گھوم کر اپنے ساتھیوں کی جانب سوالیہ انداز سے دیکھا سب چپ تھے۔ وہ بھی چپ رہ گیا۔

سب کو خاموش پا کر سانولی نے اپنا سوال دُہرایا۔ "آپ سب کو اکین نہیں آتا؟"

باج کی آنکھوں کے گوشے پر آب ہو گئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سانولی کے سر پر رکھ دیا اور پھر دھیمی آواز میں بولا:

"ہمیں اکین ہے...... اور دیکھو تمہیں بے بخت گھر سے باہر نہیں رُکنا چاہیے اور پھر سردی پڑنے لگی ہے۔ کہیں تم بیمار نہ ہو جاؤ۔"

سانولی نے اس کی مضبوط کلائی کو اپنی کمزور انگلیوں سے چھو کر پوچھا۔ "پر باج چاچا آپ سب لوگ بے وخت کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم۔" باج نے پدرانہ پیار سے لرزتے ہوئے اس کے گال کو چھوتے ہوئے جواب دیا......

"سانولی بٹی! ہم اس کھوشی میں برفی کھانے جا رہے ہیں۔"

# دیش بھگت

شام ہو چکی تھی۔ میں چھوٹے بھائی کو چٹھی لکھ رہا تھا کہ اتنے میں چچا اندر داخل ہوئے، بغیر کسی تمہید کے بولے۔ "سنو! آج ذرا خاص کام ہے۔ تم کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

'خاص کام' والے الفاظ سن کر میں نے سرہانے سے صفا جنگ اٹھائی اور اسے فرش پر ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"مسلمانوں کا محلہ ہے...... میاں لوگوں کا، سمجھے؟......اور پھر روپے کا معاملہ......"

میری ان سے کوئی رشتہ داری نہ تھی۔ بس ہمارے گاؤں کے رہنے والے، والد صاحب سے بھی کچھ دعا سلام تھی۔ مجھ پر مہربان تھے اور قدرے بے تکلف بھی۔ میری عمر تقریباً بائیس برس کی تھی، قد ذرا نکلتا ہوا، چوڑا سینہ، سڈول بازو، مضبوط ہاتھ پاؤں، باوجود چار مرتبہ کوشش کرنے کے بھی ایف۔اے پاس نہ کر پایا تھا۔ چچا کا میانہ قد، گندمی رنگ، کھچڑی داڑھی، دبلے پتلے مگر سخت ہڈی کے تقریباً پینتالیس سالہ بزرگ۔ انھیں پنجاب چھوڑے تین سال ہو چکے تھے۔ اس جگہ ان کا ایک اینٹوں کا بھٹہ تھا۔ تھوڑا بہت ٹھیکیداری کا کام بھی مل جاتا تھا۔

غبار اور دھند کے گہرے کفن نے شہر کو ڈھانپ رکھا تھا، بازاروں میں کان پڑی آواز سنائی نہ

دیتی تھی۔ یکہ والوں کے آوازے، ان کی گالیاں، اور قوالیاں...... دور دھندلکے میں مسجد کے قریب، کسی گھر کی چھت پر سفید سفید کبوتروں کی ٹکڑیاں ہوا میں پرواز کرتی دکھائی دے رہی تھیں۔

ہم گھنٹہ گھر کے قریب سے ہو کر بیگم سرائے کی طرف چل کھڑے ہوئے۔

نکڑ پر بادشاہ خاں پٹھان کی چائے کی دکان تھی، اس جگہ سود خوار پٹھانوں کا اجتماع ہوتا تھا، بیٹھے چائے پیتے یا قہوہ اڑاتے، دو تین، بے بال و پر چھوکرے آگ جلانے، پیالیاں دھونے، چائے بنانے اور پھر گاہکوں کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرنے کے فرائض انجام دیا کرتے تھے اور کبھی ریکارڈ بجتے:

لڑم دے لڑم

وہ مورے راود کا لڑم دے لڑم

کبھی کوئی خان اپنی شلوار اوپر چڑھا، ٹانگیں رانوں تک ننگی کر، کسی ہندوستانی موچی سے جھگڑنے لگتا اور کہتا:

"امرا کابل میں چپل اوتا، تمرا دیس میں چپلی"

یا پھر پہلو والی "گرم گرم قلیہ پراٹھا" کی دکان پر شاہ صاحب، ایک بزرگ سبز پوش، داڑھی مہندی سے سرخ کیے آن بیٹھتے۔ آنکھیں جلالِ معرفت کے مارے خونِ کبوتر چہرہ کندن کی طرح تاباں، زلفیں چکنی چپڑی اور عطر بیز...... ان کے تشریف آور ہوتے ہی عقیدت مندوں کے غول کے غول جمع ہونا شروع ہو جاتے، مجبر (مظہر) شہر کے بے تاج باشادہ جمن رنگ ساز، قمر جلد ساز، اور للو مالک:

جاتے کہاں ہو کس طرف خیال ہے

گھڑیوں کا بس یہی اسپتال ہے

وغیرہ جیسی، ہستیاں آن کھڑی ہوتیں، گراموفون کو چابی دے کر ملکۂ عالم کا ریکارڈ چڑھا دیا جاتا اور سب لوگ تالیوں کے ساتھ "اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو" گانے لگتے۔

اس طرف پیسہ اخبار والا چلاتا۔ "ہٹلر کی پیش قدم...... برطانیہ کا دنداں شکن جواب...... جاپان

کی برطانیہ کو گیڈر بھبکی...... ایک پیسہ میں۔"

یہ سن کر وہ بزرگ سبز پوش سر کو زور کے ساتھ گردش دے کر نعرہ لگاتے "یا علی" اور پھر وہی "اللہ ہو، اللہ ہو۔"

اِدھر یہ ہنگامہ تو اُدھر کھجلی کے مارے ہوئے کتے شامی کبابوں کی بو پاکر تھوتھنیاں اٹھا اٹھا کر ہوائیں سونگھا کرتے اور کبھی موقع پاکر کچھ نہ کچھ لے بھی اڑتے۔

کچھ دور جانے کے بعد مہکی پنواڑن کی دُکان کے آگے رک گئے۔ مہکی کی عمر بتیس برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ بدن کی بھاری، گورا رنگ، ناز و ادا کی کمی نہ تھی، بڑی بڑی آنکھوں میں بے تحاشہ کاجل، ہونٹوں پر مسی کی دھڑی۔ پان کا بیڑا بڑھاتی تو اپنی نشیلی اور کٹیلی آنکھیں پہلے تو گاہک کی آنکھوں سے لڑا دیتی تب شرما کر اور مسکرا کر نظریں جھکا لیتی، اور پنڈلیوں کو دھوتی سے ڈھانپ کر اپنی چاندی کی پازیبوں پر نظریں گاڑ دیتی۔

میلے کچیلے چیتھڑے پہننے والے مزدور، ڈاکخانہ کے قریب بیٹھے والے خطوط نویس منشی یا ہوٹلوں کے گائڈ نشہ کے ترنگ میں آتے اور اسے دیکھ کر مچل جاتے۔ اپنی اندر دھنسی ہوئی مخمور آنکھوں سے اسے دیکھتے۔ کبھی اتنا کہنے کے لیے "ہائے ری آج تو غجب کا بناؤ سنگھار کر رکھا ہے" کبھی کسی کجری کا بول از قسم:

گھر سے نکسی نند بھو جیا
جلم دونوں جوڑی رے سانوریا

اور کبھی پان لیتے وقت اس کی ہتھیلی کو اپنی انگلی سے کھجا دینے کی تمنا میں ایک پیسہ کے پان اور ایک پیسے کی چار والی پری مار کہ سگریٹ خرید لیتے تھے۔

چچا کو دیکھتے ہی اس نے جھک کر سلام کیا۔ "ارے پنجابی بابو! کون دیس رہت ہو اب۔"

"مہکی بس کیا پوچھو ہو، تم ہمن کو بھولت نا ہو۔"

مہکی سر پر آنچل کھینچ سنبھل کر ہو بیٹھی اور پان لگاتے ہوئے کہنے لگی۔ "اور وہ ہمرے لیے تم چندری لان کو کہت رہے"

چچا سنی ان سنی کر کے اس کے لال لال گالوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے تاکتے ہوئے بولے۔ "اب لا دو دیو گی بھی نہیں!"

مہکی کچھ لجا گئی اور ملامت آمیز نظروں سے چچا کی طرف دیکھنے لگی۔

اتنے میں اور گاہک بھی آ گئے۔ میں ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

بائیں طرف برآمدے میں ایک بڑھیا کسی چالاک لومڑی کی طرح سب کو تاڑ رہی تھی، اس کے قریب ہی ٹاٹ پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ جس میں سوائے اس کے کہ جوان تھی، اور کوئی خوبی نہ تھی۔ نوجوان عورت نے مجمع کے آدمیوں کو اپنی طرف چھپی نظروں سے دیکھتے ہوئے پایا تو جھٹ سے قمیص کے بٹن کھول، گریبان الٹ الٹ کر لالٹین کی روشنی میں کھٹمل پکڑنے لگی۔ اور گاہے ساڑی ہٹا کر اپنی ٹانگیں کھجانے لگتی۔

کچی اور سیاہ دیواروں پر پان کی پیک کے نشانات ایسے دکھائی دیتے تھے، جیسے بھوت ناچ رہے ہوں، کمرے کے اندر جاپانی عورتوں کی نیم عریاں، پھٹی پرانی تصویریں نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف کھاٹ پر بستر بچھا ہوا تھا، اور اس کے پاس ہی فرش پر ایک مٹیالے رنگ کا اگالدان بھی پڑا تھا۔

ایک مرد نے نوجوان عورت کے بازو کی چٹکی لیتے ہوئے کچھ پوچھا، تو بڑھیا نے تاریکی میں آگے جھک کر حلق میں سے آواز نکالتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "آٹھ آنے......"

تاریک اور پیچ در پیچ گلیوں میں سے ہوتے ہوئے ہم چلے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی گلی کے نکڑ پر سرکاری لیمپ کی دھندلی روشنی میں صفا جنگ کی چمک اور میری گھیرے دار شلوار سے خائف ہو کر بچے گھروں میں گھس کواڑ بند کر لیتے تھے۔

کمہاروں کے محلے کے قریب پہنچ کر چچا گندے نالے کی طرف چل دیے۔ راستہ گھوڑوں اور گدھوں کی لید سے اٹا پڑا تھا۔ چھپروں والے ٹوٹے پھوٹے کچے مکانات تھے۔ کمہاروں کی بھاری بھر کم عورتیں کچے چبوتروں پر لیٹی، روتے ہوئے ننھے بچوں کو دودھ پلا کر چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

گندے نالے کے پل پر سے گزرتے ہوئے میں نے ناک پگڑی کے شملے سے ڈھانپ لی۔ اس کے بعد ہم بڑے تالاب کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ یہاں شہر بھر کی گندگی جمع تھی۔ لوگ ٹٹی

بھی یہیں پھرتے تھے۔ جب وہ اٹھ کر چلے جاتے تو بھنگیوں کے محلے سے سور آ کر منہ مارنے لگتے۔ کہیں کہیں کتے دم توڑتے نظر آتے تھے۔ کہیں کسی گدھے کا پنجر پڑا تھا اور کسی طرف گھوڑے کے جبڑے کے پاس کوئی گدھ مرا پڑا تھا۔ یہ کچا تالاب بہت بڑا تھا۔ اس کے اندر کئی انسانوں اور جانوروں کا پیشاب اور غلاظت جمع تھی۔ اس کا پانی بہت گاڑھا، از حد بدبودار اور سیاہ رنگ کا تھا۔ چاند کی چاندنی اس کو اور بھی بھیانک بنا رہی تھی۔ اس کی سطح پر اُبلے ہوئے بلبلے اس طرح دکھائی دیتے تھے۔ جیسے کسی شخص کے جسم پر آتشک کے زخم۔

یہاں سے گزر کر بہت دیر تک ہم دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ آخر کار چچا ایک ٹوٹے پھوٹے گھر کے آگے رُکے اور آوازیں دینے لگے۔ "مجید! او مجیدے!!"

میں نے کہا۔ "چچا آپ نے فضول میں اتنا بڑا چکر لگایا، یہ گلی وہی نہیں جو اسٹیشن سے آنے والی سڑک سے جا ملتی ہے۔"

چچا دیدے چکا کر بولے۔ "ارے میاں! اُدھر جاتے تو بھلا یہ سیر کیسے ہوتی، بس تم بھوندو ہی رہے...... ہی ہی ادھر کیا رکھا تھا...... ہی ہی...... ارے او مجیدے او۔"

"ہجور گلام تو ایدھر کھڑا ہے۔"

میں نے گھوم کر دیکھا کہ ایک لمبا تڑنگا، چوڑے شانوں والا مرد جھکا فرشی سلام کر رہا ہے۔ باوجود سردی کے ایک میلا کچیلا تہمد کمر سے لپیٹے ہوئے تھا۔ اور جسم پر صرف ایک چادر۔

"آیئے آیئے آکا! اندر چلے آیئے۔"

یہ کہہ کر اس ٹاٹ کا گلا سڑا پردہ اٹھایا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔

"کران کسم (بہن کی گالی دے کر) سالوں نے جینا مسکل کر دیا ہے۔ یہ پولس بھی بس کھدا کی پناہ ہے۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے چھوٹے سے صحن کے کونے میں ایک پاخانہ، پاس ہی لکڑیوں کا انبار، گوبر سے لپی ہوئی کچی دیواروں پر اُپلے، ایک طرف کھٹملوں سے بھرپور ٹوٹی ہوئی کھاٹ، اُدھر چولھے کے قریب مٹی کے تیل کی کپی، اس کی چھوٹی سی لو بے پناہ تاریکی سے جنگ کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ چولھے کے قریب ایک بڑھیا اینٹ پر بیٹھی ایک باسی روٹی توڑ توڑ

کر کھا رہی تھی۔ ہاتھ میں پیاز اور فرش پر چٹنی کا پتہ۔

مجید چچا کو بتا رہا تھا کہ کیسے ان کے محلے میں کسی نے ایک ہندو پر لاٹھی چلادی۔ جس سے اس کا سر تو بچ گیا، مگر ایک کان صاف اڑ گیا۔ اور کسی طرح وہ چیختا چلاتا محلّہ کے ناکے کی طرف بھاگا، اور پھر ناکے کے صحن میں بیہوش ہو کر گر پڑا تھا اور کیسے پولس اس کو (مجیدا کو) ناحق دو گھنٹہ سے کوتوالی میں بٹھائے دق کر رہی تھی، اور اب کہیں جا کر اس کی خلاصی ہوئی تھی۔ چچا یہ باتیں سن کر کچھ پریشان ہو گئے۔

مجید چولھے کی طرف گیا، پتہ میں سے انگلی پر چٹنی لگا کر چاٹی، اور چٹخارہ لے کر بولا' کاہے کی ہے؟"

"پیاج کی۔"

پھر وہ چھت سے لٹکی ہوئی ہنڈیا میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگا۔ "تنبا کو کہاں ہے؟"

پوپلے منہ والے بڑھیا بولی۔ "بوتبے کے پیچھے۔"

مجید حقہ پینے لگا۔ چچا کی جانب دیکھ کر بڑھیا کی طرف ابرو سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ماں ہے میری۔"

اتنے میں پردہ اٹھا۔ ایک کالے کلوٹے مرد نے اندر جھانک کر دیکھا۔ "کئو (کہو) مجید کھاں! پولیس میں کا ہوا؟"

چچا اس کی صورت دیکھ کر گھبرائے، اس کا سر استرے سے منڈا ہوا، یہ موٹی گردن، ٹوٹے ہوئے کان، چوڑے نتھنے......

چچا نے میرا ہاتھ دبایا۔

"بتلائیں گے۔" یہ کہہ کر مجید اٹھا اور اس کے پاس جا کر کانا پھوسی کرنے لگا، خیر وہ شخص تو چلا گیا اور مجید پھر آ کر حقہ گڑگڑانے لگا۔

چچا نے پیشانی سے پسینہ پونچھا، کھانس کر گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔ "اچھا بھئی مجید اب کچھ معاملہ کی بات ہونی چاہیے۔"

"ہاں ہاں۔" مجید نے سر گھما کر کہا۔ پھر بڑھیا کی طرف جھکا "کیوں ماں! (آنکھ مار کر) پکھانے

گئی کیا؟"

بڑھیا نے دبی زبان میں کچھ جواب دیا۔

"دھت تری کی ماں! تو بھی عجب اول جلول ہے۔"

اس نے حقہ رکھ دیا اور "ابھی آیا۔" کہہ کر جانے لگا۔

چچا گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ "مجید! ہم باہر سڑک پر کھڑے ہوتے ہیں، تم اسے ادھر ہی لے آنا۔"

"کسم اللہ پاک کی، پنجابی بابو جدھر حکم ہو لے آؤں۔"

"اچھا تو ہم سڑک پر کھڑے ہیں۔"

یہ کہہ کر چچا بھاگم بھاگ سڑک پر آ کھڑے ہوئے اور اسٹیشن سے آنے والے یکوں کو دیکھنے لگے۔

چچا، مجید، ایک نوجوان لڑکی، بڑھیا اور میں، کل پانچ اشخاص ایک تواریخی باغ کی چار دیواری کے پاس کھڑے تھے۔

مجید نے کچھ طویل بیان شروع کر رکھا تھا، اور لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے چچا سے کہہ رہا تھا ......"روج پوجا کرن جات رہی ...... میں نے سمجھایا، پگلی پوجا سے کا ملی؟ چل پنجابی سنگ سادی کرا دوں گا، بس پنجاب دیس جا، گہنا، کپڑا پہن، کھانا پینا مجا اڑانا...... بس ایسی دھپل میں پھانس لایا ہوں، پنجابی سردار! لونڈیا کا ہے، ہیرا سمجھو...... گریب ہیں کو نکوں میں رکھا...... تمرے پاس جا کر چمک بڑھوا ہی کرے گی۔"

لڑکی کی عمر بمشکل تیرہ یا چودہ برس کی ہو گی۔ گندمی رنگ، ناک چوڑی، ہونٹ جیسے سنگترے کی پھانکیں، بڑی بڑی زرد آنکھیں، بال خشک بدبودار، ہاتھوں اور کلائیوں پر میل، دبلی پتلی، سہمی ہوئی کبوتری کی طرح ایک میلی سی پھولدار چادر اوڑھے کھڑی تھی۔

چچا لڑکی کو لے کر چند قدم آگے نیم کے ایک درخت کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ تھوڑی دیر خاموشی سی طاری رہی، پھر چچا کی دبی دبی آواز آنے لگی"...... کیا نام؟ ...... بتاؤ نا!...... ارے بتاؤ...... ہوں؟ کیا کہا؟ اچھا...... اچھا۔ واہ! خوب نام ہے...... ہاں! ہاں!! سردی لگتی ہے؟ ہاں لگتی ہو گی......

بولونا! تم تو کچھ بھی نہیں کہتیں...... منہ کیوں چھپاتی ہو...... ارے رے روتی ہو؟...... اچھا جانے دو ...... روتی کیوں ہو...... لو نہ سہی...... او...... اوہو...... ارے نہیں......"

"تم کا کرت ہو، چھوٹے پنجابی؟" مجید نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"پڑھتا ہوں۔"

"پڑھت ہو؟...... ہو ہو ہو...... ہی ہی...... بابو ہو جاؤ گے۔"

چچا اور لڑکی واپس آ گئے۔

مجید نے مجسم سوال بن کر چچا کی طرف دیکھا۔ چچا بولے۔ "ابھی جھینپتی ہے......"

مجید نے لڑکی کی ٹھوڑی اٹھا کر کہا۔ "ارے چھرماتی کیوں ہے، سونے کے کنگن ملیں گے...... چندریا ملے گی......"

لڑکی نے زرد زرد آنکھوں سے مجید کی طرف دیکھا...... اور پھر لمبی اور گہری سسکی بھر کر خاموش ہو گئی۔

بڑھیا اور لڑکی کو واپس گھر کی طرف روانہ کر دیا گیا، اور ہم تینوں تاڑی خانہ پہنچے۔

یہ چچا کے رسوخ کا کرشمہ تھا کہ ہمیں تین لوہے کی کرسیاں اور تین ٹانگ کی ایک میز مل گئی۔

تاڑی کی بو ہر چہار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے جہاں دیوار پر ایک "گندی بیماریوں کا شرطیہ علاج" نمایاں حروف میں رقم تھا ایک چاٹ والے کی دکان تھی۔ مزدور لوگ تاڑی کے نشہ میں مست، وہاں بینگن کے پکوڑے دہی ڈلوا ڈلوا کر کھا رہے تھے۔ دیوار کے سایہ میں ایک گونگی بھکارن بیٹھی تھی۔ اس کی صورت مکروہ تھی۔ اور جسم پر ٹاٹ کے چیتھڑے لٹکے ہوئے تھے۔ جب کوئی شخص دہی آلو پتہ نالی کی طرف پھینکتا تو دبلے پتلے کتوں اور اس گونگی بھکارن کے درمیان پتہ حاصل کرنے کی کش مکش مزدور لوگوں کی مسرت کا سامان بہم پہنچاتی تھی، وہ خوش ہوتے تھے کہ دنیا میں کسی کی بے بضاعتی پر وہ ہنس سکتے ہیں۔ وہ وحشیانہ انداز سے دانت نکال نکال کر قہقہے لگاتے اور اچھل اچھل کر اپنے چوتڑ پیٹتے تھے۔

مجید دو آبخوروں میں تاڑی اور ایک مٹی کی چینی میں بھنی ہوئی کلیجی لایا۔ تاڑی فروش نے ایک

صراحی تاڑی سے بھر کر ہمارے سامنے رکھ دی۔اب دونوں تاڑی پینے لگے۔

لالٹین کی دھندلی روشنی میں عجب عجب لوگ نظر آ رہے تھے، نشہ میں چور واہی تباہی بک رہے تھے، کہیں ٹوٹے ہوئے آبخورے کہیں کوئی چچوڑی ہوئی ہڈی پڑی تھی ...... اور کسی طرف کوئی کتا نشہ میں بے ہوش شرابی کا منہ چاٹ رہا تھا۔

چچانے دوبارہ آبخورہ بھر کر کہا"لیکن اس کی ٹانگیں بہت پتلی ہیں...... کمزور ہے بچاری......"

"ابھی عمر ہی کا ہے۔"

بہت دیر تک دونوں میں کانا پھوسی ہوتی رہی۔ پھر مجید بلند آواز میں بول اٹھا۔"ارے یابی حاجر ......اور حکم کے گلام ہیں...... وہ وہ مٹھائی کھلاؤں گا جو ایک باری یاد بھی کرو تم۔"

"مگر جو بات ہم نے کہی وہ بھولنا نہیں۔"

"ارے نہیں صاحب! جب کہو تبی ہو جائے جس...... پھکر کا ہے۔"

اتنے میں ہم ایک شرابی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔"ارے کوئی ہمری بھی سنو۔ دیکھو یہ لونڈا......"

"اماں جاؤ۔" ایک اور بھاری بھر کم پہلوان نے اس کی پیٹھ پر دھول جما کر کہا ...... اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ ہاتھ میں تاڑی سے لبریز آنجورہ لے کر اٹھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ ...... اس نے چھلکتا ہوا آنجورہ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔"میں دیب داس ہوں......دیب داس!......(زور سے کھانس کر) دُکھ کے...... دُکھ کے ......ہا...... ہا!! دُکھ کے اب دن ......"

اتنے میں نائی کا لونڈا پہلے شرابی سے ہاتھ چھڑا کر بھاگا...... پہلوان نے زور کی لات اس شخص کے رسید کی۔"ابے او...... آ...... ادھر آ...... چلا آ...... ہاں بیٹے...... ہاں، توبہ کر،...... ہاتھ جوڑ...... دعا مانگ۔ دیکھ جیسے میں مانگتا ہوں:

"یا لاہی! ادے لگائی......اور دعو عو عو دو۔"

معاً اس کا تہمد کھل کر زمین پر آ رہا، اس کے منہ سے قے کا پھوارہ نکل پڑا...... اور اس کی استرے سے منڈی ہوئی ٹانگوں پر قے کا مینہ برس گیا۔

تین چار دن کے بعد...... میں سنیما دیکھنے کے بعد دس بجے کے قریب گھر جا رہا تھا، سوچا، چلو تھوڑی دیر چچا سے گپ رہے۔

چچا ایک بھوجنالیہ میں سب سے اوپر کی منزل پر ایک کمرہ میں رہتے تھے۔

اوپر پہنچا۔ مگر دروازے کے پاس جا کر میں ٹھٹھک گیا، اندر سے کچھ باتوں کی بھنک سنائی دے رہی تھی۔

میں نے چپکے سے درز میں سے جھانکا، دیکھا کہ وہی لڑکی کھڑی تھی۔ چچا اس کے منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے، مجید نے آگے جھک کر کہا۔ "دیکھ بوت حرامجدگی کرے گی تو حلال کر کے پھیک دوں گا......"

لڑکی نے انتہائی کرب کی حالت میں تڑپ کر خود کو آزاد کیا اور دروازے کی طرف لپکی۔ وہ چلانا چاہتی تھی مگر مارے دہشت کے اس کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ چچا بڑے جوش و خروش کے ساتھ جھپٹے، انھوں نے اس کو دبوچا اور پلنگ پر پٹخ دیا۔

تھوڑی دیر بعد لڑکی نے جد و جہد بند کر دی......

مجید نہایت اطمینان کے ساتھ گورونانک صاحب کی تصویر کے پاس کھڑا بیڑی پی رہا تھا۔ اور تصویر کو احترام کی نظروں سے دیکھنے میں مگن تھا۔

دوسرے دن چھٹی تھی۔ میرا ارادہ تھا چل کر اسٹیشن کے بک اسٹال سے کوئی رسالہ وغیرہ خرید اجائے۔

جب بھوجنالیہ کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ چچا سیڑھیوں پر سے اتر رہے ہیں۔ مجھے اشارے سے بلایا اور پوچھنے لگے کہ بھائی اتنے دن کہاں رہے، دکھائی نہیں دیے۔

سیڑھیوں کے پاس ہی پنڈت جی کی دکان تھی۔ پنڈت جی پان بھی بناتے اور لسی بھی بیچتے تھے۔ چچا کو دیکھتے ہی انھوں نے دونوں ہاتھ (کہنیوں تک) جوڑ کر کہا۔ "جے واہگورو جی کی۔"

"کہیے پنڈت جی، چت پرسن ہے نا؟"

چچا اس وقت اکالیوں والی پگڑی باندھے تھے۔ کھدر کا لمبا کرتا، گلے میں پیلی رنگ کی صافی اور پھر کرپان......

"سردار جی آج تو بہت دیر سے اترے۔" پنڈت جی نے سوال کیا۔

چچا نے نہایت متانت سے سر جھکا کر جواب دیا۔ "پنڈت جی! آج سکھ منی صاحب کا پاٹھ کرتے ہوئے دیر ہو گئی۔"

اتنے میں کچھ اور لوگ بھی آ گئے، چچا اور پنڈت جی دونوں نے ایک بھکارن کو دھتکارا۔ پنڈت جی بولے "مائی کرما پھر کر...... حرامجادی...... نکھرے مت دکھا...... بہت دیکھے۔"

عورت ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ پنڈت جی نے مونچھوں کو ہٹا کر گنگا جل کی لٹیا منہ سے لگا لی۔ اور پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔ "جب پھگانیوں نے بھارت ورش پر حملہ کیا تو یہی لوگ تھے جنھوں نے ان کا مکابلہ کیا، ابلاؤں کی رکشا کی، بہت پراپکاری لوگ ہیں یہ۔"

چچا نے اپنے دبلے پتلے کمزور کاندھوں کو حرکت دی۔ اور پھر اپنی نو انچ تلوار کو سنبھالتے ہوئے بولے۔ "پیڑے ہیں پنڈت جی؟ دو گلاس لسی......"

"چچا میں تو لسی پی کر آ رہا ہوں، مجھے اجازت دیجیے۔" میں نے کہا۔

اسٹیشن پر جا کر دیکھا تو اس قدر بھیڑ تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ پلیٹ فارم تک پہنچنا ناممکن ہو گیا۔ لہٰذا باہر سے ہی تماشہ دیکھتا رہا، ایک شخص نے بلند آواز میں نعرہ لگایا۔ "بولو راشٹرپتی پنڈت جواہر لال کی جے!"

ساری مخلوق نے گلا پھاڑ پھاڑ کر کہا۔ "راشٹرپتی جواہر لال کی جے! مہاتما گاندھی کی جے!! بھارت ماتا کی جے!!!"

اور جب جواہر لال جی بگھی پر آ کر بیٹھ گئے تو اتنے میں چچا ہاتھ میں گیندے کے پھولوں کا ہار لیے نمودار ہوئے۔ انھوں نے متعدد بار پرنام کرنے کے بعد ہار پنڈت جی کے گلے میں پہنا دیا۔

"مجید کھاں" بھی کھدر کا کرتا پہنے کانگریسی رضاکار کی حیثیت سے اِدھر اُدھر دوڑتا پھر رہا تھا۔

یکایک ہٹو، بچو، بڑھو، جے رام جی کی، رام رام، راشٹرپتی ہاں ہاں، نہیں نہیں کا شور بلند ہوا۔ اور جلوس شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ سب لوگ حبِ قومی کے جوش میں نہایت عقیدت مندانہ انداز سے گا رہے تھے۔

جھنڈا اونچا رہے ہمارا

جھنڈا اونچا رہے ہمارا

جھنڈا...........

چچا کی آواز سب سے زیادہ بلند تھی۔

جب جلوس مجید کے محلہ کے پاس پہنچا تو سڑک کے کنارے بھیڑ میں مجھے وہی میلی کچیلی لڑکی دکھائی دی۔ وہ حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان جھنڈا اونچا رکھنے والوں کو دیکھ رہی تھی، وہی گرد آلود بال، سہمی ہوئی بے زبان صورت، زرد زرد آنکھیں۔

معاً گلی میں سے ایک کتا نکلا اور مجید کو دیکھ کر بے طرح بھونکنے لگا۔ وہ بھاگ کر بھیڑ میں گھس گیا۔

ایک ہوا کے جھونکے سے اس کوچے کی خاک اڑی اور چچا کی چکنی داڑھی گرد سے اٹ گئی۔

# سورما سنگھ

پچھلی گرمیوں میں جب تفریح کے لیے پہاڑ پر گیا تو وہاں لوگوں کا غیر معمولی رش پایا۔ کوئی ہوٹل، کوئی مکان یا دھرم شالہ خالی نہ تھی۔ بہت دوڑ دھوپ کے بعد کہیں گوردوارے میں جگہ ملی۔ ایک معمولی سا کمرہ تھا اور اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ۔ گوردوارے میں تین روز تک تو مفت رہنے کی اجازت تھی اور اگر اس کے بعد کوئی شخص قیام کرنا چاہے تو پھر دکشنا لی جاتی تھی۔ جنگ سے پہلے تو چار آنے یومیہ بھی شکریہ کے ساتھ قبول کر لیتے تھے۔ لیکن اب جو پوچھا تو دو روپیہ فی یوم کے حساب سے پیشگی دکشنا کا مطالبہ کیا گیا۔ کہنے کو تو دکشنا، لیکن زبردستی اور پیشگی۔ چونکہ گھر سے پہاڑ پر ایک ڈیڑھ ماہ گزارنے کے خیال سے آیا تھا تو لوٹ کر کیسے جاتا۔ چنانچہ دکشنا ادا کر دی گئی۔

اتنے میں یا اس سے زیادہ کرایہ پر اگر ہوٹل میں جگہ مل جاتی تو وہ اور بات تھی وہاں خدمت کے لیے نوکر اور دیگر سہولتیں بھی میسر ہوتی ہیں۔ لیکن اس وقت تو اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ رہا۔

میں یہ بتانا بھول گیا کہ میرے ساتھ میرا چھوٹا بھائی بھی تھا۔

کمرے میں دو کھڑکیاں تھیں ان کھڑکیوں کے سامنے ہم نے اپنی چارپائی بچھا دی۔ ایک نوکر بھی مل گیا۔ باورچی خانے میں اکٹھے دو من کوئلے ڈلوا لیے۔ دو وقت کھانا بھی پکنے لگا۔ خالص گھی ہم اپنے ہمراہ ہی لیتے گئے تھے...... میرا پروگرام یہ تھا کہ دن بھر تو چارپائی پر لیٹے لیٹے پڑھا کرتا۔ شام کو

چار بجے کے قریب سیر کے لیے نکل جاتا۔ کچھ دیر سیر کرنے کے بعد کسی انگریزی سینما میں کوئی پکچر دیکھ لیتا۔ بس کم و بیش یہی میرا معمول تھا۔ چھوٹے بھائی کو دو چیزوں کا بہت شوق تھا۔ گھوڑے کی سواری کرنے کا اور سکیٹنگ کا۔ دن کا کچھ وقت پڑھنے میں گزارنے کے بعد وہ سکیٹنگ یا گھوڑ سواری کے لیے چل کھڑا ہوتا۔ کبھی کبھی اگر وہاں دیکھنے کے قابل کوئی پکچر آتی تو ہم دونوں پکچر دیکھنے کے لیے چلے جاتے تھے۔ اس طرح سے ہماری زندگی گزر رہی تھی۔

چونکہ میں دن بھر کمرے ہی میں رہتا تھا۔ اس لیے اگر کبھی پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو پہاڑوں کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے باہر نکل آتا۔ ہمارے کمرے کے آگے بڑھا ہوا چھوٹا سا چھجا بھی تھا۔ میں جنگلے پر ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہو جاتا اور ایک دوسرے کے پیچھے لپکنے والے بادلوں کا تماشا دیکھا کرتا۔ ہمارے کمرے کے ساتھ ہی ایک اور چھوٹا سا کمرا تھا۔ وہاں پر ایک لمبی داڑھی والا سکھ رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دو شخص اور بھی آن رہتے تھے۔ ہمارے کمرے کے آگے ایک بڑا برآمدہ تھا۔ چند کوٹھڑیاں بھی تھیں۔ اس برآمدے میں گوردوارے کا باورچی خانہ تھا۔

ہمارے کمرے سے اوپر والی منزل پر بھی متعدد کمرے بنے ہوئے تھے اور نیچے کی منزل پر بھی کمرے تھے۔ یعنی ہمارا کمرہ درمیانی منزل پر تھا۔

جب میں اپنے کمرے کے آگے چھجے پر کھڑا ہوتا تھا تو مجھے اِدھر اُدھر کی باتیں سننے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ گورو کا لنگر (کچن) محض باورچی خانہ ہی نہیں تھا بلکہ اسے گوردوارے کا دارالعوام بھی کہہ لیجیے یا کلب گھر، بس دونوں کا کام دیتا تھا۔ غالباً اسی جگہ میں نے پہلے پہل دو تین مرتبہ سورما سنگھ کا نام سنا تھا۔

جس طرح مسلمانوں میں اندھے شخص کو حافظ جی کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے اور ہندوؤں میں سورداس جی کہہ کر اسی طرح سکھوں میں اسے سورما سنگھ کہتے ہیں۔

یوں تو سورما کے معنی بہادر کے ہوتے ہیں اور بہادر شخص کی بابت انسان یہی تصور کر سکتا ہے کہ وہ ایک مضبوط، طاقتور اور بارعب شخص ہوگا۔ اسی طرح جیسے سورما سنگھ نام کی وجہ نہ معلوم ہو تو وہ کسی گرانڈیل سکھ کا تصور ہی باندھے گا لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ سورما سنگھ ایک چھوٹے

سے قد اور اکہرے بدن کا شخص تھا۔ اس کے چہرے پر چیچک کے بہت گہرے گہرے داغ تھے۔ اس کی آنکھوں میں سفیدی ہی سفیدی تھی۔ پتلیاں تقریباً غائب تھیں۔ اس کا منہ ذرا سا کھلا رہتا تھا۔ اس کے بالوں کا بڑا سا جوڑا بھی اونٹ کے کوہان کی طرح پگڑی میں سے اٹھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ سر کے پیچھے گدی کے قریب کے بال اس کے سمٹتے نہیں تھے اور اس کی پگڑی میں سے نکل الٹ کر گردن پر گرے رہتے تھے۔ وہ منہ اوپر کو اٹھائے ہوئے چلتا تھا۔

وہ غریب تھا، محتاج تھا، بیکار تھا اور شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ غیر شادی شدہ تھا۔

وہ کچھ عرصے سے مستقل طور پر گوردوارے میں رہتا تھا۔ اس کی رہائش کے لیے کوئی کوٹھڑی مخصوص تو نہ تھی۔ جہاں جگہ ملتی پڑ رہتا۔ کسی بر آمدے میں یا اجازت ملنے پر کسی مسافر کے کمرے میں، یا پھر ہال کمرے میں، اسے دو وقت چائے اور کھانا لنگر سے مفت ملتا تھا، وہ دن بھر ہاتھ میں ایک ٹیڑھی ترچھی لکڑی لیے گھوما کرتا۔ میں نے اسے بازاروں میں آتے جاتے بھی دیکھا تھا۔ پہاڑوں پر سائیکلیں، موٹریں، تانگے تو خیر ہوتے ہی نہیں۔ پھر بھی گھوڑوں، رکشاؤں اور پیدل چلنے والوں ہی کی کافی بھیڑ ہوتی ہے۔ لیکن وہ ان سب باتوں سے بے پروا بڑی تیزی سے چلتا تھا۔ جیسے وہ سب پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہ نابینا نہیں ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دور سے اسے چلتا دیکھیے تو کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آتی تھی...... اس طرح وہ تین چار مرتبہ خطرناک حادثوں سے بال بال بچ چکا تھا۔ لوگ اسے منع بھی کرتے تھے لیکن جواب میں اس کے ہونٹوں کے گوشوں کی لکیریں اور بھی زیادہ گہری ہوتی تھیں۔

ایک روز شام کے وقت سارا دن پڑھنے کے بعد میں تھکا ماندہ سیر کرنے کی غرض سے باہر نکلا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ بارش نے آن لیا۔ میرے پاس چھتری موجود تھی۔ لیکن بارش کی بوچھار اس قدر تیز تھی کہ میں نے اور آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا۔ چنانچہ لوٹ آیا جب کمرے کے قریب پہنچا تو دیکھا سورماسنگھ میرے دروازے کے آگے والے جنگلے کے قریب کھڑا ہے۔

اس روز ہم دونوں کی آپس میں پہلی دفعہ گفتگو ہوئی۔ سورماسنگھ میرے پڑوسی سردار صاحب کی آمد کا منتظر تھا۔ چونکہ اس وقت میں بھی تنہا تھا اور سورماسنگھ بھی وہاں کھڑا بارش کی آڑی بوچھار سے بچ نہ سکتا تھا اس لیے میں نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ "باگورو باگورو" کرتا اندر آیا اور

چونکہ میں نے اسے ذرا احترام کے ساتھ بلایا تھا اس لیے اس نے بھی مجھے "چند پند سود مند" سے نوازنا لازمی سمجھا اور پھر اس کے بعد کیف اور وجدان کی مبہم باتیں ہونے لگیں۔ زندگی کی ناپائداری، آتما کی لافانیت، کرموں کے پھل پر اس نے چھوٹا سا لیکچر دیا۔ میں نے بڑے تحمل کے ساتھ سنا، کبیر کے دوہوں اور گورو تیغ بہادر کے شلوکوں کے بعد اس نے ایک شعر گویا کا بھی پڑھا...... اور پھر بلھے شاہ کی تصوف سے لبریز کافیوں پر اتر آیا۔ باہر سے آنے والی بارش کے تراڑوں کی آواز میں اس کی درد بھری صدا بلند ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی آواز میں ایک خاص کرارہ پن اور کسک سی تھی۔ بلھے شاہ کی کافیوں کو سن کر ایک مرتبہ تو مجھ جیسے مادہ پرست شخص پر بھی وجد سا طاری ہو گیا۔ اس وقت میں سوچنے لگا کہ زندگی کی اقدار زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے خواہ بدل کر کچھ سے کچھ ہو جائیں لیکن وجدان کے ایک لمحہ کی لذت سے کیوں کر انکار کیا جا سکتا ہے۔ یہ گمشدگی کی کیفیت سچ مچ حقیقی معلوم ہونے لگی۔ تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اس طرح سورما سنگھ کی دردناک لے نے ایسا سماں باندھ دیا کہ ایک مرتبہ تو میں بھی مارکسی صراطِ مستقیم سے بھٹک گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں دیر تک اس بات پر غور کرتا رہا کہ روحانیت مشرق کی گھٹی میں پڑ چکی ہے۔ آب و ہوا کا اثر کہیے یا اسے ایشیا والوں کے مخصوص مزاج سے تعبیر کیجیے۔ بہر حال دنیا بھر کے سب سے بڑے بڑے نبی اور روحانی رہبر ایشیا نے پیدا کیے اور اس کی تھوڑی سی جھلک مغرب نے بھی دیکھی لیکن انھوں نے اسے یکسر خلافِ مزاج پا کر اسے جھٹک کر پرے پھینک دیا۔ اس طرح بہت دیر تک میرا ذہن فلسفیانہ قلابازیاں کھاتا رہا۔

میرے ساتھ والے کمرے میں جو لمبی داڑھی والے سکھ رہتے تھے۔ وہ خالص پنجابی نہیں تھے۔ ان کا باپ پنجابی تھا اور ماں یو پی کی عورت تھی۔ عین ممکن ہے کہ سائنس کا کوئی ماہر اس کے سر کی بناوٹ اور ناک کی اونچان یا پھیلاؤ سے بتا سکے کہ وہ خالص پنجابی نسل سے نہیں تھا لیکن بظاہر اس میں اور دیگر سکھوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی داڑھی بہت لمبی تھی یعنی تقریباً ناف تک پہنچتی تھی۔ ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ اس لیے داڑھی میں سفید بالوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔

چوڑی پیشانی، چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن کے نیچے تھیلے لٹکتے دکھائی دے رہے تھے۔ موٹے موٹے ہونٹ، بڑا سا پیٹ، سر پر ڈھیلی ڈھالی بے ڈھب پگڑی، گلے میں شیروانی نما عجب بے ڈھنگا کوٹ۔ ان کے حالات سے مجھے زیادہ واقفیت تو حاصل نہیں تھی، بس اس قدر جانتا تھا کہ وہ دن بھر گھوم پھر کر مختلف امراض کی دوائیاں بیچتے تھے۔ اچھے پیسے کماتے تھے اور رات کو بلاناغہ شراب پیتے تھے اور اگر کسی روز بہت بڑی رقم ہاتھ لگ جاتی تو پھر گوردوارے میں کڑاہ پرشاد (حلوا) کرواتے اور اڑوس پڑوس کے لوگوں میں مٹھائی بانٹتے۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں گوردوارے کا لنگر خانہ ایک قسم کا کلیسا گھر بھی تھا۔ بے خانماں غریب لوگوں کو دو تین روز تک کھانا بھی ملتا تھا۔ اس لیے سورما سنگھ کے علاوہ ہر روز نت نئی صورتیں دکھائی دیتی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے لیے سوسائٹی میں کوئی جگہ نہ تھی۔ ہر مذہب او رہر قوم کے ان لوگوں میں صرف ایک بات مشترک تھی وہ یہ کہ وہ سب کے سب بھوکے تھے۔

لنگر کا کل انتظام دو نہنگ سکھوں کے سپرد تھا۔ نہنگ بمعنی مگرمچھ۔ یوں تو سکھ جنگجو قوم ہے، لیکن نہنگ وہ سکھ ہوتے ہیں جو سر پر کفن باندھے پھرتے ہیں۔ وہ عموماً گرہستی کے چکر میں بھی نہیں پھنستے، ضرورت سے زیادہ کوئی شے اپنے پاس نہیں رکھتے۔ ہتھیار بند رہتے ہیں اور ہر دم تیار بر تیار۔ عام طور پر نیلے رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔ سر پر لمبوتری پگڑی جس میں کرشن جی کے سدرشن چکر کی طرح لوہے کے چکر پھنسے ہوتے ہیں۔ گلے میں لوہے کے منکوں کی مالا، یہ موٹے موٹے لوہے کے کڑے، تلواریں، نیزے و دیگر ہتھیاروں سے لدے پھندے رہتے تھے۔ چنانچہ گوردوارے کے لنگر خانے میں بھی اسی قسم کے دو نہنگ سکھ تھے۔ وہ نوجوان تھے اور خوب موٹے تازے اور تانبے کی طرح سرخ تھے۔ میں ان کی پنڈلیوں کے پھیلاؤ اور کلائیوں کی چوڑائی پر رشک کیا کرتا تھا۔

وہ لوگ تقریباً سارا سارا دن لنگر خانے میں بیٹھے رہتے تھے۔ انھیں کھانے پکانے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ شام کے وقت لنگر خانے کی رونق بڑھ جاتی تھی۔ سورما سنگھ سرِ شام ہی بھٹی سے کچھ دور ایک چوکور تختے پر بیٹھ جاتا۔ اگرچہ اس کی کوئی شنوائی نہ تھی۔ لیکن وہ انھیں ہدایتیں کرنے سے کبھی نہ چوکتا تھا۔ دال میں نمک کی اسے ہمیشہ ہی بہت سخت شکایت رہتی تھی۔ دونوں نہنگ سکھ اس سے

چڑتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ان لوگوں کو کھانا پکانے میں کوئی مہارت حاصل نہ تھی۔ وہ لوگ پہاڑوں کے راستے سے ہیم کنڈ جا رہے تھے۔ ہیم کنڈ وہ مقام تھا جہاں گورو گوبند سنگھ جی نے پچھلے جنم میں تپسیا کی تھی۔ لیکن گوردوارے والوں نے انھیں اس جگہ روک لیا۔ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ لوگ واقعی ہیم کنڈ جا رہے تھے یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اب وہ اگر ذرا بھی بگڑتے تو بس فوراً ہیم کنڈ چلے جانے کی دھمکی دیتے۔ چونکہ گوردوارے والوں کے پاس اس وقت اور کوئی آدمی تھا نہیں اس لیے ان کے مطالبات مان لیے جاتے تھے۔

اس لحاظ سے دونوں نہنگ واقعی بڑے لاڈلے تھے لیکن سورما سنگھ انھیں ٹوکنے سے کبھی نہیں چوکتا تھا۔ اس پر وہ طیش میں آکر کہتے۔ "ابے یہاں تیری لگائی بیٹھی ہے روٹی پکانے کو۔"

اس پر کئی آدمیوں کے دانت نکل آتے۔ اِدھر اُدھر پتھریلی زمین پر بیٹھے ہوئے غریب لوگ بڑی دیگ پر نگاہیں جمائے نہنگ سنگھوں کی ہر بات پر اظہارِ خوشنودی کرتے اور پھر اِدھر اُدھر منڈلانے والے کتوں کو دھتکارنے لگتے۔

نہنگ سنگھوں کی زبان سے لگائی کا طعنہ سن کر دفعتاً سورما سنگھ کے چہرے پر روحانیت کا نور جھلکنے لگتا، کہتا "میں کسی عورت سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتا......"

"ہو، ہو۔" ایک نہنگ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہتا۔ "تو بات کرنا پسند نہیں کرتا یا عورتیں تجھ سے بات کرنا پسند نہیں کرتیں......"

وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات سن کر عموماً اس کے کان سرخ ہو جایا کرتے تھے۔ اور وہ بڑی بے اعتنائی سے ہاتھ کی مٹھی پر رخسار رکھ کر منہ پھیر لیتا اور نہنگ سنگھ بھی بس کتھا ہی چھیڑ دیتا۔ حاضرین سے مخاطب ہو کر کہتا۔ "اجی سورما سنگھ اس معاملے میں بڑا گھاگ ہے۔ اگر میرے کہنے کا یقین نہ ہو تو دیر سویر آکر چپکے سے دیکھو کہ بھلا سورما سنگھ کیا کر رہے ہیں۔ اب یہاں صحن میں عورتیں دھوپ کھانے کے لیے بیٹھ جاتی ہیں تو یہ بھی سٹک کر ان کے قریب جا بیٹھتا ہے۔ اسے عورتوں کی باتیں سننے کا بڑا شوق ہے۔ کیوں سورما سنگھ آخر تجھے عورتوں کی باتوں میں کیا لطف آتا ہے...... صحن کے پرلے کونے کی طرف سورما سنگھ مہاراج کی خاص نگاہ رہتی ہے۔ وہاں عورتیں

کپڑے وپڑے دھونے کے لیے بیٹھی ہوتی ہیں۔ ایسے موقعہ پر وہ آدھی ننگی ہی ہوتی ہیں تو بس یہ بھی ان کے قریب منڈلاتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی سے چھو جاتے ہیں۔ کبھی کسی پر گر پڑتے ہیں۔ دھنیہ ہو مہاراج دھنیہ ہو!!"

یہ کہہ کر وہ دونوں ہاتھ جوڑ نمسکار کرنے لگتے۔ دوسرا نہنگ سنگھ کہتا...... "جی پرسوں ہی کی بات تو ہے۔ وہ بجن سنگھ کے گھر سے ہے نا بھئی۔ وہ خوب موٹی تازی طرحدار عورت ہے۔ وہ بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ ہمارے سورما وہاں سے پانی لینے کے بہانے سے گئے اور جان بوجھ کر پھسلے اور عین عورت پر کچھ بے ڈھب طریقے سے گرے کہ بس اٹھنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ وہ عورت بھی ایک لڑاکا ہی ہے۔ اس نے سردار سورما سنگھ کی پگڑی اتار کر جوڑا پکڑ لیا اور کھینچتی غسل خانے سے باہر لے آئی اور ان کی چندیا پر تین چار سلیپر جو دیے تو ہوش ٹھکانے آگئے۔ اتنے میں عورت کا خصم بھی پہنچ گیا۔ وہ ٹھہرا خونی آدمی۔ وہ تو انھیں پرلوک کا سیدھا ٹکٹ لے دیتا۔ لیکن لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا...... پچ پچ سورما سنگھ بھئی ذرا پگڑی تو اتار دیکھیں کتنے بال باقی بچے ہیں۔"

اس پر فلک شگاف قہقہے بلند ہوتے اور سورما سنگھ بری طرح کھسیا جاتا۔ اس کا چہرہ سرخ سے سرخ تر ہو جاتا۔

حاضرین میں سے کوئی مسکین آواز میں کہتا۔ "جی آنکھوں سے اندھا ہے اسے کچھ دکھائی تو دیتا نہیں عورت اس کے سامنے الف ننگی بھی کھڑی ہو جائے تو کیا......؟"

یہ بات کہنے سے مقصد سورما سنگھ کی طرفداری نہیں بلکہ نہنگ سکھوں کو گرمانا ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ بڑے رازدارانہ لہجے میں کہتے۔ "اجی نہیں۔ یہ آواز ہی آواز میں سارا مزا لے جاتے ہیں...... یہ عورت کی آواز سے اس کی صورت، اس کے جوبن کے ابھار وغیرہ سب چیزوں کا اندازہ لگا لیتے ہیں......"

اس طرح نہنگ سنگھ اس کی خوب مٹی پلید کرتے تھے اور وہ بھی جہاں تک ہو سکتا ان کے خلاف زہر اگلتا تھا۔ چنانچہ ایک رات گیارہ بجے کے قریب دفعتاً مجھے ایک مہیب چیخ کی آواز آئی۔ میں سویا ہوا تھا۔ یکایک آنکھ کھل گئی۔ اس کے بعد پھر ذبح ہوتے ہوئے جانور کی سی آواز فضا کو چیرتی ہوئی

نکل گئی۔ میں فوراً اٹھا...... "لوگو بچاؤ...... میں مر گیا...... مجھے مار ڈالا......"

میں نے ٹارچ ہاتھ میں لی۔ ایک نہنگ نیچے کے کمرے میں سے جھپٹ کر باہر نکلتا اور پھر چشم زدن میں تاریکی میں غائب ہوتا ہوا دکھائی دیا۔

رات کی خاموشی میں چیخوں کی آواز سن کر اور بھی کئی لوگ جمع ہو گئے...... کمرے کے اندر سے سورما سنگھ کو باہر نکالا گیا اور پھر اسے اوپر بجلی کی روشنی میں لے آئے۔ اگرچہ اس کے لیے ہر طرف تاریکی تھی۔ وہ ڈرا ہوا تھا۔ اسے اب بھی اس بات کا خوف تھا کہ کوئی اسے مار نہ ڈالے۔ اس پر سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ رات کی تاریکی میں ایک نہنگ سنگھ نے اسے کمرے میں جا دبوچا اور اس کا ٹینٹوا دبا کر اسے جان سے مار ڈالنے کی کوشش کی۔ اس پر نہنگ سنگھ کو بلایا گیا۔ اب تک کوٹھڑی میں چھپے رہنے ہی سے ثابت تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ نہنگ سنگھ نے کہا وہ اسے روٹی دینے گیا تھا۔ اس پر کسی نے کہا صاحب یہ سورما سنگھ واقعی انھیں بہت تنگ کرتا ہے۔ بچارے سارا سارا دن گوردوارے کی سیوا کریں اور پھر اس لاٹ صاحب کے بچے کو کمرے میں کھانا پہنچا کر آئیں۔ اس پر سورما سنگھ نے کہا کہ لنگر خانے میں وہ سب لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور نہنگ اسے ہمیشہ بہت تنگ کرتے ہیں۔ کبھی اس کی دال میں پیشاب کر دیتے ہیں کبھی روٹیاں جلا پھونک کر اس کے منہ پر دے مارتے ہیں۔ اب جو نہنگ سنگھ مجھے روٹی دینے کے لیے گیا تو کہنے لگا۔ "ابے حرام زادے، حرام خور......"

بہت دیر تک ہنگامہ برپا رہا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ گرم گرم باتوں کے بعد اب صلح کی باتیں ہونے لگیں۔ سورما سنگھ خوب گلا پھاڑ پھاڑ کر بلند آواز میں نہنگ سکھوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ آخر گیانی جی نے اسے منع کیا۔ کہنے لگے کہ اس طرح بہت چیخنے سے گلا بیٹھ جائے گا اور پھر دوسرے روز گوردوارے میں وہ شبد نہ گا سکے گا۔

آخر معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

رات کے وقت آٹھ بجے کے قریب ہم سینما دیکھ کر آ رہے تھے۔ راستے میں چھوٹا بھائی تو سکیٹنگ ہال کی طرف چلا گیا اور میں قدم بہ قدم سیر کرتا اور پہاڑوں کے اتار چڑھاؤ پر ٹمٹماتی ہوئی

بتیوں کا تماشہ دیکھتا ہوا نو بجے کے قریب کمرے میں پہنچا۔

دور ہی سے کچھ غیر معمولی شور سنائی دینے لگا تھا۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ آج پڑوس کے سردار جی کے ہاں جشن ہو رہا ہے۔

اپنے کمرے میں آ کر کپڑے بدلے اور تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ خیال تھا کہ جو ناول شروع کیا تھا آج اس کا باقی حصہ بھی پڑھ کر ختم کر ڈالوں گا۔

لیکن بہت جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ آج کچھ پڑھنا نا ممکن ہے۔ پڑوس میں ایسی دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی اور مختلف لوگوں کی بے ڈھنگی ملی جلی آوازوں کے شور میں یکسوئی نا ممکن تھی۔ کتاب سینے پر دھرے میں ذہنی کش مکش میں مبتلا آنکھیں جھپک رہا تھا کہ میرے دروازے پر دھڑاک دھڑاک دستک کی آواز آئی۔

اٹھا، دروازہ کھولا، دیکھا کہ لمبی داڑھی والے سردار جی ہاتھ میں مٹھائی کا دونا لیے کھڑے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ آج انھوں نے مٹھائی تقسیم کی تھی۔ یہ میرا حصہ تھا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور پھر یونہی بات چیت کرتا ہوا آگے بڑھا۔ ان کے دروازے میں جھانک کر دیکھا تو دونوں نہنگ سنگھ، نیز دو تین اور اشخاص کے علاوہ وہاں سورما سنگھ بھی براجمان تھے...... آج سب نے پی رکھی تھی۔ صراحی جھوم رہی تھی اور پیمانہ وجد میں آیا ہوا تھا۔

لمبی داڑھی والے سردار صاحب نے داڑھی لہلہاتے ہوئے مجھے محفل میں شمولیت کی دعوت دی۔ لیکن میں نے تماشائی بنا رہنا پسند کیا۔

اس وقت کے سورما سنگھ اور روزمرہ کے سورما سنگھ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ پگڑی سر سے اتر کر اس کی ٹانگوں میں الجھی ہوئی تھی۔ ڈاڑھی کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ سر کے بال کھل کر شانوں پر آن گرے تھے۔ ہوش و حواس بجانہ تھے۔ بیٹھا سانڈ کی طرح ڈکار رہا تھا۔ ہوا میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ اس کی بے نور آنکھوں کے سامنے آج پریاں ناچ رہی تھیں۔ سب لوگ اس کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے اور درمیان میں بیٹھے ہوئے سورما سنگھ نے لہک کر دفعتاً سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "ہائے مار گئی......"

دوسروں نے پوچھا۔ "سچے پادشاہو! کون مار گئی۔"

لیکن سورما سنگھ ہر سوال کے جواب میں حال میں آئے ہوئے بدمست شخص کی طرح جواب دیتا۔ "ہائے مار گئی......"

نہنگ سکھوں نے ازراہِ مذاق ان کی کھوپڑی پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیتے ہوئے کہا۔ "اجی سورما سنگھ واہگورو نام کا جاپ کیجیے...... بلھے شاہ کی کافیاں سنائیے......"

پھر بڑی رقت انگیز آواز میں وہ بلھے شاہ کی تصوف سے لبریز کافیاں سنانے لگا۔ اس کی آواز میں سوز نہ معلوم کس طرح پیدا ہو جاتا تھا۔ آواز میں درد اور لہجے میں افتادگی ایسی کہ اس تاریک اور غلیظ کمرے میں بیٹھے ہوئے بدمست شرابی سر دھننے لگے...... اور پھر گاتے گاتے سورما سنگھ کی آواز بھرا گئی۔ اور وہ پھوٹ کر رونے لگا۔

چراغ کی لو ٹمٹما رہی تھی۔

...

رم جھم مینہ برسنے کے بعد بارش رک گئی لیکن ابھی بادل چھائے ہوئے تھے۔ فضا بوجھل تھی۔ دو بجے کا وقت تھا۔ اخبار ایک تو یونہی دیر سے آتا تھا۔ دوسرے اس روز مسلسل بارش کی وجہ سے اور بھی دیر سے ملا۔ میں جلدی جلدی سرخیوں پر نظر دوڑا رہا تھا کہ مختلف آوازوں سے ایک مرتبہ پھر گوردوارے کی فضا میں ہل چل پیدا ہو گئی۔

گرم چادر لپیٹتے ہوئے کمرے میں سے باہر نکلا تو عین ہمارے کمرے کے نیچے واویلا مچا ہوا تھا۔ نیچے اترا، معلوم ہوا وہی سورما سنگھ کے سلسلے میں کوئی جھگڑا ہو رہا تھا۔ گیانی جی بھی کھڑے تھے۔

معلوم ہوا کہ اس کمرے میں دو تین روز سے چند مسافر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک شادی شدہ نوجوان عورت تھی، ایک اس کا بڑا بھائی اور ایک چھوٹی سی بہن اور والدین۔ گوردوارے کے باقی کمرے رُکے ہوئے تھے۔ اس لیے اس چھوٹے سے کنبے نے سورما سنگھ کو اپنے کمرے کے اندر گوشے میں بنی ہوئی چھوٹی سی کوٹھڑی میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ انھوں نے اس پر رحم کھایا اور اس نے......

جب میں وہاں پہنچا تو اس وقت کا منظر یہ تھا کہ نوجوان عورت کا باپ تو گھر پر نہ تھا۔ باقی لوگ بڑبڑا رہے تھے اور بڑا بھائی سورما سنگھ کے چپت لگا رہا تھا۔

اصل واقعہ یوں پیش آیا کہ عام طور پر سورما سنگھ اپنی کوٹھڑی میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھا رہتا تھا۔ لیکن بعض اوقات کوئی نہ کوئی قابلِ اعتراض حرکت کر دیتا۔

اس روز جب کہ عورت کا بھائی بھی بازار گیا ہوا تھا، ماں باورچی خانے میں تھی تو سورما سنگھ نے عورت سے دریافت کیا۔ "اجی بھلا آپ کی اس وقت عمر کیا ہوگی۔"

اسی بات پر جھگڑا ہوا۔ بھائی بازار سے آیا۔ یہ بات سنی تو سورما سنگھ کے منہ پر طمانچے مارنے لگا۔ میرے سامنے بھی اس نے دو تین چپت رسید کیے۔

سورما سنگھ کی پگڑی اتر کر اس کے گلے کا ہار ہو رہی تھی۔ گال مارے طمانچوں کے دہک رہے تھے۔ اور مسوڑھوں میں سے خون نکل آیا تھا۔

......اور وہ عورت!...... وہ عورت کیا تھی۔ گلاب جامن تھی۔ خوب موٹی تازی، صحت ور، گندم گوں رنگ، گول چہرے کے نقوش عام سہی لیکن مدھ بھری آنکھیں سنی تو تھیں لیکن دیکھنے کا اتفاق اسی دن ہوا...... اور جب اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو اس کی آواز کے ترنم سے کمرہ گونج اٹھا۔ میں نے ایک لمحہ کے لیے آنکھیں موند کر اس کی آواز کو سنا...... واقعی ایسی دل کش آواز والی عورت کی عمر جاننے کا کسے اشتیاق نہ ہوگا۔

عورت کی ماں نے چلا کر کہا۔ "کلموہے، مشٹنڈے، تجھے شرم نہ آئی، ہم نے سورما سنگھ سمجھ کر تجھ پر رحم کھایا اور رہنے کی اجازت دی......"

اس پر عورت کے بھائی نے ایک اور چپت رسید کی۔

پلنگ پر بیٹھی ہوئی نوجوان عورت بازو اٹھا کر اپنے رنگ دار جوڑے کو انگلیوں سے گھما پھرا کر درست کرنے لگی۔

سورما سنگھ مار کھانے میں بہت ماہر تھا۔ اس نے رقت انگیز آواز میں کہا۔ "ماتا جی...... میں نے یونہی پوچھا تھا......"

ماتا جی نے چمک کر کہا۔ "نگوڑے اب باتیں بناتا ہے۔ اگر سردار جی یہاں ہوتے تو تیری کھال کھینچ دیتے......"

اس پر سور ما سنگھ اچک کر نوجوان عورت کے قریب جا پہنچا۔ اور ٹٹول کر اس کے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور اپنی پیشانی ان پر رکھ دی۔

نوجوان عورت کے بھائی نے اسے جوڑے سے پکڑ کر پرے دھکیل دیا۔ وہ سب لوگ مارے غضب کے لال پیلے ہو رہے تھے۔ لیکن وہ نوجوان عورت جو نئی شادی شدہ دکھائی دیتی تھی۔ بالکل مطمئن بیٹھی تھی۔ اس کے انداز سے عجب بے اعتنائی ٹپکتی تھی۔ نہ وہ خفا تھی، نہ خوش۔ اس دوران میں بڑے ٹھسے سے پلنگ سے پاؤں نیچے لٹکائے بیٹھی رہی۔

گیانی جی کو بہت کم غصہ آیا کرتا تھا۔ وہ عجب ڈھیلے ڈھالے سرد مزاج اور ملائم قسم کے شخص تھے۔ لیکن عورت کے پاؤں چھونے پر انھیں بھی جیسے کوئی چبھن سی محسوس ہوئی ہو۔ "سُور، پاجی، کمینے......ایں؟"

رفتہ رفتہ گالیاں دے دے کر اور مار مار کر سب لوگ تھک سے گئے آخر میں ایک مرتبہ پھر سور ما سنگھ نے عورت کے پاؤں پکڑ لیے اور انھیں بڑی نرمی سے سہلاتے ہوئے اپنا گرم گرم رخسار اس پر رکھ دیا۔

اس وقت وہ ایک پالتو جانور کی طرح دکھائی دیتا تھا...... اس نے بلھے شاہ کی کافیوں کی سی رقت انگیز آواز میں چند مبہم الفاظ کہے۔ عورتیں رحم دل ہوتی ہیں...... چنانچہ جب اس کا بھائی ایک مرتبہ سور ما سنگھ کی طرف جھپٹا تو وہ بولی۔ "رہنے دیجیے بھائی صاحب! اور مت ماریے...... بچارا سور ما سنگھ ہے۔"

اس کے بعد نوجوان عورت نے بلا پاؤں پیچھے ہٹائے ہوئے شیریں آواز اور خالص پنجابی لہجے میں کہا۔ "ہٹ وے، پرے ہٹ۔"

# کالی تتری

کالی تتری چڑی وچ بولے
تے اُڈ دی نوں باج پے گیا

بڑے مزے میں مولا نے چلم میں تمباکو اور اس کے اوپر سلگتے ہوئے اپلے کے دو ٹکڑے جما دیے، اور پھر مارے سردی کے دانت کٹکٹاتا ہوا چارپائی پر چڑھ ٹانگوں پر دُھسہ گمن ہو گیا۔

روٹی کھانے کے بعد اسے حقے کی سخت طلب ہوتی تھی۔ چنانچہ اس نے آنکھیں موند کر دو چار کش ہی لیے ہوں گے کہ دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ یہ دستک اسے بڑی ناگوار گزری۔ اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

جواب میں پھر کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔

پیرواٹھا...... چھوٹا سا گاؤں تھا۔ عین اس کے سرے پر مولا کا کچا مکان تھی۔ جہاں وہ اپنی بوڑھی ماں اور ایک بیوہ بہن سمیت رہتا تھا۔ گاؤں میں گھستے وقت چونکہ اس کا مکان سامنے پڑتا تھا، اس لیے راہگیر اسی سے کسی مکان کا پتہ یا کسی اگلے گاؤں کا راستہ دریافت کرنے کے لیے دروازہ آن کھٹکھٹاتے تھے۔ لیکن اس وقت آدھی رات ہونے کو تھی اور پھر سردیوں کے موسم میں تو سرِ شام

ہی گاؤں پر خاموشی کا تسلط ہو جاتا تھا۔ نہ جانے بے وقت کون آن دھمکا تھا۔ جب مولا کو یقین ہو گیا کہ اسے اٹھنا پڑے گا تو اس نے حقے کی نے ایک جانب ہٹائی اور دھسے کو سنبھالتا ہوا دروازے کی جانب بڑھا۔

دروازہ کھولا تو دیکھا کہ باہر تاریکی میں میانے قد کا ایک سکھ کھڑا ہے۔ پگڑی اس کے سر پر موٹے رسے کی طرح لپٹی ہوئی تھی اور اس کے ایک سرے سے اس نے اپنے چہرے کا آنکھوں کے سوا نچلا حصہ چھپا رکھا تھا۔ اس کا رنگ سیاہی مائل گندمی تھا، بھنویں موٹی، گھنی اور لمبی تھیں...... آنکھیں تیز اور متجسس۔ اس کی ناک کی جڑ کے قریب آنکھوں کے نیچے باریک اور گہری لکیروں کا جال سا بنا ہوا تھا۔

مولا بد کلامی کرتے کرتے رک گیا۔ اس نے بھاری اور خشک لہجے میں پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

اجنبی نے لحہ بھر اس کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر غصہ سے بولا۔

"میں بھنبھوڑی گاؤں سے آ رہا ہوں۔"

"بھنبھوڑی! اوہ تو یہاں سے بیس کوس کی دوری پر ہے۔ لیکن تم یوں بات کرتے ہو جیسے پڑوس کے گاؤں سے آ رہے ہو......"

اجنبی نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"میں ڈاچی پر آیا ہوں......"

مولا کو اس کے بولنے کا ڈھنگ پسند نہیں آیا۔ اس نے بے پروائی سے کہا۔ "خیر مجھے اس سے کیا غرض۔ سوال تو یہ ہے کہ تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

"مجھے بگا سنگھ بھنبھوڑی والے نے بھیجا ہے۔"

یہ سن کر مولا چوکنا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نووارد کا بازو تھام لیا اور جلدی سے دھیمی آواز میں بولا۔

"...... تو یہاں کھڑے ہو کر کیا کر رہے ہو، اندر چلے آؤ نا۔"

اجنبی بہ یک جست اندر آ گیا۔ وہ بڑا مضبوط شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بدن پر موٹا کھیس لپیٹ رکھا تھا۔

مولا نے ڈیوڑھی میں سے جھانک کر اندر کی جانب دیکھا اور اس امر کا اطمینان کر لیا کہ اس کی بہن اور ماں سب سے پیچھے والے کمرے میں لحافوں میں گھسی پڑی ہیں تو اس نے صحن والا دروازہ بند کر لیا اور اجنبی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"میں نے دروازہ بند کر دیا ہے۔ تا کہ ہماری باتوں کی آوازیں اندر تک نہ پہنچیں۔"

اجنبی کچھ نہیں بولا۔ مولا نے تیزی سے باہر والے دروازے میں سے جھانک کر ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ پھیکی چاندنی میں دور جوہڑ کا پانی پگھلے ہوئے سیسے کی ٹکلی کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔ ہوا ساکن تھی۔ پیڑ اور دور دور تک پھیلی ہوئی جھاڑیاں بے حس و حرکت کھڑی تھیں۔ یہ دیکھ کر مولا نے اپنے دانتوں میں اٹکی ہوئی حقے کی نے کو ہونٹوں میں دبوچ کر بڑے اطمینان سے گڑ گڑ کی آواز بلند کی اور پھر دروازہ بند کر کے لوٹا۔ نو وارد ڈیوڑھی میں اندر بنی ہوئی کھرلی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

"بھوک لگی ہو تو بتاؤ کھانے وانے کچھ بندوبست کروں۔"

"نہیں میں کھانا کھا کر آیا ہوں قریب کے گاؤں سے...... بس اب کام ہو جانا چاہیے۔"

"کیوں اتی جلدی بھی کیا ہے؟"

"مجھے پھورن لوٹنا ہو گا۔"

"کیوں؟"

"تجھے نے یہی کہا تھا۔ میرا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ کسی نے دیکھ لیا تو سک ہو گا کھاہ مکھاہ۔"

"ڈاچی کہاں ہے؟"

"ڈاچی ساتھ والے گاؤں میں اپنے ایک دوست کے ہاں چھوڑ آیا ہوں۔"

"اور بندوکھ (بندوق)؟"

"بندوکھ میرے پاس ہے"

مولا کو تعجب ہوا کہ اتی بڑی بندوق اس نے کہاں چھپا رکھی ہے۔

اس پر اجنبی نے قدرے جھنجھلا کر کھیس کے نیچے سے دونالی بندوق دکھائی جس کی دونوں

نالیاں الگ کر کے اس نے بٹ سمیت انگوچھے میں لپیٹ رکھی تھی۔ اور پھر ان پر ایک رسی کس کر باندھ رکھی تھی۔

اب مولا سمجھا۔ سر ہلا کر بولا۔

"اچھا توڑ کر باندھ رکھی ہے۔"

"ہاں ویسے چھپ تو نہیں سکتی نا۔"

"ٹھیک"

"اب جلدی کرو۔"

"اور کارتوس؟"

اجنبی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ بگڑ کر کہنے لگا۔

"دیکھو میں بالکل تیار ہو کر آیا ہوں...... بس اب مجھے موکے پر لے چلو۔"

"اچھی بات ہے۔" یہ کہہ کر مولا نے حقے کے دو تین خوب گہرے گہرے کش لیے۔ پھر دھسے کو بدن پر خوب اچھی طرح لپیٹا اور مسکرا کر بولا۔

"استاد تمہیں میرے گھر کا پتہ کیسے چلا؟ کسی سے پوچھا تھا کیا؟"

"میں ایسا کچا نہیں ہوں کہ کسی سے تمہارے گھر کا پتہ پوچھتا پھروں۔ اس طرح تو تم پر شبہ کیا جا سکتا تھا۔ بگے نے مکان کا ٹھیک پتہ اور تمہارا حلیہ بتا دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ تمہاری راہ دیکھتا ہو گا۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" مولا ہنس کر بولا...... "بگو اس کام کو کسی مامولی آدمی کے سپرد نہیں کر سکتا تھا...... اچھا تو لو میں چلا...... ابھی دو تین اور آدمیوں کو بھی بلانا ہے۔

"بلا لاؤ...... پر میں ان کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔"

"بے شک بے شک جرورت بھی کیا ہے؟"

یہ کہہ کر مولا چلنے لگا تو اجنبی بولا...... "حکا لیتے جاؤ۔"

"کیوں؟"

"حکا گڑگڑاتے چلو گے تو سک نہیں ہو گا، دیکھنے والوں کو۔"

"یہ تو واقعی کھری بات کہی تم نے۔"

مولا نے حقہ اٹھایا۔ نے دانتوں میں دبائی اور چلم سے بندھی ہوئی چمٹی جھلاتا اور تہمد لہراتا ڈیوڑھی سے باہر نکل گیا۔

اجنبی نے اس کے رخصت ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا اور سرکنڈوں کا بنا ہوا بالشت بھر اونچا موڑھا گھسیٹ کر سلگتے اپلوں سے بھری ہوئی مٹی کی انگیٹھی دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھ کر بیٹھ گیا۔

مولا کینچوؤں کی طرح بل کھاتی ہوئی سنسان اور تنگ گلیوں میں سے گزرتا ہوا بالآخر ایک بوسیدہ کچے مکان کے آگے کھڑا ہو کر آوازیں دینے لگا: "سُداگرا! اوئے سُداگرا!!"

کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے پھر ہانک لگائی

"اوئے سُداگرا! سُداگرا ہوئے!"

پھر وہ اطمینان سے حقہ گڑگڑانے لگا۔ دماغ میں جو طراوت پہنچی تو دل اجنبی کو دعائیں دینے لگا۔ جس نے کہ حقہ اس کے ہمراہ بھجوا دیا تھا۔

مکان کا دروازہ کھلا اندر سے گھنے اور کالے بالوں والا ایک نوجوان نکلا۔ پہلے تو اس نے مولا کی جانب خواب ناک آنکھوں سے دیکھا لیکن جب پہچانا تو اس کی آنکھیں پورے طور سے کھل گئیں۔

مولا نے زرد زرد دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ "واجیں دے دے کے میرا تو گلا بھی بیٹھ گیا۔ کہاں گھسا پڑا تھالاں کے موڑے۔"

اس پر دونوں ہنسنے لگے۔

سداگر نے پوچھا: "ہاں بے بتا۔"

جواب میں مولا چپ چاپ حقہ گڑگڑاتا رہا۔ پھر اس نے شرارت اور پر معنی انداز سے ابرو اوپر اٹھا کر ایک آنکھ اس طرح ماری جیسے ڈھیلا کھینچ کر مار دیا ہو۔

سُداگر سمجھ گیا۔

"چلو" مولا نے کہا۔

"ٹھہرو۔ میں اوڑھنے کے لیے تو کچھ لے آؤں اندر سے۔"

وہ بھاگا اندر گیا اور کالے رنگ کی ایک لوئی بدن پر لپیٹتا ہوا فوراً واپس آ گیا۔ دونوں وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ گاؤں پر ہو کا عالم طاری تھا۔ کہیں کہیں کوئی کھجلی ماری کتیا دانت دکھاتی ہوئی دُکان کے ایک تختے سے نکل کر دوسرے تختے تلے دبک جاتی۔ یا گارے سے بنے ہوئے کچے مکانوں کی دیواروں تلے چھچھوندریں جان چھپاتی پھرتی تھیں۔

دبے دبے لہجے میں باتیں کرتے ہوئے دونوں بڑھتے چلے گئے۔ انھوں نے میلا سنگھ کو اس کے مکان سے اور لبھو کو مویشیوں کے طویلے سے بلا کر اپنے ہمراہ لیا اور واپس مولا کے مکان پر پہنچ گئے۔ اندر سے اجنبی نے دروازہ کھولا۔ اس کا چہرہ اب پگڑی کے شملے میں چھپا ہوا تھا۔ سدا گر، لبھو اور میلا سنگھ ابھی جوان تھے۔ ان کاموں میں نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ اجنبی کا نقاب کے پیچھے چھپا ہوا چہرہ اور جن کے مانند گھنی بھنوؤں تلے اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ان کے نوخیز جسموں میں سنسنی کی لہریں دوڑ گئیں۔

اجنبی نے جلدی سے ان کی صورتوں کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے کھیس میں سے ہاتھ نکال کر اشارہ کیا کہ اب دیر کس بات کی ہے؟

اس کا ہاتھ بھی کالا تھا۔ اس پر موٹے موٹے بال اُگے ہوئے تھے۔

مولا نے جواب دیا۔

"دیر کسی بھی بات کی نہیں۔"

"تو اب چلیں۔"

"ضرور۔"

مولا نے آگے قدم بڑھایا اور باقی سب اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ اجنبی کے قدم بڑی پھرتی سے اٹھ رہے تھے اور اس کی پتلیاں دم بھر کو بھی ایک جگہ نہیں رکتی تھیں۔ تسبیح کے دانوں کی طرح کھٹا کھٹ گھومتی تھیں۔

دور سے کبھی کبھار پہرے دار کی دفعتاً چلانے کی آوازیں یوں سنائی دے جاتی جیسے وہ کوئی خوف ناک خواب دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھا ہو۔ اس آواز اور اپنے درمیان کا فاصلہ رکھتے ہوئے وہ بڑی تیزی سے

بڑھے چلے جارہے تھے۔

گاؤں سے نکل کر تقریباً پون میل کی دوری پر واقع پیراں والے رہٹ پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ مولا کے اشارے پر سداگر نے رہٹ کے قریب والے باڑے میں گھس کر ایک مریل بیل کو باہر نکالا اور پھر وہ اسے ہانکتے ہوئے ذرا پرے لے گئے اور گاؤں کے ایک بڑے سود خور کے کھیت میں اسے چھوڑ دیا اور وہ خود ببول کے پیڑ کی چھدری چھاؤں تلے جا کھڑے ہوئے۔

پورا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔

اجنبی سکھ نے اپنی بغل میں سے بندوق کا انجر پنجر نکالا۔ نالیوں کو بٹ سے کڑک کیا اور نیچے کی جانب چوبی پچھی جمائی اور ہتھیلی کی ایک ہی ضرب سے اسے اپنی جگہ پر بٹھا دیا۔

پھر اس نے دونوں نالیوں میں ٹھوس گولیوں والے کارتوس بھرے اور ایک نظر مریل بیل کی جانب دیکھا جو سرد ہوا میں کان پھڑ پھڑاتا اور پتلی اور کمزور دُم کو نقاہت سے ہلاتا گھاس پر منہ مار رہا تھا۔ پھر اس نے شست باندھ کر لبلبی دبائی۔ گولی کھاتے ہی بیل بغیر کسی جدوجہد کے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ یہ گولی تو شیر کو ٹھنڈا کر دینے کے لیے کافی تھی، لیکن اجنبی نے احتیاط کے طور پر دوسری گولی بھی اس کی گردن پر چپکا دی۔

بیل کا کام تمام ہوتے ہی اجنبی نے اپنی اور بھی تیزی سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے مولا اور اس کے ساتھیوں کی جانب دیکھا پھر بھاری آواز میں بولا۔

"اچھا اب مجھے چلنا چاہیے۔ صبح سے پہلے واپس پہنچنا ضروری ہے۔"

مولا نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "اچھی بات۔"

اجنبی نے چاروں سے ہاتھ ملاتے ہوئے ایک بار پھر بھاری آواز میں کہا:

"ساب سلامت!"

"ساب سلامت!"

اجنبی نے پھر اپنی بندوق کو توڑ تاڑ کر اس پر کپڑا لپیٹ دیا اور پھرتی سے قدم اٹھاتا ہوا اقدرے پھیکی چاندنی میں غائب ہو گیا۔

وہ چاروں کچھ دیر تک اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر وہ بیل کی جانب بڑھے۔ اور دیکھا کہ وہ قطعاً مر چکا ہے۔

اب وہ جلد جلد گاؤں کی جانب بڑھے۔ اور گاؤں کے قریب پہنچ کر انھوں نے دفعتاً 'پکڑو پکڑو' کا شور بلند کیا۔

لوگوں کو ڈاکوؤں کا ڈر لگا رہتا تھا۔ چنانچہ بہت بڑی تعداد میں لوگ گھروں سے باہر نکل آئے تب انھیں پتہ چلا کہ بیچارے مولا کا بیل گولی سے مار دیا گیا۔

مولا دیر تک گولی مارنے والے کی ماں اور بہنوں سے اپنا رشتہ گانٹھتا رہا اور جب اس کا گلا بیٹھ گیا تو سورج نکلنے سے پہلے پہلے وہ چھ کوس پرے تھانے میں اس امر کی رپٹ درج کروا کر گاؤں لوٹ آیا۔

(۲)

پیروا ٹھٹھا گاؤں چھوٹا تھا لیکن یہاں کا سب سے امیر گھرانہ "ماہنہ" دُور دُور تک مشہور تھا۔ اردگرد دیہات میں ان کی اسامیاں موجود تھیں۔ اب ماہنوں کا دبدبہ کچھ کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ پیر کے ٹھٹھے اور اردگرد کے دیگر گاؤں کے بدمعاشوں نے مل جل کر خواہ مخواہ مقدمہ بازی میں پھنسا کر انھیں کھوکھلا بنا دیا تھا اور ادھر ان کے لیے مولا نے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی تھی۔

سردیوں کا سورج کچھ زیادہ بلند نہیں ہونے پایا تھا کہ علاقے کے تھانے سے ایک لمبا تڑنگا مسلمان تھانے دار گھوڑے پر بیٹھا اور دو سائیکل سوار سپاہی ساتھ لے کر پیر کے ٹھٹھے میں آن دھمکا۔

گاؤں کے باہر ایک بڑے اور بزرگ پیپل کے پیڑ تلے پہنچ کر تھانے دار گھوڑے پر سے اترا۔ سنہرے کلاہ پر لپٹی ہوئی اس کی خاکی رنگ کی کلف لگی پگڑی کے لہراتے ہوئے شملے دور ہی سے دکھائی دینے لگے۔ چنانچہ گاؤں بھر کے چماروں، بھنگیوں اور کسانوں کے بچے اور کتے گاؤں میں گھستے ہی ان کے پیچھے ہو لیے اور اب وہ ایک بڑا سا حلقہ بنائے کھڑے تھے۔

پیپل کے نیچے بلا کی گرد تھی جس میں سوکھے پتے اور بھوسے کے تنکے ملے ہوئے تھے۔

گھوڑے کی لگام سکھ سپاہی کے ہاتھ میں تھما کر تھانے دار نے دونوں طرف سے وردی کو کھینچ

کر اپنے سڈول بدن پر جمایا، اس کا اونچا قد کلاہ دار پگڑی کے باعث اور بھی اونچا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی دمکتی ہوئی پیشانی خوب کشادہ تھی۔ اور اس کی ناک جڑ ہی سے ایک دم اوپر کو اٹھ گئی تھی۔ اپنی شان دار اونچی ناک کی وجہ سے وہ بڑا باوقار اور بارعب انسان نظر آ رہا تھا۔ ابھی نوجوانی کی ناتجربہ کاری اس کے چہرے سے جھلکتی تھی، لیکن وہ ذہین ضرور تھا۔ اس کے سبز رنگ کی پتلیوں کی وجہ سے بقول دیہاتیوں کے "انگریج" جان پڑتا تھا۔

پہلے اس نے کھلی ہوا میں ٹہل ٹہل کر دو تین گہرے سانس لیے اور پھر جیب ٹٹول کر ایک خاکی رنگ کا کاغذ باہر نکالا اور اس پر بغور نظر دوڑانے لگا۔

اسی اثناء میں گاؤں کے لوگ بھی جمع ہونے شروع ہو گئے۔ اِدھر سکھ سپاہی نے گھوڑے کی لگام پیپل کی جڑ سے باندھ دی۔

کہیں سے نمبردار کو خبر ملی تو وہ بچارا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ جب وہاں پہنچا تو حال یہ کہ دم پھولا ہوا اور پگڑی ٹانگوں میں الجھی ہوئی۔ تھانے دار نے ٹانگیں اکڑا اکڑا کر نظر اوپر اٹھائی اور حلقے میں کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے ایک کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

وہ بچارا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

تھانے دار نے تحکمانہ انداز سے کہا "میں تمہیں کو دیکھ رہا ہوں۔"

"جی مجکو؟" اس آدمی نے اپنے سینے پر انگلی جماتے ہوئے پوچھا اور اثبات میں جواب پاتے ہی اس نے مضحکہ خیز انداز سے آنکھوں کی پتلیاں دائیں بائیں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور پھر پگڑی سنبھالتا ہوا تھانے دار کی جانب بڑھا۔

"تم مولا کا گھر جانتے ہو؟"

"آہو جی اوہ......"

"جاؤ اسے بلا کر لاؤ۔"

وہ آدمی سرپٹ بھاگا لیکن مولا حقہ ہاتھ میں لیے پہلے ہی سے تھہراتا چلا آ رہا تھا۔ تھانے دار سے آنکھیں چار ہوتے ہی اس نے دور ہی سے حقہ زمین پر رکھ دیا اور بڑے غلو سے جھک کر فرشی

سلام کیا اور پھر آگے بڑھا۔

"موتیاں والیو! میں نے دور ہی سے آپ کو دیکھ لیا تھا۔ بس حقہ تازہ کرنے میں دیر ہو گئی۔"

یہ کہہ کر مولا نے بڑے خوشامدانہ انداز سے حقے کی نے اس کے نتھنوں سے بھڑا دی۔

نمبردار آتے ہی چارپائی کا انتظام کرنے کے لیے الٹے پاؤں لوٹ گیا۔ بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نہ پا کر تھانے دار ایک مگدر پر بیٹھنے لگا تو مولا نے بڑھ کر اپنا کھیس بچھا دیا اس پر اور پھر للکار کر کہا.....

"اوئے میادیوا بھج کے میرے گھر سے چارپائی اور بستر لے آؤ۔"

اس کی بات سنتے ہی دو تین آدمی بھاگ نکلے۔

تھانے دار نے پہلے تو چپ چاپ حقے کے خوب گہرے گہرے کش لیے اور پھر مولا کی جانب مخاطب ہوتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ "سنا اوئے بھوتنی پلستر! بات کیا ہے آج چوروں کے گھر مور پڑ گئے؟"

"توبہ! میری توبہ!!" کہتے کہتے مولا وہیں اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ "جبر جستو! جبھی تو کہتے ہیں کہ بد اچھا بدنام بُرا۔"

"ہاں خوب یاد آیا۔" تھانے دار نے سپاہی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "اوئے عجیب سیہنا! جا، جرا رام لال ماہبے تے اوہدے لڑکے کو تو بلا کے لیا۔"

پہلے ہی سے سدھائے ہوئے سداگر نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ دیے اور مسکین آواز میں بولا "کھان صاحب بڑا انرتھ ہو گیا اے جی۔ بچارے مولا کی تاں کمر ہی ٹٹ گئی۔ کسان کو بیل کا بڑا سہارا ہوتا ہے۔"

مولا نے ٹھنڈی سانس بھر کر منہ نیچے کو لٹکا دیا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ رام لعل سفید دھوتی اور اس پر سفید کرتا پہنے آ پہنچا۔ اس کے ساتھ اس کا نرم و نازک بیس سالہ لڑکا ہیرا لعل بھی تھا جو پتلون پہنے تھا۔

تھانے دار نے باپ بیٹے کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ باپ بچارہ ادھیڑ عمر کا سنجیدہ انسان تھا۔ لیکن تھانے دار کو لڑکے کے کھڑے ہونے کے انداز سے بغاوت کی بو آئی تاہم اس نے کافی تحمل سے

پوچھا۔

"ابے لونڈے اپنا نام بتائیو۔"

اس پر پڑھے لکھے لڑکے کو کچھ گرمی آگئی۔ برہم ہو کر انگریزی زبان میں بولا:

"You should not be so rude"

تھانے دار کو انگریزی بس واجبی آتی تھی۔ اس لیے وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "دیکھ اوے منڈیا! ہم سے زیادہ گٹ پٹ نہیں کرنا۔ جو کہنا ہو سو اپنی بولی میں کہو تاکہ سب لوگ تمہارا بیان سمجھ سکیں۔"

نوجوان ذرا تیز مزاج تھا۔ بولا۔ "آپ افسر ہیں۔ آپ کو ذرا تمیز سے بات کرنی چاہیے۔"

یہ غیر متوقع جواب سن کر تھانے دار نے سر اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ اس نے اشارے سے سپاہی کو قریب بلایا اور ہونٹ کاٹ کر بولا۔ "عجیب سینہا! اس منڈے کو تھوڑی تمیز دکھاؤ۔"

عجیب سنگھ کے دو تین جھانپڑ کھا کر نوجوان کے دانت ہل گئے۔ تھانے دار نے اس کے چکنے بالوں کے گچھے کو ہاتھ میں دبوچ کر کہا۔ "بیٹا میں تمہارے ایسے شریف بدمعاشوں کو سیدھے راستے پر لانا خوب جانتا ہوں۔" پھر حاضرین کی جانب متوجہ ہوئے۔ "دیکھو جی ایک غریب کسان کا بیل گولی سے اڑا دیا اور اوپر سے دھونس جماتے ہیں۔ قانون ہمارے ہاتھ میں ہے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دکھانا ہمارا کام ہے۔"

حاضرین میں سے بیشتر نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ تھانے دار غرا کر بولا "اوے مولیا۔"

"جی موتیاں والیو!"

مولا بغل ہی میں سے نکل کر ہاتھ باندھ کر تھانے دار کے روبرو کھڑا ہو گیا۔

"بیل کہاں پر مرا پڑا ہے۔"

"شہنشاہ جی! وہ تو ماتھوں کے کھیت میں ہی مرا پڑا ہے۔ بے چارا قسمت کا مارا باڑے میں سے نکل کر ان کے کھیتوں میں جا نکلا۔ بس اٹھا کے گولی داغ دی انھوں نے۔ بھلا دو ڈنڈے مار کر نکال

دیتے سالے کو۔ غریب کا بیل تو بچ جاتا۔" یہ کہتے کہتے مولا نے رونی صورت بنالی۔

مانہا یہ الزام سن کر سٹپٹا گیا۔ لیکن بیٹے کا حشر دیکھ چکا تھا، اس لیے چپ رہا۔

"ہم مرا ہوا موقع پر دیکھیں گے۔"

"چلو موتیاں والیو!"

اب آگے آگے موتیاں والا۔ ساتھ ساتھ مولا، سُدا گر، لبھو وغیرہ۔ ان کے پیچھے مانہے اور سب کے آخر میں ناک سڑ سڑاتے بچے اور دُمیں ہلاتے ہوئے کتے۔

یہ لشکر کھیت پر کھیت پر پھلانگتا ہوا جب مانہوں کے کھیت میں پہنچا تو دیکھا کہ سردی سے اکڑا ہوا بیل کھیت میں ٹانگیں پسارے پڑا ہے ..... مولا نے احتیاطاً ایک لونڈے کو وہاں بٹھادیا تھا۔ تاکہ گدھ اور کتے مردار کے قریب نہ آئیں۔

خان صاحب (تھانے دار) نے بیل کی اگلی ٹانگوں کے نیچے اور گردن میں لگی ہوئی گولیوں کے نشانات کو بغور دیکھا۔ گاؤں کے تین چار آدمیوں کو بھی دیکھنے کا حکم دیا۔ پھر گاؤں واپس آکر پیپل کی چھاؤں تلے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ اس وقت ان کے لیے مکھن اور لسی کا کٹورا تیار تھا۔

مکھن کا گولہ نگل کر اور اوپر سے لسی چڑھا کر خان صاحب نے باچھیں جھاڑن نما رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں بے مولو! اب بتا سارا قصہ۔ تیرا بیان لکھا جائے گا اب۔"

مولا نے کھانس کر گلا صاف کرتے ہوئے بتانا شروع کیا کہ کیسے پچھلی رات کو وہ اپنے باڑے تک یہ دیکھنے کے لیے گیا کہ وہ لونڈا جو وہاں مویشیوں کی رکھوالی کے لیے مقرر تھا، وہاں موجود بھی تھا یا نہیں کیونکہ اس کمبخت کا ایک چمارن سے یارانہ تھا۔ موقع پا کر راتوں کو ادھر بھی کھسک جایا کرتا تھا۔

"تم اکیلے تھے یا اور بھی کوئی ساتھ تھا۔"

"نہیں جی اکیلا کیتھے۔ میرے نال سُداگر، میلو، اور لبھو بھی تو تھے۔"

"یہ کب سے تمہارے ساتھ تھے؟"

"بادشاہو، یہ تو ہر روج میرے ساتھ ہوتے ہیں، کھانے دانے سے فرصت پاکر کبھی یہ میرے پاس آجاتے ہیں اور کبھی میں ان کے پاس چلا جاتا ہوں، گپ اڑانے کے لیے۔"

"اچھا اچھا پھر کیا ہوا؟"

"پھر شہنشاہ ہو، ابھی ہم باڑے سے دور ہی تھے کہ دھائیں دھائیں دو بار بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔ ہم تو جی ڈر کے مارے کھیتوں میں چھپ گئے......"

"اچھا تو تم ڈر گئے؟" خان صاحب نے پوچھا کیونکہ شکل ہی سے مولا ان آدمیوں میں سے دکھائی دیتا جنھیں ڈر کبھی چھوتا بھی نہیں۔

"آہو جی ہم ڈر گئے؟"

"اچھا پھر؟"

"اتنے میں یہ نکاماہنہ گاؤں کی طرف بھاگتا دکھائی دیا۔ پہلے ہم سمجھے کسی ڈاکو نے اس پر گولی چلائی ہے۔ پر جی اس کے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر ہم گھبرا گئے۔"

"ہوں......" خان صاحب نے اثبات میں یوں سر ہلایا۔ جیسے وہ اس معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے ہوں۔ "پھر؟"

"پھر جی ہم باڑے کی طرف بڑھے۔ راستے میں انھیں کے کھیت پڑتے ہیں۔ وہاں ہمیں سفید سفید چیز دکھائی دی۔ ہم ڈرتے ڈرتے قریب پہنچے تو دیکھا کہ میرا بیل مرا پڑا ہے۔ میں نے تو سر پیٹ لیا اور نجیک سے دیکھا تو گولیوں کے نشان دکھائی دیے۔"

تھانے دار صاحب نے مولو سے متعدد سوالات کیے۔ پھر میلو، سداگر اور لبھو کی جرح کی گئی۔

"اچھا تو سداگر! تم نے اچھی طرح پہچان لیا تھا کہ وہ رام لعل کا بیٹا ہیرا لعل ہی تھا؟"

"ہاں جی۔"

اس طرح سے سب نے الگ الگ اس امر کی تصدیق کی۔ اب خان صاحب پھر ہیرا لعل کی طرف متوجہ ہوئے۔ "دیکھو ہیرا! سچ سچ بتادو کہ آخر بات کیا ہے۔ ورنہ یاد رکھو کہ میں مجرموں کا سخت دشمن ہوں۔ تھانے پہنچ کر دو کانوں میں سر کر دوں گا تمہارا......"

اب تو ہیرا لعل تاؤ میں آنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ابھی پہلی مار ہی سے اس کی ناک جل رہی تھی اور ہونٹوں پر سوجن آگئی تھی۔ اس نے مدھم آواز میں کہا۔ "یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ میں تو کھانا کھا کر گھر سے باہر تک نہیں نکلا۔"

خان صاحب نے اس کے باپ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "لالہ! تمہارا لونڈا ذرا سخت دانہ معلوم

ہو تا ہے۔ لیکن ہمارا کام بھی بھولے بھٹکوں کو راستے پر لانا ہے۔ سمجھالو اپنے بیٹے کو۔ ورنہ ایک بار میں نے ہاتھ اٹھادیا تو یاد رکھو پہچان نہیں پاؤ گے کہ اس کا سر کدھر کو تھا اور منہ کدھر کو۔"

رام لعل مقدمہ بازی سے تنگ آچکا تھا ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "خان صاحب! ابھی لڑکا ہی تو ہے، شاید...... میں بیل کی قیمت دینے کو تیار ہوں۔"

"بیل کی قیمت؟" مولا نے چلا کر کہا۔ گریب کے بیل کی جان ایسی سستی نہیں ہوتی کہ جب جی چاہا مار دیا اور پھر پیسے کی دھونس جمانے لگے۔"

خان صاحب بولے۔ "چپ رہو جی تم۔ بکواس بند کرو۔"

"نہیں بادشاہو! میری کیا مجال ہے۔" مولا ہاتھ جوڑ کر الگ کھڑا ہو گیا۔

"اچھا لالہ اپنی بندوق تو منگواؤ ذرا۔"

بندوق حاضر کی گئی۔

ہیرا بولا۔ "دیکھیے بندوق کی نالی میں گریز لگا کر میں نے الگ رکھ چھوڑی تھی۔"

خان صاحب نے ہیرا کی طرف گھوم کر دیکھا اور زور زور سے سر ہلا کر بولے۔ "سب سمجھتا ہوں یہ گریز تو آج ہی کی لگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

تھوڑی دیر تک بندوق کا معائنہ کیا گیا۔ پھر انھوں نے سپاہی سے کہا۔

"عجیب سینہا! کاغذ لاؤ تو بندوق کی رسید لکھ دوں۔"

اس کے بعد سب کے بیانات مکمل کیے گئے اور پھر تھانیدار نے کہا۔ "بندوق تھانے میں داخل ہو گی بیٹا! ہیرا چلو تھانے۔ پھر دیکھو میں ہیرا کا بیڑا کیسے بناتا ہوں۔"

رام لعل بیٹے کے لیے سخت پریشان تھا۔ ہاتھ باندھ کر بولا۔

"خان صاحب دیا کیجیے۔ میں بیل کی قیمت اور جرمانہ دینے کو تیار ہوں۔"

"یہ تو بعد کی باتیں ہیں...... معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری جیب میں روپے اچھل رہے ہیں لالہ!"

رام لعل نے بہ مشکل تھوک نگلتے ہوئے پوچھا "کیا ضمانت نہیں ہو سکتی؟"

"یہ سب تھانے پہنچ کر طے ہو گا۔"

یہ کہہ کر خان صاحب گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ جب وہ ہیرا کو لے کر چلنے لگے تو رام لعل کی

آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکے نے جوش میں آکر گستاخی کی ہے اس لیے اس کی خیر نہیں۔ کچھ سوچ کر آگے بڑھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا:

"خان صاحب! ایک بات عرض کروں۔"

خان صاحب نے گھوڑا روک لیا۔

"بات یہ ہے کہ مولا کے بیل کو گولی میں نے ماری تھی۔"

خان صاحب نے ہنس کر گھوڑے کو ایڑ دی اور بولے۔ "لالہ! لڑکے کو بچانے کی خاطر جھوٹ بول رہے ہو۔ ذرا گواہوں سے تو پوچھو۔ ہم تو قانون کے بندے ہیں۔"

جب تھانے دار صاحب ان سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے اور بندوق بھی اپنے ساتھ لے گئے تو مولا نے اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں پہنچ کر پہلے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر بھاری آواز میں بولا۔ "یا مولا!" اس کے بعد سداگر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا۔ "دیکھ بے سداگر! ابھی بھسنگڑی پر سوار ہو کر سیدھا بھنبوڑی چلا جا اور بگا سنگھ سے کہہ دے کہ دھائیں بولنے والی چڑیا پنجرے میں بند ہو گئی ہے۔"

(۳)

ابھی سورج ڈھل ہی رہا تھا کہ دفعتاً اس قدر زور کی آندھی اٹھی کہ زمین سے آسمان تک دھواں دھار ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کرۂ زمین کا سینہ پھٹ گیا ہے۔ اردگرد کے بادل در بادل فلک بوس پہاڑوں کے مانند جھوم جھوم کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور اردگرد کا یہ سمندر خس وخاشاک کو اڑاتا، امڈتا چلا آ رہا ہے...... سورج دفعتاً روپوش ہو گیا۔ ہر چہار جانب دھندلاہٹ اور تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اور گدلے آسمان میں آنے والی آندھی کی خبر دینے والے چیلوں کے جھنڈ بھی اس بے پناہ دھندلاہٹ میں خلط ملط ہو گئے۔

لکڑی کے بنے ہوئے بھاری بھاری چرکھڑوں والے رہٹ کے اوپر چھائے ہوئے پھلاہ کے بڑوں کے جھنڈ میں سے کپورا سنگھ ٹھٹھے والا ایک آتشیں تھوتھنی والی سر تا پا سیاہ مضبوط گھوڑی پر

سوار باہر نکلا۔ اس نے پہلے پیر کے ٹھٹھے کی جانب دیکھا اور پھر دور دور تک بچھے ہوئے کھیتوں پر نگاہ دوڑائی، لیکن اس کی نظر دور تک نہیں جا سکی۔ کیونکہ آندھی دم بہ دم بڑھتی آ رہی تھی۔ کھیتوں کی فصلیں گرد آلود ہوا کی آمد آمد سے ایک بڑے تالاب کے میلے گدلے پانی کی طرح لہریں لیتی دکھائی دے رہی تھیں۔

کپورا ٹھٹھے والا، جسے عام طور سے کالا تیتر کہتے تھے، اسے گاؤں سے نکال دیا گیا تھا۔ کئی برس سے اس نے گاؤں میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن ہفتہ بھر پہلے وہ چوری چھپے اپنی بہن کو ملنے کے لیے گیا۔ صرف ایک رات رہ کر اور یہ معلوم کر کے کہ سسرال سے لائے ہوئے زیورات وہ کہاں پہ رکھتی ہے، چپ چاپ لوٹ آیا تھا۔ آج ان زیوارت اور اس کے ساتھ اڑوس پڑوس والوں پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ تھا۔

وہ بہت جسیم انسان تھا، کالا بھجنگ، حرامی پن نس نس میں بھرا ہوا تھا۔ اس کا دل بے حس اور جذبات کند ہو چکے تھے۔

ابھی وہ دور دور تک نگاہ دوڑا ہی رہا تھا کہ کھیتوں میں چند سائے دکھائے دے جو پرچھائیوں کی طرح اس کی جانب آئے۔

آندھی کا زور بڑھنے لگا۔

گاؤں کے چاروں طرف پھیلی ہوئی گرد پر پہلے تو سبک دھول کی چادریں لہلہائیں پھر بھاری گرد تہہ در تہہ اوپر کو اٹھنے لگی اور جوہڑ کے پانی کے سرسراتے ہوئے سانپوں کی طرح ننھی ننھی نہریں بل کھا کھا کر کروٹیں لینے لگیں۔ طوطے، کوے دیگر گھریلو چڑیا پیپل اور دھریک کے پیڑوں میں پناہ گزیں ہو گئیں۔

کھیت کھیت چلتے ہوئے وہ آدمی جب قریب پہنچے تو کپورے نے انھیں پہچان لیا۔ آگے آگے مولا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے سداگر، لبھو اور میلا سنگھ۔

انھیں دیکھتے ہی کپورا کرخت لہجے میں بولا:

''تم لوگ کہاں تھے؟''

''یہیں تو تھے۔'' سداگر نے ہنس کر جواب دیا۔

کپورے کو سداگر کی ہنسی پسند نہیں آئی۔ اس نے اس کی جانب کڑی نظروں سے دیکھا۔ وہ خود بہت کم ہنستا تھا۔ ظاہر تو یہ ہوتا تھا کہ وہ سداگر کے منہ پر الٹے ہاتھ کا جھانپڑ دے گا لیکن پھر خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا اور مولا سے مخاطب ہوا۔

"مولا!"

"ہوں۔"

"سب ٹھیک؟"

"ہم تو سب ٹھیک ہی ہیں...... تیاری تو تمہاری ہونی چاہیے۔"

اسے مولا کی حاضر جوابی بھی پسند نہیں آئی۔ لیکن اس وقت غصے کا موقع نہیں تھا۔ اور کچھ نہیں تو ڈاکے کا معاملہ چوپٹ ہو جانے کا ڈر تھا۔ تاہم اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"ہماری تیاری سے تمہارا کیا مطلب؟ تم تو اپنی کہو۔"

"ہمارا کام تو کبھی کا ہو چکا۔ گاؤں میں ایک بندوق تھی سو اب تھانے میں ہے۔"

"کسی طرف سے کوئی بات نکلی تو نہیں؟"

"نہیں۔"

"کوئی افواہ، شک وشبہ؟"

"کچھ نہیں۔"

"کپورے کی گھوڑی شاید آندھی میں کسی قسم کی بو پاکر بے چین ہو ہو کر بدکتی اور بے چینی سے زمین پر سُم جھاڑتی تھی۔ لیکن وہ اسی پر خوب جم کر بیٹھا تھا۔

تاریکی دم بہ دم بڑھتی جا رہی تھی۔ کپورے کی لوہے کی تاروں کی طرح سخت داڑھی کے بال لہرانے لگے۔ کھیتوں سے بھاگ کر لوگ باگ اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے تھے۔ چور خوش تھے کہ آج پروردگار بھی ان کی مدد کرنے پر تلا ہوا تھا۔

انھیں کئی ساتھیوں کا انتظار تھا جو دور دور یعنی پٹیالے تک سے آنے والے تھے۔ کپورے نے سوچا کہ اگر آندھی کی یہی کیفیت رہی تو انھیں اپنی کارروائی جلد شروع کرنی ہوگی۔

کپورا بولا۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

"ابھی باقی لوگ تو نہیں آئے ہوں گے۔"

"آ گئے ہوں گے۔ چل کر دیکھتا ہوں۔ تم لوگوں کو تلاش کرنے میں میرا وقت خراب ہوا۔"

"ہم تمہیں دیکھتے رہے۔ تم کہیں دکھائی نہیں دیے۔"

"رہٹ پر ملنے کا وعدہ تھا۔ میں سیدھا اسی جگہ پہنچ گیا تھا۔"

"پہلے ہم بھی رہٹ پر گئے تھے، پھر ہم کھیتوں میں چلے گئے۔"

"کیوں؟"

"ہم نے سوچا کہ کہیں رہٹ پر ہمیں کوئی ساتھ ساتھ دیکھ نہ لے۔"

"یہ اچھی حرکت کی تم نے۔ اس قسم کی حرکتیں کرو گے تو خود پھنسو گے اور ہمیں بھی پھنساؤ گے۔ اگر مجھے کوئی اس جگہ دیکھ لیتا تو؟"

مولا بولا۔ "اچھا جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ ہم اپنی جگہ سے تمہیں دیکھنے کی کوشش کرتے لیکن آندھی کی وجہ سے تم دکھائی نہیں دیے۔ بھئی! آگے کو خیال رکھیں گے۔ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔"

اس پر کپورا خوش ہو گیا۔ بولا:

"دیکھو ہم آکر پہلے اسی جگہ رکیں گے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو تو ہمیں خبر کر دینا۔"

"اچھی بات۔"

"مولا! تمہارا گھر تو بالکل سامنے پڑتا ہے۔"

"تو پھر ذرا نظر رکھنا تاکہ جب ہم یہاں پہنچیں تو تم میں سے ایک شخص ہمیں آن ملے۔ سمجھے۔"

"لیکن آندھی بڑھتی جا رہی ہے۔ نہ جانے کب تک اس کا جور رہے...... تھوڑی دیر میں ہاتھ کو ہاتھ تک سجھائی نہیں دے گا۔ تم لوگ اتنی دور سے کیسے دکھائی دے سکتے ہو۔"

کپورے نے قدرے تامل کیا پھر بولا۔ "یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن اب کریں کیا؟"

"تم یہ بتاؤ کہ سب کو لے کر کب تک لوٹو گے؟"

کپورے نے قدرے غور کرنے کے بعد جواب دیا۔ "بھئی پٹیالے اور جیند تک سے جوان آ رہے ہیں۔ اگر سب پہنچ گئے تو ہم ایک گھنٹہ تک لوٹ آئیں گے۔"

"اچھی بات۔"

"اور کیا اب رات بھیگنے کا انتجار تو کریں گے نہیں ہم۔ آندھی سے تو اس قدر اندھیرا چھا جائے گا کہ بس طبیعت کھُس ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"لو بھئی اب میں چلا۔"

یہ کہہ کر کپورے نے گھوڑی کو ایڑ دی اور بگولے کی سی تیزی کے ساتھ دم بدم دھندلاتی ہوئی جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔

(۴)

ایک گھنٹہ گزرنے بھی نہ پایا تھا کہ پیر کے ٹھٹھے پر ایسی گہری تاریکی چھا گئی کہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

کپورا اور اس کے ساتھی گھوڑوں اور سانڈنیوں پر سوار اندھا دھند چلے آ رہے تھے تیز و تند ہوا گویا ان کے کپڑے نوچ کر ان کے بدن سے الگ پھینک دینا چاہتی تھی۔ ان کی داڑھیاں اور مونچھیں گرد سے اٹ گئی تھیں...... آنکھوں کی پلکیں ایک دوسری میں پیوست ہوئی جا رہی تھیں۔ اگر کپورا ان کی رہ نمائی نہ کرتا تو کبھی راستہ تلاش نہ کر پاتے۔

ان میں ہندو، مسلمان اور سکھ سبھی شامل تھے۔ ان کے پاس دو پکی رائفلیں تھیں۔ جن کی نالیوں کے دہانے انھوں نے کپڑوں کی ڈاٹوں سے بند کر رکھے تھے تاکہ گرد اندر نہ جانے پائے۔ لاری کے اسٹیرنگ کی نالی والی ایک بندوق بھی تھی۔ ان کے علاوہ وہ کرپانوں، چھویوں، لاٹھیوں اور صفاجنگوں سے مسلح تھے۔

اس وقت دور سے پیر کا ٹھٹھہ مرے ہوئے بھینسے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔

گاؤں سے ہٹ کر سنت دتار سنگھ جی کو ٹوٹی ہوئی سادھ کی اونچی دیواریں الگ تھلگ کھڑے ہوئے دیو کی مانند دکھائی دے رہی تھیں۔ بوسیدہ دیوار کے قریب سڑے ہوئے پانی کی ایک کھائی تھی جس کی سطح پر سبز رنگ کی کائی جمی رہی تھی۔ اور دیوار کی دراڑوں سے جنگلی بیلیں لٹک آئی تھیں

اور ان کی پتیاں پانی کی سطح کو چوما کرتی تھیں۔

مولا نے سداگر کو حسب وعدہ موقع پر بھیج دیا تھا۔ سداگر ریت کے ایک ٹیلے کی اوٹ میں سر اور کانوں کو ڈھسے میں لپیٹے بیٹھا تھا۔ دیکھنے کے لیے اس نے آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا سوراخ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بھلا ایسی تاریکی میں کیا دکھائی دے سکتا تھا۔ نظر نے تو کچھ کام نہیں کیا۔ البتہ کانوں میں گھوڑوں کے سموں کی ٹپاٹپ اور سانڈھنیوں کے بلبلانے کی آوازیں آئیں تو اس نے چوکنا ہو کر گردن اٹھائی لیکن ڈاکو چشم زدن میں اس کے سر پر تھے۔ اس تاریکی میں چھویوں کی دھیمی دھیمی چمک اور بھی زیادہ خوف ناک دکھائی دے رہی تھی۔

آندھی کے شور میں آواز گونجی:

"کون؟"

"سداگر۔" سداگرے نے جلدی سے جواب دیا۔ مبادا جواب دینے میں تاخیر ہو اور اس کا سر چھوی کے ایک ہی وار سے کٹ کر الگ جا گرے۔

"سداگر کون؟"

اب سداگر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چلا کر بولا۔ "اوئے میں...... میں سداگر ٹھٹھے والا کپورا کتھے اے؟"

عین وقت پر کپورے کی گھوڑی مچل کر آگے بڑھی۔ "سداگر۔"

"ہاؤ کپوریا۔"

"اوئے اپناہی منڈا اے۔" کپورے نے ساتھیوں سے کہا۔ پھر سداگر سے مخاطب ہو کر پوچھا:

"مولا بھی ہے؟"

"نہیں...... وہ گھر پر ہے۔"

"باکی سب ٹھیک ہے۔"

"سب ٹھیک ٹھاک ہے۔"

اس اثنا میں گرد آلود ہوا فراٹے بھرتی رہی۔ گھوڑے اور سانڈھنیاں بے چینی سے رقصاں تھیں۔

نو وارد ڈاکوؤں نے چندے آپس میں تبادلہ خیالات کیا اور پھر کپورا سداگر سے بولا۔

"سداگر بچو! اب ہمیں رہٹ کی طرف لے چلو۔"

سداگر کچھ کہے بغیر اٹھا اور رہٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ سب اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔

کپورے نے رہٹ کے قریب پہنچ کر دریافت کیا۔ "سداگر! طویلہ تو کھالی ہے نا۔"

"ہاں۔ بالکل کھالی ہے۔"

"ایسا نہ ہو کہ کوئی باہر کا آدمی گھسا ہو۔"

"ارے نہیں۔"

رہٹ پر پہنچ کر وہ گھوڑوں اور سانڈھنیوں سے نیچے اترے۔ جانوروں کو طویلے میں بند کر کے سداگر کو رکھوالی کے لیے مقرر کیا اور خود سارے سامان سمیت گاؤں کی طرف بڑھے۔

مولا کے مکان کا دروازہ نیم وا تھا۔ اس نے دروازے میں اینٹیں پھنسا کر تختوں کو ایک جگہ جما دیا تھا۔ اور وہ خود لبھو کے ساتھ بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میلا سنگھ الگ بیٹھا اڑھی کرید رہا تھا۔

انھوں نے دروازے میں سے ڈاکوؤں کو پہچان لیا۔ جب وہ قریب آگئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان میں سب کے سب بڑے مضبوط اور ترچھے تلنگے آدمی شامل تھے۔

مولا تھہ جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "ساب سلامت!"

"ساب سلامت اے جی۔" دبی دبی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔

مولا بڑھ کر دہلیز تک گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے دروازے کے آگے بھانت بھانت کی صورتیں کھڑی ہیں۔ انھوں نے پگڑیوں کے شملے گھما کر چہرے ڈھانپ رکھے تھے۔ سوائے آنکھوں کے ان کے چہرے کا اور کوئی حصہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بدن سے وہ ننگے تھے۔ ان کے جسم سرسوں تیل کی وجہ سے نہ صرف چمک رہے تھے بلکہ تیل کی ہلکی ہلکی بو بھی پھیل رہی تھی۔

مولا نے لمبی مونچھوں پر چار انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"آج تاں اللہ دا بڑا ہنھیل ہے جی۔"

"ہاں۔"

مولا نے کپورے کی ننگی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آ بھا! پانی کانجی پی لو سارے۔"

کپورے نے جٹا جھاڑ ناریل کے مانند اپنے سر کو انکار کے طور پر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھو! بکت گھٹ اے۔ پانی کا نجی کی بات چھڈ۔"

مولا نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"یارو! سواری بنا آگئے او۔"

"نہیں گھوڑے ڈاچیاں طبیلے میں چھوڑ آئے ہیں۔"

"پر بھا! گھوڑے کچھ نجیک رکھو۔ بھاگتے وقت جرورت پڑے گی...... اور پھر کپوریا! تمہیں کسی نے پچھان لیا تو آپھت آجائے گی۔ تو اپنی گھوڑی نجیک رکھنا......"

کپورے کو مولا کی بات پسند آئی۔ اس نے جھک کر ایک ساتھی کے کان میں کچھ کہا اور وہ "ہاں" کہہ کر طویلے کی جانب روانہ ہو گیا۔

کپورے نے مولا سے کہا۔

"مولیا! اب دیر مت کرو۔ بس چلو۔ ایسا موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"بوت اچھا۔"

مولا نے پھونک مار کر دیا بجھایا تو اس کی لمبی لمبی مونچھیں پھڑکیں۔

اب وہ ایک لمبی قطار کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ لگے لگے بڑھنے لگے۔ گوبر کے ڈھیروں جوہڑ اور اروڑیوں کے قریب سے ہوتے ہوئے وہ گلی میں گھس گئے۔

آندھی کی وجہ سے بے پناہ شور پیدا ہو رہا تھا۔ ایسے موقع پر کتے بھی تنوروں میں دبکے ہوئے تھے۔ ایک آدھ نے دبی سی بھوں کی آواز نکالی بھی تو وہ آندھی کے شور میں دب کر رہ گئی۔

ان کی رائفلیں بھری ہوئی تھیں۔ ان سب کے ہتھیار بالکل تیار تھے۔ ہر اہم موڑ پر کپورا ایک آدمی کھڑا کر دیتا۔

مولا کی ابھی تک بگا سنگھ سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بگا کم گو انسان تھا۔ مولا اس حقیقت سے واقف تھا۔ اس لیے اس نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ وہ بگے کے دوش بدوش چلا جا رہا تھا۔ بگا تاڑ کی طرح لمبا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کی جانب دھنسی ہوئی تھیں، لیکن ان میں وحشی جانور کی

آنکھوں کی سی چمک اور تجسس تھا۔ وہی ان سب کا سوار تھا۔
ڈاکو طویل کن کھجورے کی طرح دیواروں سے لگے لگے بڑھ رہے تھے۔
بگے نے مولا سے دریافت کیا۔
"مکان ہے کہاں؟"
"گاؤں کے بیچوں بیچ۔"
یہ سن کر بگے کے ابرو پر بل پڑ گیا۔ بگو نے دبی آواز میں کہا۔
"اگر لوگ باگ جاگ پڑے تو اس تاریکی اور آندھی میں گاؤں سے باہر نکلنے کے لیے بہت احتیاط اور ہوشیاری کی ضرورت ہے۔"
مولا نے قدرے بے پروائی سے کہا۔
"اوئے بھا! تم لوگوں کے سامنے کون ٹکا رہ سکے گا...... چاہے سو آدمیوں سے مقابلہ کیوں نہ ہو جائے۔"
بگے پر مولا کی اس بڑ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ گاؤں والوں کا بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن وہ ایک گرگ جہاں دیدہ تھا۔ اس وقت سوال مقابلہ کر سکنے یا نہ کر سکنے کا نہیں تھا۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ گروہ کا ہر آدمی بچ کر نکلنا چاہیے ورنہ ایک آدھ بھی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو سارے گروہ کی آفت آ جائے گی۔ اس قدر آندھی، تاریکی اور شور میں یہ سارا کام بخیر و خوبی انجام پا جانا اس قدر آسان نہیں تھا جتنا کہ مولا کو محسوس ہوتا تھا۔
معاً بگو ایک دم رک گیا اور اس کے پیچھے سب کے سب ڈاکو رُک گئے۔
تاریکی میں سامنے سے انھیں ایک تاریک تر سایہ دکھائی دیا...... معلوم ہوتا تھا کہ کوئی آدمی جلد قدم اٹھاتا بڑھا چلا آ رہا ہے۔
وہ سب چشم زدن میں دیوار کے ساتھ لگ کے کھڑے ہو گئے۔
وہ آدمی بدن پر کالی چادر لپیٹے تیزی سے بڑھتا آ رہا تھا۔ لحہ بہ لحہ وہ ان کے قریب پہنچ رہا تھا۔
ڈاکو دم سادھے کھڑے تھے۔ اتفاق سے اس دیوار پر ایک چھجا بڑھا ہوا تھا۔ اس لیے وہ مکمل

تاریکی میں کھڑے تھے۔

یوں سچ سے قریب کھڑا ہوا آدمی بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ تو محض بگو کی متجس آنکھوں نے ہی اجنبی کو آتے دیکھ پایا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ اجنبی ان کے قریب سے گزرنے لگا۔ اس غریب کو اس امر کا مطلق احساس نہیں تھا کہ وہ ہتھیار بند ڈاکوؤں کی چھویوں کے سائے تلے سے گزر رہا ہے۔ اگر کہیں اس کے منہ سے چوں کی آواز نکل جاتی تو اس کا سر تن سے جدا ہوتا۔

ڈاکوؤں پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ وہ اس منحنی سے آدمی کے سائے کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے وہ ان کی قطاروں سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد ۔ ۔ نے اطمینان کی سانس لی۔ کیونکہ وہ اس وقت خون خرابہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر کہیں اس کی بہت تیز چیخ نکل جاتی اور اس چیخ کو سن کر گاؤں میں شور مچ جاتا تو انھیں خالی ہاتھ واپس بھاگنا پڑتا۔

گاؤں کے اندر والے چوراہے پر پہنچے تو دیکھا کہ اونچے چبوترے والے بڑے کنوئیں کی منڈیر پر پانی نکالنے کی اونچی اونچی چرکھڑیاں سر جھکائے غم ناک انداز میں کھڑی ہیں اور ان چرکھڑیوں کے قدموں میں ناہموار پلندوں کے لوہے کے ڈولچے ہوا کے زور سے ہل ہل کر ڈنگاڈنگ کا شور بلند کر رہے ہیں۔ اور چبوترے کے قریب کھڑے لسوڑیوں کے پیڑ گویا انھیں خشمگیں نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

وہ سب فوراً پیڑوں کے جھنڈ تلے چلے گئے۔ تاکہ آپس میں مشورہ کرلیں۔

کپورے نے چھو چھو کر سب کی تعداد معلوم کی۔ مطمئن ہو کر اس نے کہا۔

''اس جگہ کم سے کم تین جوان کھڑے رہنے چاہئیں۔''

''وہ کیوں؟'' ان میں سے ایک نے جو لدھیانہ کے علاقے کا ذرا اتھ چھٹ جوان تھا، اعتراض کیا۔

کپورے کو اس کا یہ اعتراض پسند نہیں آیا۔ اس نے ابرو پر گہرے بل ڈال کر اس کی جانب دیکھا اور پھر گہرا سانس لے کر اس نے اپنے غصے کو دبایا اور اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرنے لگا۔

"اس جگہ سے صرف ایک تنگ گلی آگے کو جاتی ہے جو مکانوں کے اندر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے بھاگ نکلنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔"

"اوئے آپانوں پرانہیں اے۔ آپاں نال کون مقابلہ کر سکتا ہے۔" نوجوان نے بازو ہوا میں لہرا کر بے پروائی سے بلند آواز میں کہا۔

اب تو کپورے کا جی چاہا کہ اس کی گردن مروڑ کر رکھ دے۔ اس کے یہ تیور دیکھ کر نوجوان بھی بپھرنے لگا۔ نوجوان مضبوط اور جوشیلا ہی سہی، لیکن کپورے کے مقابلے میں کھڑا ہونا تو سراسر حماقت تھی اس کی۔

شاید ان کے دو دو ہاتھ ہو جاتے۔ لیکن بگے نے نوجوان کو آنکھ دکھائی تو وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ پھر بگا کپورے سے مخاطب ہو کر بولا:

"ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم؟"

"ادھر جو تنگ گلی تم دیکھ رہے ہو، اسی کے اندر ہمیں جانا ہے۔ وہ مکانات جن پر ہماری نظر ہے قلعے کے مانند ہیں۔ ہر آفت سے بچے ہوئے ہیں۔ اول تو وہاں پہنچنے کا کسی ڈاکو کو حوصلہ ہی نہیں ہوا۔ ہماری یہ پہلی کوشش ہے۔ اگر ہم وہیں کہیں گھر گئے تو عجب مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہماری خیریت اسی میں ہے کہ ہم یہاں سے سب کے سب صحیح سلامت نکل جائیں...... صرف یہی ایک کھلی جگہ ہے۔ خطرے کے موقع پر ہمارا ایک آدمی فوراً گلی کے اندر آ کر ہمیں خبر کر سکتا ہے۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ اول تو ہمیں مقابلہ کرنا ہی نہ پڑے لیکن ایسا ہو بھی تو یہاں کھلی جگہ میں ہو۔"

بگے نے اثبات میں سر ہلایا۔

کپورے نے پھر کہنا شروع کیا۔ "یہ آندھی ہماری مدد بھی کر سکتی ہے اور ہمارا نقصان بھی کر سکتی ہے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو اس ہلڑبازی، آندھی اور اندھیرے میں ہم اپنے ساتھیوں کی گنتی بھی نہ کر پائیں گے۔"

بگا کو حرف بہ حرف اس سے اتفاق تھا۔

چنانچہ تین آدمی وہاں پر چھوڑ کر وہ لوگ آگے بڑھے۔

تنگ گلی میں پہنچ کر انھیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ قبر میں ہوں۔ آندھی اور ہوا کا زور کم تھا۔ البتہ قیامت کا شور کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتا تھا۔

دفعتاً بگا ایک دم رک گیا۔ اس کے ساتھ ہی سب کے قدم رک گئے اور وہ اپنی تھوتھنیاں اس کے قریب لے آئے تاکہ اس کی بات سن سکیں۔

بگے نے ساہلسی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"بانس نہیں لائے؟"

"او، وہ تو بھول گئے۔"

"واہ اوئے بھو...... تو کیا اب...... کے سہارے چڑھو گے چھت پر......"

"بانس کونسا دور ہے۔ مولا کے گھر ہی سے تو لانا ہے۔ میلو جا رے تو بھاگ کے جا اور مولو کی ڈیوڑھی کے اندر صحن کے کونے میں ایک لمبا بانس دھرا ہوگا...... بس اٹھا کے پھورن واپس آنا......"

میلو نے تھوتھنی گھمائی اور ناک کی سیدھ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔

وہ سب آگے بڑھے۔ کچھ دور جا کر گلی بائیں ہاتھ کو گھوم گئی تھی۔ موڑ سے چند قدم آگے داہنے ہاتھ کو ایک ادھورا مکان تھا۔ جس کی بنیادیں بھرنے کے بعد نہ جانے اسے کیوں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اب وہاں بڑے بڑے خشک جھاڑ اور منچھٹی (کپاس کی چھڑیاں) کے انبار اگلے مکان کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ جب کسی کتیا کو بچے جننے ہوتے تو وہ چیختی کراہتی یہیں آن کر پناہ لیتی۔ ایک کونے میں بھڑ بھوجے کا چولہا تھا جس میں اس وقت ریت بھری تھی۔

وہاں رک کر انھوں نے اس مکان کے پچھواڑے کا جائزہ لیا جس کے اندر انھیں سب سے پہلے داخل ہونا تھا۔

چھت سے پرے بجلی چمک چمک کر آنکھیں دکھا رہی تھی۔ گھنگھور گھٹائیں سیاہ دامن لہراتی بے پناہ دل کی طرح آسمان کی وسعتوں میں پھیلنے لگیں۔ آندھی کے زور میں کمی تو نہ آئی تھی۔ البتہ ہوا میں پہلی سی گرد باقی نہ رہی تھی۔

کپورے کے اشارے پر وہ پھر رک گئے۔ ان کی واڑھیاں پھر ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ اس نے کہا۔

"سب لوگ یہیں پر رکیں۔ میں بگے کو لے کر مکانوں کو اگلی طرف سے دیکھ لوں جرا۔"

وہ دونوں چند ہی قدم پر پہنچ کر ان سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

سانسی نے مکان کی جانب دیکھا اور پھر دل ہی دل میں اندازہ لگانے لگا کہ اس پر بانس کی مدد سے چڑھنا ممکن بھی ہے یا نہیں۔ ان میں سے ایک بولا:

"بھو! مکان جرا اونچا مالم ہوتا ہے۔"

"ہاں...... ہے تو۔"

"اگر تم بانس کے زور سے پھلانگ کر اس پر نہ چڑھ سکے تو اِدھر اُدھر سے اوپر جانے کا کوئی راستہ یا سہارا ابھی دکھائی نہیں دیتا...... پھر تو آگے والے دروازے سے جانا پڑے گا۔"

سانسی چپ چاپ دانتوں تلے مونچھ کا ایک سرا چباتا رہا۔ پھر یوں بولا۔ جیسے اپنے آپ ہی کو مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔

"میں آگے بڑھ کر دیوار کے نیچے سے ٹھیک انداج لگا سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور دیوار کے قریب پہنچ کر منجھٹی کے ایک انبار کے عقب میں گم ہو گیا۔

تاریکی کی وجہ سے اندازہ لگانا مشکل سا ہو رہا تھا۔

چند منٹ بعد بگا اور کپورا بھی واپس آ گئے۔ بگا بولا۔

"پہلے تو کپورے کی بہن پر ہاتھ صاف کرنا ہوگا۔ اس کے بعد پڑوس کے چند گھر بھی اچھے ہیں ان پر بھی جلدی سے ہاتھ پھیر دیا جائے...... اپنا سانسی یار کدھر گیا۔"

"وہ دیوار کی طرف گیا ہے آتا ہی ہوگا۔ اندھیرے میں اسے بھی کچھ سوجھ نہیں رہا۔"

چند ثانیوں کے بعد سانسی آ گیا......

اسے دیکھتے ہی بگے نے کہا۔

"مکان تو اونچا ہے بھو۔"

"ہاں بھا!" سانسی نے پھر ایک مکان کی جانب نظر ڈالی اور پھر قدرے بے چینی سے ہاتھ ملنے لگا۔ شاید اس کے ہاتھ بانس پکڑنے کے لیے بے قرار ہو رہے تھے۔

"پھر؟" بگے نے سوال کیا۔

سانسی نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟"

بگے کو اس کے جواب سے اطمینان نہیں ہوا۔ لیکن سر دست اس کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی تو نہ تھا۔

اتنے میں میلو ہاتھ میں لمبا بانس لیے یوں وارد ہوا جیسے بڑے موذی جانور کو کندھے پر لادے لا رہا ہو۔

سانسی نے بڑھ کر بانس تھام لیا۔ پہلے اسے لچکا لچکا کر اس کی مضبوطی کا جائزہ لیا۔ اور راستہ ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھا اور پھر اس نے مکان کی چھت کی جانب نظر دوڑائی۔ مٹیالے آسمان پر کالے بادل گدلے دھبوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔

اب سانسی نے اپنی کمر کے گرد لمبا رسا لپیٹا اور زمین پر ہاتھ مار کر دو ڈھیلے کمر بند میں ٹھونس لیے اور سر گھما کر دھیمی آواز میں ساتھیوں سے کہا۔

"اچھا، اب میں کوشش کرتا ہوں..... چھت پر صحیح سلامت پہنچ گیا تو یہ دو ڈھیلے تمہاری طرف پھینکوں گا۔"

بعد ازاں اس نے لمبے بانس کو سنبھالا، اسے دونوں ہاتھوں میں تولا اور پھر دو چار بار پاؤں کے پنجوں پر ناچ کر تیزی سے بھاگ نکلا......

...... معاً اس کے قدموں کی آواز بند ہو گئی۔

سب نے اسے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے بڑے چمگادڑ کی طرح ہوا میں اٹھتے دیکھا۔ قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ چھت پر پہنچ گیا ہے۔

اگر بجلی چمک جاتی تو وہ اسے دیکھ ہی لیتے۔ ورنہ...... تڑاخ سے دو ڈھیلے ان کے قریب گرے۔ ایک تو میلو کو ٹانگ پر لگا۔

"اوئے میا دیا!" وہ ٹانگ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ لیکن چوٹ بالکل معمولی تھی۔ ڈھیلا کچی مٹی کا تھا۔

اب بگے نے چند آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

"دیکھو! اب ہمیں یہ سارا کام جلد سے جلد ختم کرنا ہے۔ اس گاؤں میں چند اچھے لڑاکا جوان

رہتے ہیں جو جان کی بازی لگا سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں چپ چاپ اور پھرتی سے اپنا الو سیدھا کر کے نو اور دو گیارہ ہو جانا ہے۔ سمجھے؟"

"ہاں بھئو۔" سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

کپورے نے میلو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیمی آواز میں ہدایت دی کہ وہ سب جوانوں کولے کے مکان کے دروازے پر پہنچ جائے۔

وہ لوگ اُدھر چلے گئے تو کپورا بگے کو ساتھ لے کر پچھواڑے والی دیوار کے قریب پہنچا۔ ابھی ان کے قدم رکنے بھی نہ پائے تھے کہ چھت پر سے رسہ لمبے ناگ کی طرح پھنپھناتا اور لہراتا ہوا نیچے گر کر جھولنے لگا۔

باری باری دونوں رسے کی مدد سے چھت پر پہنچ گئے۔

چھت کی منڈیر بہ مشکل چار چھ انگل اونچی ہوگی۔ تیز و تند آندھی کے زور میں انھیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کے پاؤں اکھڑ جائیں گے اور وہ چشم زدن میں اڑ کر گاؤں کے باہر جا گریں گے۔ اس لیے وہ جھکے جھکے صحن سے آنے والی سیڑھی پر بنی ہوئی ممٹی کی جانب بڑھے۔ یہ اور خوشی کی بات تھی کہ ممٹی کا دروازہ ابھی کھلا تھا۔ ورنہ انھیں کود پھاند کر نیچے جانا پڑتا۔ اس لیے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ گھر کے لوگ ابھی سوئے نہیں تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ابھی سونے کا کوئی وقت بھی نہیں تھا۔

کپورے کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ بگو کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی چھوی اور سانسی حسبِ معمول لمبا سا چھرا تھامے تھے۔

انھوں نے ایک بار پھر اپنے اپنے چہروں کو پگڑیوں کے شملوں میں چھپایا۔ صرف آنکھوں اور ابرؤوں کو ننگا چھوڑ دیا اور پھر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگے۔

وہ کافی نیچے جا چکے تھے کہ دفعتہً موڑ سے ٹمٹماتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ کوئی شخص ہاتھ میں لالٹین یا چراغ لیے سیڑھیوں پر چڑھتا چلا آرہا ہے...... وہ ٹھٹھک کر رک گئے۔ روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔

ابھی وہ کچھ طے بھی نہ کر پائے تھے کہ چراغ کے پیچھے دو زنانہ پاؤں دکھائی دیے اور ان کی

آنکھیں ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی کی آنکھوں سے ملیں جو چراغ کو اپنے دونوں ہاتھوں کے حلقے میں لیے ہوئے تھی۔ تاکہ وہ بجھ نہ جائے۔

انھیں دیکھتے ہی لڑکی کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے یہ بڑی زبان باہر نکال کر حلق سے ایک دلدوز چیخ نکالنے کی کوشش کی، لیکن مارے خوف کے اس کی قوتِ گویائی سلب ہو گئی۔ مٹی کا چراغ اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔

بگے نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ انھوں نے اس کے منہ میں اسی کی چندری ٹھونس کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر وہیں کونے میں ڈال دیا۔

صحن میں پہنچے تو دیکھا ایک جانب ڈیوڑھی ہے اور دوسری جانب مکان کا پسار ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جس دروازے سے نکل کر لڑکی آئی تھی، اس کا کنڈا اس نے باہر سے چڑھا دیا تھا تاکہ ہوا کی تیزی کے باعث دروازہ نہ کھلے۔ اندر روشنی ہو رہی تھی اور اندر گھر والوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

بگا اور سانسی دروازے کے دونوں جانب اپنے اپنے ہتھیار سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ اور کپورا باقی ساتھیوں کے لیے گلی کا دروازہ کھولنے کو ڈیوڑھی کی جانب بڑھا۔ ڈیوڑھی میں مویشی بندھے تھے۔ ایک بیل تو اسے اتنا پسند آیا کہ بے اختیار جی چاہا کہ اسے بھی وہ اپنے ہمراہ لیتا جائے۔ لیکن اس رات یہ قطعاً ممکن نہیں تھا۔

ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر اس نے گلی میں جھانکا تو کچھ نظر نہ آیا۔ چنانچہ اس نے بیل ہانکنے کے انداز میں ٹو ٹو کر کے دو تین آوازیں نکالیں تو متعدد سائے اس کی جانب بڑھے۔ جیسے کالی دیواروں نے انھیں جنم دے دیا ہو۔

کپورے نے ایک جوان کو بندوق سمیت گھر کے پچھواڑے منجھٹی کے انباروں کے پاس کھڑے رہنے کے لیے بھیج دیا اور باقی لوگوں کو اندر لے آیا۔

دو گھڑی بعد وہ سب لوگ دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔

بگو نے چھوی بڑھائی اور دروازے کے کنڈے میں اڑس کر ٹہو کا جو دیا تو کنڈا بڑی آواز سے کھل کر گرا اور تڑاتڑ بجنے لگا...... دروازے کے دونوں تختے زور زور سے پنکھا جھلنے لگے۔

گھر کے لوگ سمجھے کہ لڑکی مٹی کا دروازہ بند کر کے لوٹی ہے۔ وہ کچھ دیر تک اس کے اندر آنے

انتظار کرتے رہے۔ لیکن جب کوئی صورت دکھائی نہیں دی تو ایک مرد جلدی سے باہر نکل آیا۔ پہلے وہ دروازے کے دونوں جانب کھڑے ہوئے بگو اور ساہنسی کو نہیں دیکھ پایا...... جب اس نے لڑکی کو صحن میں نہ پاکر گردن گھمائی تو بگو اور ساہنسی کی صورتیں دکھائی دیں۔ اس نے گھبرا کر پوچھا:

"آپ کون ہیں؟"

اسی اثنا میں باقی آدمی بھی ڈیوڑھی میں گھس آئے اور دروازے میں سے ان کی خبیث صورتیں دکھائی دینے لگیں۔ وہ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ پیچھے سے کپورے نے اس کی گدی پر الٹے ہاتھ کا ایسا دھپ دیا کہ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔

یہ سب کچھ چند ثانیوں میں ہو گیا۔ وہ سب فوراً مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ لالٹین کی روشنی میں ان کے ہتھیار جگمگا اٹھے۔ جان کے خوف سے گھر کے کسی فرد نے شور نہیں مچایا۔ اس کا بھی وہی علاج کیا گیا جو پہلی لڑکی کا کیا گیا تھا۔

کپورا ذرا چھپا چھپا ہی رہا تا کہ اسے کوئی پہچان نہ لے۔ وہ بگے کو اندر والے کمروں میں لے گیا اور ان کی طرف اشارہ کیا۔ دم کے دم سب کچھ سمیٹ لیا گیا۔ پھر وہ سب صحن میں آ گئے...... بگو نے ایک نظر میں ساتھیوں کی تعداد جانچ لی اور پھر وہ دو حصوں میں بٹ کر پڑوس کے مکانوں کی جانب بڑھے۔ جن کے صحن ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔

اتنے میں باہر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی ان کے قدم رُک گئے۔ پھر دھڑا دھڑ گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ آندھی کے شور میں مردوں کے للکارنے کی صدائیں بلند ہوئیں۔

موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے وہ باہر کی جانب بھاگے۔

جس نوخیز نشانہ باز جوان کی کپورے نے بندوق سمیت مکان کے پچھواڑے ڈیوٹی لگائی تھی اس نے ہڑبڑاہٹ میں یہ گولیاں چلا دی تھیں۔ ہوا یہ کہ آندھی کے زور سے منجھٹی اور جھاڑ کے انبار حرکت میں آ گئے اور لڑھکتے ہوئے اس کی جانب بڑھے۔ اور اس نے گھبراہٹ میں نہ جانے کیا سمجھ کر پے در پے تین گولیاں چلائیں۔

اسی اثناء میں گاؤں کے مختلف حصوں سے خطرے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ چھکڑیوں والے

کنویں کی جانب سے ایلی ایلی کی آوازیں آنے لگیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ان کے ساتھی انھیں خطرے سے آگاہ کر رہے ہیں۔

اب انھوں نے میلوہ کو آگے لگایا اور سرپٹ بھاگے۔

چرکھڑیوں والے کنویں تک پہنچے تو وہاں اندھا دھند لاٹھیاں چل رہی تھیں۔ گاؤں کے من چلے بھی جلدی میں جیسا ہتھیار ملا، لے کر مقابلے پر آن ڈٹے تھے۔ لیکن تاریکی اور آندھی نے انھیں کچھ کرنے نہ دیا۔

اُدھر بگو کے سدھائے ہوئے ساتھی گاؤں والوں کے کندھوں سے کندھے بھڑاتے ہوئے نہایت صفائی سے اِدھر اُدھر منتشر ہو کر صحیح سلامت گاؤں سے نکل گئے۔

اتنے میں کپورے کو اپنی کالی گھوڑی دکھائی دی۔ وہ فوراً چھلانگ کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ اپنی منہ زور گھوڑی کو ایڑ دے گا تو وہ گاؤں کے ہجوم کو کائی کی طرح چیرتی ہوئی نکل جائے گی۔ لیکن عین اس وقت بجلی چمکی تو گاؤں والوں میں سے بعض نے اسے پہچان لیا اور آندھی کے بھیانک شور میں ''کالا تیتر، کالا تیتر'' کی وحشیانہ آوازیں گھل مل گئیں۔

ایڑ دیے جانے پر گھوڑی سمٹ کر جو اچھلی تو گاؤں کے منچلے نوجوان نے اس کی لگام پر جھپٹا مارا۔ اس پر گھوڑی ہنہنا کر پچھلے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ اس کی انکھڑیاں پھٹ گئیں۔ کان پھڑپھڑائے۔ اور ایال لہرائی۔ سوار نے ہونٹ کاٹ کر اپنے لمبے دستے والی کلہاڑی اوپر اٹھائی۔ لیکن گھوڑی کے اگلے پاؤں زمین پر لگنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک چھوی چمکی اور کپورے کے پیٹ کی آنتیں ادھیڑتی ہوئی انھیں پیٹ سے باہر لے آئی۔

وہ بڑے مگرمچھ کی طرح بل کھا کر اوندھے منہ زمین پر گرا۔ پیٹ سے خون کا فوارہ چھوٹا اور لمحہ بھر میں زمین اس کے گاڑھے خون سے سرخ ہو گئی۔

پھر بارش کی موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔

# گمراہ

صبح کے وقت میں حجامت بنا رہا تھا۔

سامنے بڑا سا آئینہ، ہاتھ میں سیفٹی ریزر اور چہرے پر صابن کا جھاگ۔ کون نہیں جانتا کہ ایسے موقع پر چہرہ کیسی کیسی صورتیں اختیار کرتا ہے۔ معاً میرے منہ کا دہانہ ایک مخصوص انداز سے کھلا تو میرا سیفٹی ریزر والا ہاتھ ساکت ہو گیا۔ اپنے منہ کا واشگاف دہانہ دیکھ کر کسی بات کی یاد تازہ ہو گئی۔

خدایا..... کیا بات تھی وہ!

چند لمحوں تک میرا دماغ عجیب الجھن میں پھنسا رہا۔ میرے منہ کے اس انداز سے کھلنے کا کسی واقعے سے تعلق تھا..... وہ واقعہ کیا تھا؟

رفتہ رفتہ ذہن کے دھندلکے میں مجھے ایک اور کھلا ہوا منہ نظر آنے لگا۔ وہ چہرہ مجھ سے زیادہ عمر رسیدہ تھا۔ ناک پلپلی سی، باچھوں کے دونوں طرف جھاڑ جھنکاڑ کی طرح الجھی ہوئی زردی مائل سفید مونچھیں لٹک رہی تھیں۔ منہ کے اندر دانت حاضر کم اور غائب زیادہ تھے۔ یہ ماسٹر جھانگی داس جی کا چہرہ تھا۔ پچھلی شام جب میں نے ان کا منہ اس انداز سے کھلا ہوا دیکھا، تو قصہ علی بابا میں چالیس چوروں کے غار کا نقشہ کھنچ گیا۔ میرے سامنے ان کا منہ اس انداز سے تیسری بار کھلا تھا۔

مسٹر جانگی داس مجھ سے چھ سات برس بڑے ہوں گے۔ وہ کتابوں کا کیڑا تھا اور میں فائلوں کا۔

عمر میں زیادہ تفاوت نہیں تھا، اور نہ میری زندگی مصائب اور پریشانیوں سے مبرا تھی۔ پھر بھی ان کا چہرہ کہیں زیادہ تکان زدہ اور بوڑھا دکھائی دیتا تھا۔ غالباً مالی حیثیت سے جانکی داس کے حالات مجھ سے زیادہ خراب تھے...... لیکن یہ موضوع کبھی زیر بحث نہیں آیا۔ ایک محلے میں رہتے ہوئے بھی میں ان کے بارے میں اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ رمیش کے کلاس ٹیچر تھے، اور وہ محض یہ جانتے تھے کہ میں ان کے اس شاگرد کا باپ تھا۔ ماسٹر جانکی داس نے پچھلی شام مجھے تیسری بار اطلاع دی کہ رمیش اسکول سے اکثر غیر حاضر رہتا تھا۔ مصروفیت کے سبب میں اس مسئلہ کی طرف توجہ نہیں دے سکا تھا۔ ماسٹر جی نے اسے میری غفلت سمجھا۔ چنانچہ تیسری بار یہ شکایت کرنے کے بعد آخر میں انھوں نے اپنا منہ اسی مخصوص انداز سے کھول کر گویا مجھے خبردار کیا۔ ''جناب اگر یہی حالت رہے گی تو آپ کا لڑکا گمراہ ہو جائے گا۔''

انھوں نے 'گم' اور 'راہ' پر الگ الگ زور دیا۔ یہ فقرہ کہتے وقت ان کے چہرے پر انتہائی اذیت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ بات ادا ہو جانے کے بعد بھی ان کا منہ جوں کا توں کھلا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جب تک مجھے آنے والے المیہ کا پوری شدت سے احساس نہ ہو جائے تب تک ماسٹر جی اپنے کھلے ہوئے منہ کو بند نہیں کریں گے۔ لیکن مجھے ان کی شکل مضحکہ خیز سی لگی...... یہی محسوس ہوا کہ مسئلہ کی نوعیت اتنی خطرناک اور اہم نہیں تھی جتنی کہ وہ اپنی صورت سے ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

کل شام، اور آج پھر مجھے محسوس ہوا کہ لفظ ''گم راہ'' کس قدر بھاری بھر کم تھا...... یہی بات میں نے اپنی بیوی سے کہی۔ اس نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ماسٹر جی کی شکایت بجا تھی، لفظ 'گمراہ' کا استعمال بھی مناسب تھا، نیز مجھے جلد از جلد اس پر توجہ دینی چاہیے۔

آئینہ میں اپنی صورت کو خود میں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''اے گدھے کہیں کے! سوال یہ نہیں تھا کہ لفظ گمراہ ضرورت سے زیادہ بھاری بھر کم تھا یا نہیں، بلکہ سوال لڑکے کے مستقبل کا تھا۔ اولاد کی غلط روی کا خمیازہ والدین کو بھی بھگتنا پڑتا ہے''

شیو کے بعد نہاتے وقت میں نے تہیہ کر لیا کہ اس بات کی کھوج کروں گا کہ رمیش اسکول کے بجائے کہاں جاتا ہے۔ ناشتے کے بعد میں دفتر کو چلا تو اتفاق سے رمیش کتابوں کا بیگ کندھے پر

لٹکائے جاتا نظر آیا۔ کچھ دور تک ہم اسی طرح آگے پیچھے چلتے رہے۔ پھر اسکول کی طرف جانے کی بجائے وہ ایک دوسری سڑک پر ہولیا۔

سنی سنائی باتوں سے میں زیادہ متاثر نہیں ہوا، لیکن اپنی آنکھوں سے صاحب زادے کی یہ حرکت دیکھ کر میں طیش میں آگیا۔ چنانچہ میں بھی دفتر کا راستہ ترک کر کے اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

سڑک سے ہٹ کر شیشم کے اونچے اونچے پیڑوں کے نیچے بازی گر کرتب دکھا رہے تھے۔ لمبے لمبے بانسوں کی دو قینچیوں کے درمیان ایک دبیز رسہ تنا ہوا تھا۔ بائیں سرے پر کالے رنگ کی ایک عورت مہاراشٹری ڈھنگ سے ساڑی پہنے کھڑی تھی۔ اس کے دبلے پتلے چہرے کے مقابلے میں اس کا جسم زیادہ بھرا بھرا دکھائی دے رہا تھا۔ سڈول پنڈلیاں دمک رہی تھیں۔ اس نے ایک بڑا سا تھال رسے پر ٹکایا، اور اس میں دونوں پاؤں جما کر کھڑی ہو گئی، ہاتھوں میں لمبا سا بانس تھام لیا۔ توازن قائم رکھتے ہوئے اس نے اچھل اچھل کر تھال سمیت آگے بڑھنا شروع کیا۔ تماشائی دم بخود کھڑے تھے۔ ایک بازی گر نیچے کھڑا زور زور سے تھالی بجا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ عورت رسہ پار کر کے دوسرے سرے پر پہنچ گئی۔ فضا تالیوں سے گونج اٹھی، لمحہ بھر کے لیے مری توجہ رمیش سے ہٹ گئی۔ گھڑی پر نظر ڈالی، دس بجنے میں آٹھ منٹ باقی تھے۔ سوچا، اب رمیش کو کان سے پکڑ کر اسکول کو جانے والے راستے پر ڈال دوں۔ نگاہ اٹھائی تو رمیش اپنی جگہ موجود نہیں تھا...... کیا اس نے مجھے دیکھ لیا تھا؟

نہیں!...... وہ چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر بڑے اطمینان سے چلا جا رہا تھا۔ اگر اسے میری موجودگی کا علم ہوتا تو اس قدر بے پروائی سے مٹر گشت کرتا ہوا نہ چلتا۔ پہلے آواز دینے کی سوچی، پھر یہ ارادہ ترک کر دیا، کہ شاید وہ کسی دوسرے راستے سے اسکول کو رُخ پھیر لے گا۔

میرا اندازہ غلط نکلا، وہ شہر کے باہر کی جانب جا رہا تھا۔

ہمارے شہر کے باہر کوٹھیوں اور بنگلوں والا علاقہ بڑا پُر فضا تھا۔ ان سے پرے سرسبز و شاداب پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔ ان پہاڑیوں سے بھی آگے اونچے اونچے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں، نیلگوں غبار میں تیرتی ہوئی سی لگتی تھیں۔ زیادہ تر بنگلوں کے چاروں طرف ہری بھری باڑیں موجود تھیں۔ ان کے اندر لیچی اور آموں کے پیڑ، نیز رنگ برنگے پھولوں کی کیاریاں نظر آتی تھیں۔

رمیش ان تنگ لیکن صاف ستھری پکی سڑکوں پر بڑھتا جا رہا تھا۔ اب ساڑھے دس بجنے کو تھے۔

میں بھی دفتر نہ پہنچ سکا۔ بیٹے کا اس طرح مٹر گشت کرنا مجھے بڑا پُر اسرار سا لگ رہا تھا۔ میں مشہور جاسوس جیمز بانڈ (۰۰۷) کی طرح قدم ناپتا ہوا اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ لیکن میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے، کس سے ملتا ہے، کہاں ہے اس کی منزل؟

وہ لال پیلی دھاریوں والی قمیص پہنے ہوئے تھا، پاؤں میں بے ڈول بوٹ اور اُن میں سے بھورے رنگ کے چھوٹے چھوٹے موزے باہر کو جھانک رہے تھے۔ اس کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی۔ نیکر کے مختصر پائینچوں میں سے اس کی دبلی رانیں، نیچے موٹے گھٹنے اور پتلی سی پنڈلیاں نظر آرہی تھیں۔ دراصل اس کا بدن بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ نہیں تھا، البتہ اس کی ہڈیاں موٹی اور قد لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے کندھے پھیلے ہوئے اور ریڑھ کی ہڈی سیدھی تھی۔ سر کے جھبے سے بال پھولے پھولے تھے۔ شاید ہوا بالوں میں داخل ہو کر انھیں غبارے کی طرح پھلا رہی تھی۔

اس نے ایک بار بھی پیچھے کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ سیٹی بجاتا، کچھ بل کھاتا اور لہراتا ہوا بڑھا جا رہا تھا، کبھی کہیں رک کر پیڑوں پر بیٹھے بندروں اور پرندوں کو دیکھنے لگتا اور پھر کسی پتھر کو بوٹ کی ٹھوکر مار کر آگے بڑھ جاتا۔ سُور کا بچہ! بھلا وہ کیا جانے کہ اس کے یہ بوٹ خریدنے کے لیے اس کے باپ کو صبح سے شام تک دفتر میں فائلوں سے کتنا ماتھا پھوڑنا پڑتا ہے۔

پیڑوں کے نیچے نرم و نازک گھاس پر اب شبنم کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔

دور سے برساتی ندی کا خوب چوڑا پاٹ نظر آنے لگا تھا۔ ندی کے اس پار چائے کے باغات اور چیڑ کے جنگل تھے۔ آسمان پر بدلیاں جمع ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے نیلے، پیلے، سبز، گلابی، اودے اور نہ جانے کیسے کیسے رنگ کے لباسوں میں ملبوس پریوں کا میلا لگنے والا تھا۔

یُگ بیت گئے۔ میں بھی کبھی لڑکپن میں ادھر مٹر گشت کے لیے آیا کرتا تھا۔

آگے سپیروں کا ڈیرہ لگا ہوا تھا، ان کے پھٹے پرانے خیموں کے آس پاس ان گنت کپڑے جو دھلنے کے بعد اور بھی غلیظ لگ رہے تھے۔ سوکھنے کے لیے یا تو گھاس پر بچھا دیے گئے تھے۔ یا جھاڑیوں پر لٹکا دیے گئے تھے۔ روکھے سوکھے بالوں اور لٹکی لٹکی مونچھوں والے سپیرے بے دلی سے اِدھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔

رمیش ان کے ڈیرے کے قریب پہنچا تو پانچ چھ کتے بڑے زور شور سے بھونکتے ہوئے اس کی

طرف لپکے۔ میں ڈرا کہ کہیں اس کی ٹانگیں نہ نوچ ڈالیں۔ مگر نزدیک پہنچتے ہی کتے چپ ہو گئے اور دُمیں ہلانے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ حضرت سے مانوس تھے۔

سپیروں کے لڑکے بالے دوڑتے ہوئے آئے اور اسے حلقے میں لے لیا۔ میں پرے پیڑ کی اوٹ سے یہ تماشا دیکھتا رہا۔ نہ جانے بچوں کے مابین کیا باتیں ہوتی ہیں۔ پھر دیکھتا کیا ہوں کہ ایک لڑکے نے چار پانچ سانپ رمیش کے گلے میں ڈال دیے۔ میرا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ بے اختیاری کے عالم میں ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ لیکن بیٹے کو اطمینان سے ہنستے دیکھ کر میں پھر پیڑ کی اوٹ میں ہو گیا۔ دل زور زور سے دھڑکتا رہا۔ آخر سانپوں کا کیا بھروسہ! رفتہ رفتہ سانپ اس کے گلے سے سرک کر بدن پر آ گئے۔ اور پھر بل کھا کر نیچے گھاس پر لہرانے لگا۔

دس پندرہ منٹ اسی قسم کی چہلوں کے بعد رمیش...... رمتا جوگی آگے نہر کی طرف بڑھ گیا۔

چھوٹی سی نہر تھی، بہ مشکل چار ساڑھے چار فٹ چوڑی اور ڈیڑھ فٹ گہری۔ دونوں کناروں پر تنگ پڑیاں۔ پانی کی چادر کے ساتھ ساتھ ایک انگل سے بالشت بھر اونچی گھاس کا گویا جنگل سا کھڑا تھا، جس میں پیپر منٹ اور برہمی بوٹی کے پودے بھی موجود تھے۔ یہ نہر برساتی ندی کے اس پار سے بل بناتی ہوئی ادھر پہنچتی ہے، پہلے سات فٹ اونچی جھال کی شکل میں نیچے گرتی اور پھر مدھر گیت کی لے کی طرح سنبھل سنبھل کر بہہ نکلی۔ اس وقت چند بنگالی اور گوانی کچھ کچھ فاصلے پر کیکڑوں کی تاک میں نہر کے کنارے بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں لمبی مضبوط چھڑی، جس کے ساتھ بندھی ڈوری کا دوسرا سرا کینچوے کا چارہ سنبھالے پانی میں ڈوبا ہوا۔ کبھی کبھی غڑاپ کی آواز سنائی دیتی۔ چھڑی ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے کو ہٹتی، ڈوری چابک کی طرح جھٹکا کھاتی، اور ایک کیکڑا باہر آ گرتا...... گرتے ہی وہ پانی کی طرف بھاگتا لیکن شکاری لکڑی سے اس کی ٹانگیں توڑ تاڑ کر اسے تھیلے میں ڈال لیتا۔

رمیش پٹری پر بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیکڑے کیوں کر باہر آ کر گرتے تھے۔ تاہم وہ اس قدر مگن تھا کہ اسے میرے قریب پہنچ جانے کی خبر تک نہیں ہوئی...... شہر سے دور، گھر کی گہما گہمی سے الگ تھلگ پر سکون مقام پر مجھے رمیش یکسر اجنبی سا نظر آ رہا تھا۔ اس کی کچھ بے ڈول اور نکلتی ہوئی سی ٹانگیں، گول مٹول ہاتھ، سانولی لیکن انگور

کی طرح شاداب گردن اور زعفرانی رنگ کے نرم نرم بال!...... معاً میرے دل نے زبانِ خاموشی میں پکار کر پوچھا: "تم کون ہو؟"

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کتنا تجسس تھا! وہ وہاں کی ہر چیز سے کس قدر ہم آہنگ تھا۔ ایک میں تھا جو برسوں سے اپنے آپ کو دنیا کی ہر شے سے اکھڑا اکھڑا سا محسوس کر رہا تھا۔ زندگی جدوجہد کا نام ہے، کسی بزرگ نے نصیحت کی تھی...... اور میں دنیا سے لڑتے لڑتے آخر کار اس سے بے گانہ ہو کر رہ گیا۔ لیکن اس لڑکے نے ان چیزوں سے، اس فضا سے، اس گھاس پھوس سے دوستی قائم کی تھی۔ وہ ان سے پیار کرتا تھا اور یہ اس کو چاہتے تھے، اپناتے تھے۔

معاً...... رمیش کی نظر مجھ پر پڑی۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی اس کا چہرہ اتر گیا۔ منہ پر دہشت کے ساتھ ساتھ عجیب سی مردنی چھا گئی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر خود میں بھی ڈر گیا...... کیا میں اس قدر بھیانک تھا؟

رمیش کو اور کچھ نہیں سوجھا تو اس نے یونہی ہاتھ پھیلا کر کہا۔

"پپا، یہ لوگ کیکڑے پکڑ رہے ہیں۔"

دراصل خود اسے اس بات کا کچھ احساس نہیں تھا کہ وہ کیا اور کیوں کہہ رہا تھا۔

میں بھی پسر کر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا، اور سوال کیا۔ "جانتے ہو کہ کیکڑے ان کے ہاتھ لگتے کس طرح ہیں؟"

اس کی موٹی موٹی آنکھیں تجسس کی وجہ سے اور بھی بڑی ہو گئیں۔ میں تفصیل سے اسے شکار کے رموز سمجھاتا رہا۔

اس کے اسکول کا ذکر ہوا نہ میرے دفتر کا۔ نہ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ وہاں کیوں چلا آیا تھا، اور نہ اسے اس بات کی پریشانی رہی کہ میں وہاں کیسے پہنچ گیا تھا۔ چند منٹ میں اس کا سارا خوف دور ہو گیا۔ ہم دو دوستوں کی طرح بے تکلفی سے اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگے۔

اس کا جی بھر گیا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ندی کی طرف ہاتھ پھیلا کر بولا۔

"آؤ پپا اس پار چلیں۔"

میں فوراً اس پر آمادہ ہو گیا۔
میلوں دور اونچے اونچے پہاڑوں پر خوب بارش ہو چکی تھی، تاہم ندی بھر نہیں سکی۔ جابجا مٹیالے پانی کے چوڑے چوڑے خطوط دکھائی دے رہے تھے۔ کنارے پر پہنچے تو وہ اپنے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا۔ میں نے اسے روک کر کہا۔ "نہیں بیٹے! پاؤں اور ٹانگیں بھیگ جانے سے تمہیں زکام ہو جائے گا۔"
کم سے کم میرے دل میں یہی ڈر بیٹھا ہوا تھا۔
مجھے اپنے پمپ شو اتارنے میں دیر نہیں لگی، میں نے اس کو اپنی پیٹھ پر بٹھالیا، اس کی دونوں ٹانگوں کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اس نے میرے پمپ شو ہاتھوں میں لے کر باہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ اس طرح میں اپنے شو کے چمڑے کی بو سونگھتا ہوا ندی پار کرنے لگا۔
اس کی جھجک بالکل دور ہو چکی تھی، وہ طوطے کی طرح بولے جا رہا تھا۔ "پپا! ندی کے اس پار ایک بوڑھا لکڑ ہارا رہتا ہے۔ وہ سارا دن کلہاڑے سے لکڑیاں پھاڑتا رہتا ہے...... پپا! وہاں ایک سوامی جی بھی ہیں...... جٹا دھاری، اور پپا! چائے کے باغ کے پاس سکھوں کا گوردوارہ ہے جہاں حلوہ کھانے کو ملتا ہے، کڑاہ پرشاد کہتے ہیں اسے......"
ندی پار لکڑ ہارا تو دکھائی نہیں دیا، البتہ سوامی جی موجود تھے۔ ان کی آنکھوں میں نور تھا۔ جسے دیکھ کر دل کو سرور ملتا تھا۔ ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر انھوں نے پوچھا۔
"یہ آپ کا بیٹا ہے؟"
"جی، سوامی جی۔"
"بڑا سیانا اور بھولا لڑکا ہے، بڑا ہو کر آپ کا نام روشن کرے گا۔"
ان کی اس رسمی بات پر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور اسکول سے بھاگے ہوئے بیٹے پر فخر سا محسوس ہونے لگا۔
گوردوارے سے آتے ہوئے داڑھیوں والے سکھوں کو دیکھ کر یوں لگا جیسے دور دراز ہمالہ کی گپھاؤں میں سے سادھو اور مہاتما قمیصیں اور پتلونیں پہن کر اچانک ہمارے سنسار میں آگئے ہیں۔
اب ہم چائے کے باغوں میں پہنچ چکے تھے۔ بیچوں بیچ گہرائی میں وہی ندی سوئی سوئی سی بہہ رہی

تھی۔ دائیں بائیں چائے کے بے شمار پودے تھے کہیں کہیں چیڑ، دیودار اور سفیدے کے پیڑ بھی نظر آرہے تھے۔ لمبی لمبی ٹوکریاں پیٹھ پر ٹکائے پہاڑی لڑکیاں چائے کی پتیاں توڑ رہی تھیں۔ ان کے کانوں سے چاندی کی خوب بڑی بڑی بالیاں لٹک رہی تھیں، ناک میں پھولدار کیلیں چمک رہی تھیں۔ وہ لڑکیاں بھی رمیش سے مانوس تھیں۔ جو بھی اسے دیکھتی مسکرا دیتی۔

ہمیں چھوٹے چھوٹے برساتی نالوں سے بھی گزرنا پڑا۔ باغ ختم ہوئے تو کھیت شروع ہوگئے۔ وہی نہر ان کھیتوں میں سے ہو کر گزر رہی تھی۔ کہیں کہیں جھونپڑے بھی بکھرے ہوئے تھے، انھیں میں سے ایک جھونپڑے میں رہنے والی تیس پینتیس سالہ کسان عورت رمیش کو دیکھ کر ہنس دی۔

''بہت دنوں بعد آئے۔''

رمیش نے لاڈ سے میرے گلے میں باہیں ڈال کر کہا۔ ''آج پپا بھی میرے ساتھ ہیں۔''

عورت لجا گئی۔ شاید وہ سمجھتی کہ میں بہ طور خاص اسے دیکھنے کے لیے آیا تھا۔ میں نے اس کا اضطراب دور کرنے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کردیں۔ رمیش کی یہ سیدھی سادی موسی، ہمیں کچھ کھلانے پلانے پر مصر ہوئی تو میں بڑی مشکل سے معذرت کر کے آگے بڑھ گیا۔ آدھ میل آگے جا کر ہم نے وہ دوپراٹھے کھائے جو رمیش اسکول کو لے جایا کرتا تھا۔

رمیش راستے بھر اپنے قصے سناتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم دیناپور کے قصبے میں پہنچ گئے۔ یہاں سے شہر کو جانے والی بسیں مل جایا کرتی تھیں۔ چار بج چکے تھے، آسمان پر چھائی گھٹا یکایک برس پڑی۔ ہم نے قصبہ کی ایک دکان میں پناہ لی۔ بھوک پھر چمک آئی تھی۔ دُکان سے بھنے چنے اور اندرکھی (چٹپاگڑ) کھا کر پیٹ کی بھوک کچھ کم کی۔ گرم گرم چائے کے دو پیالے لے کر ہم چسکیاں بھرنے لگے۔ میں نے سگریٹ منہ میں دبایا، اسے ماچس دکھا کر دھواں اڑاتے ہوئے بولا۔ ''بیٹا! میں سگریٹ پیتا ہوں لیکن یہ بُری عادت ہے۔''

رمیش بولا۔ ''ہاں پپا! اچھے آدمی سگریٹ نہیں پیتے۔''

یہ کہتے ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا، فوراً ترمیم کر کے بولا۔ ''پپا! اچھے لڑکے سگریٹ نہیں پیتے۔''

اس کی بر محل ترمیم پر میں نے مسکرا کر ہاتھ بڑھایا اور اس کے نرم گھنے بالوں میں انگلیاں الجھا

دیں۔

سارا دن رمیش کو اسکول سے نہ بھاگنے کی نصیحت کرنے کی سوچتا رہا، لیکن ایسا کرنے کو جی نہیں چاہا۔ آخر طے کیا کہ پھر کبھی سہی۔

تیز بارش میں بھیگتی ہوئی کچھ جوان جہاں دیہاتی لڑکیاں بارہ سنگھوں کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی ادھر سے گزریں۔ مجھ پر نظر پڑی تو رُخ پھیر لیا۔ میں بدمزہ نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ میرے معصوم بیٹے کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہیں۔

بالآخر پانی ختم گیا، ہم اڈے پر پہنچے اور ٹکٹ کٹا کر بس میں پہنچ گئے۔

شہر میں پہنچے تو بادلوں کی وجہ سے پیش از وقت اندھیرا گہرا ہو گیا۔ سڑکیں اور ہمارے محلے کی گلیاں بھی بھیگی بھیگی تھیں۔ گھر پہنچے تو دیکھا میری بیوی دروازے پر پریشانی کے عالم میں کھڑی تھی۔ رمیش آگے آگے تھا۔ ماں کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی تو چلا کر بولی۔ ”ارے کہاں تھا اب تک، میں نے سارا محلہ چھان مارا......“

رمیش ماں کی ڈانٹ سن کر پلٹا اور میری اوٹ میں ہو گیا۔ میں نے بیوی سے کہا۔ ”اسے کیا کہتی ہو، یہ میرے ساتھ تھا سارا دن۔“

وہ آنکھیں نکال کر بولی۔ ”اوہو! پہلے تو بیٹا ہی بھاگا کرتا تھا، اب آپ بھی دفتر سے بھاگنے لگے؟“

محلے کے بابو گوپی ناتھ میرے ہی دفتر میں کام کرتے تھے، انھیں کی زبانی میری غیر حاضری کا پتہ چل گیا ہو گا۔

ہم، باپ بیٹا، بیٹھک میں چلے گئے، باہر صحن میں بیوی کچھ دیر تک چلاتی رہی۔ اس کا غصہ بھی بے جا نہیں تھا، آج باپ بیٹا دونوں، ہی سارا دن غائب رہے۔

سہما ہوا رمیش میری گود میں بیٹھا رہا۔ لیکن اس انداز سے جیسے وہ مجھے اپنی گود میں لے لینا چاہتا ہو۔ وہ اس بات کو شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ اسی کی وجہ سے مجھے بھی ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ نہ جانے کتنے طویل عرصے کے بعد وہ میری گود میں بیٹھا مجھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید

میرے من کے اندر سوئے ہوئے بچپن کے جاگ جانے سے اس کے اندر خوابیدہ پدرانہ شفقت جاگ اٹھی تھی! اسے اور کچھ نہیں سوجھا تو اپنی پتلی پتلی باہیں میرے گلے میں ڈال کر مجھ سے لپٹ گیا اور پھر چند لمحوں کے بعد ذرا پیچھے ہٹ کر بولا۔ "پپا! میں آپ کے کمرے میں بیٹھ کر پڑھا کروں گا...... ٹھیک ہے نا؟"

کئی مہینے گزر گئے۔ اب وہ باقاعدہ اسکول جانے لگا تھا۔ اسکول سے غیر حاضر رہنے پر اسے ماسٹر جی اور اس کی ماں نے کئی بار ڈانٹا تھا، اس پر اثر نہ ہوا۔ لیکن جب اس کی وجہ سے مجھے بھی ڈانٹ پڑی تو وہ بہت متاثر ہوا...... اس روز سے وہ ہر رات میرے کمرے میں پڑھتا ہے۔ ماسٹر جی خوش ہیں۔ اس کی ماں خوش، اور میں......

پہلے پہل مجھے بھی گہری مسرت کا احساس ہوا تھا، کیونکہ میری ڈانٹ کے بغیر وہ درست ہو گیا تھا...... لیکن رفتہ رفتہ......

رات کے نو بجے ہیں، بارش ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی کھڑکی میں سے بجلی چمکتی دکھائی دے جاتی ہے۔ رمیش مطالعہ میں محو ہے، اس کی ماں اطمینان سے بنائی کا کچھ کام کر رہی ہے۔ البتہ میں متردد ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ایک بار پھر رمیش اسکول سے اور میں دفتر سے بھاگ کر ساری دنیا کو ٹھینگا دکھا کر، اسی دن کی طرح آوارہ گردی کریں...... یہ بات اس سے کہہ نہیں سکتا۔ دل کی گھٹن بڑھتی جا رہی ہے...... پہلے وہ گمراہ تھا، اب میں گمراہ ہو رہا ہوں۔

سوچتا ہوں کہ میرا بیٹا صبح کے اجالے میں راہِ راست بھول گیا تھا، اس لیے لوٹ آیا...... جو رات کے اندھیرے میں راستہ بھول جائے وہ کیسے لوٹ سکے گا؟

نہیں، میں کبھی واپس نہیں لوٹ سکوں گا۔ میں ہمیشہ گمراہ رہوں گا۔

# نہال چند

اگرچہ میں نے پرانی کتابوں کی دُکان اس لیے بند کردی تھی کہ اس کی آمدنی بہت کم تھی اور لوگ پرانی کتابوں کی دُکان کو زیادہ وقعت دینے کو تیار نہ تھے۔ لیکن اصل بات ایک ہی تھی۔ جس کے باعث میں کوئی کام دلجمعی کے ساتھ نہیں کرتا تھا اور وہ تھی میرے ذہن کی آوارگی۔ میں نے کئی قسم کے پیشے اختیار کیے، لیکن کچھ عرصے کے بعد ترک کر دیے۔ کشمیر کی کشش سری نگر لے گئی۔ وہاں بڑے طمطراق سے پرانی اور نایاب کتابوں کا کاروبار شروع کیا۔ کشمیر کی جی بھر کر سیر کی۔ لیکن ایک نوعمر انسان کو جس شے کی ہوس ہوتی ہے، وہ وہاں اس قدر ارزاں نہ تھی۔ اس لیے من جلد ہی اچاٹ ہو گیا اور کاروبار بند کر کے واپس لاہور جانے کی ٹھانی۔

گلمرگ میں برف گرنی شروع ہو گئی تھی۔ اس خوف سے کہ کہیں برف اور زیادہ نہ پڑنے لگے اور راستہ بند ہو جانے کے سبب لاہور پہنچنے ہی سے رہ جاؤں، میں نے دُکان کا سامان اونے پونے بیچا اور ایک سہانی صبح کو لاری میں سوار ہو کر شام کو راولپنڈی پہنچا اور وہاں ایک رات کاٹ کر دوسری شام کو لاہور جا اترا۔

والد صاحب فوت ہو چکے تھے۔ اب بڑے بھائی ہی خاندان کے کفیل تھے۔ شام کو میں گھر پہنچا

تو انھیں موجود نہ پایا۔ ماتا جی مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔ انھوں نے میری بلائیں لیں اور پراٹھے پکوا کر کھلائے۔ بھابھی، ناک بھوں چڑھائے، منہ سے تو کچھ نہ کہتی تھیں، البتہ فرش پر زور زور سے پاؤں مارتی ہوئی گھومتی رہیں۔

رات کو بھائی صاحب آئے اور انھوں نے اپنی خفگی چھپانے کی ذرا برابر کوشش نہیں کی......

"کیا ابھی تک تو اپنے آپ کو دودھ پیتا بچہ سمجھتا ہے؟ اب تیری عمر بائیس برس کی ہو چکی۔ تو کسی کام کے نزدیک تک نہیں پھٹکتا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر تو ہے کس خیال میں۔ تو سمجھتا ہے کہ میں ساری عمر تجھے گھر بٹھائے کھلائے جاؤں گا۔" اور اس کے بعد انھوں نے وہ پرانی کہاوت دہرادی کہ کام پیارا ہوتا ہے چام پیارا نہیں ہوتا...... "میں بال بچے دار آدمی ہوں اور تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ بچے جوں جوں بڑے ہوتے ہیں۔ ان کے اخراجات بڑھتے جاتے ہیں لیکن تیرے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اگر تو میری یا ماتا جی اور بہنوں کی کچھ بھی مدد نہیں کر سکتا تو کم از کم اپنا پیٹ تو پال۔ اب تک تو نے کچھ کم مزے لوٹے ہیں۔ ذرا پوچھ تو ماتا جی سے، میں نے کس عمر میں کام شروع کر دیا تھا......" اور اس طرح بھائی صاحب بہت دیر تک بکتے جھکتے رہے۔ یہاں تک کہ مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ ماتا جی ٹانگوں میں دہکتی ہوئی انگیٹھی لیے بیٹھی تھیں۔ "اچھا اب رہنے دے بیٹا۔ بچارہ تھکا ماندہ آج ہی تو آیا ہے......"

اس پر بھائی صاحب اور بھڑک اٹھے۔ "تو ماتا جی! کون سے پہاڑ پھاند کر چلا آ رہا ہے۔ ایک تو آپ کے اس بے جا لاڈ نے اسے بگاڑ دیا ہے۔"

بھائی صاحب کی کڑک سن کر، گھر کی بلی جو مزے میں میاؤں میاؤں کر رہی تھی، بدک کر بھاگ گئی۔ ماتا جی نے دبی زبان سے کہا۔ "بچہ ہی تو ہے نا! آپ سمجھ جائے گا......"

اس بات پر بھائی صاحب کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ لیکن میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں اور ان کی باتوں کی آوازیں لحہ بہ لحہ مدھم ہونے لگیں۔ جیسے وہ کہیں دور چلے گئے ہوں۔

دوسرے روز جو میری آنکھ کھلی تو اچھا خاصا دن چڑھ آیا تھا۔ مجھے خوب گہری اور میٹھی نیند آئی تھی۔ طبیعت ہشاش بشاش تھی۔ رفتہ رفتہ رات کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس لیے کہ میں نے ان

باتوں سے زیادہ متاثر ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اب جوان باتوں کا خیال آیا تو دفعتاً میری رگ حمیت پھڑک اٹھی۔ یہ نہیں کہ بھائی صاحب کو کھری کھری سناؤں بلکہ یہ کہ آج کوئی نہ کوئی کام ڈھونڈ ہی لوں اور کچھ نہیں تو کم از کم کوئی نوکری ووکری ہی کرلوں۔

بھائی صاحب، بھابی، بچے، بہنیں، گھر کے سبھی لوگ باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ جب میں جاگا تو ماتا جی بستر ہی میں مجھے چائے اور مٹھیاں دے گئیں اور ہدایت کر گئیں کہ جب تک بھائی صاحب دفتر نہیں چلے جائیں۔ میں باورچی خانے میں نہ جاؤں۔

میں کپڑے پہن کر بھائی صاحب سے بھی پہلے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اب پھر اپنا لاہور تھا اور میں۔ وہی جانے پہچانے مقامات، بارونق سڑکیں، تانگوں، موٹروں، سائیکلوں کی ریل پیل۔ وہی دلہن کی طرح سجی ہوئی دکانیں۔ قطار در قطار مال روڈ کے کنارے کنارے......

راستے میں کوئی نہ کوئی آشنا مل ہی جاتا تھا اور دو چار منٹ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر ہلکی پھلکی گفتگو ہو جاتی اور پھر میں آگے بڑھ جاتا۔ اسی طرح گھومتے پھرتے میں رابن روڈ کی طرف جانکلا۔ اس جگہ اب کچھ نئی دکانیں بھی بن گئی تھیں۔ میں تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد آیا تھا۔ اس لیے مجھے تو اس جگہ کا نقشہ ہی نیا نظر آنے لگا۔ یہاں میرے ایک پرانے واقف نہال چند کی فوٹو گرافی کی دکان تھی۔ نہال چند کی عمر پچپن برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ بال تقریباً سب کے سب سفید ہو چکے تھے۔ رنگ سرخ و سپید تھا۔ لمبی لمبی مونچھیں، تیز چمکتی ہوئی آنکھیں، اکہرا بدن، اور چھوٹا قد...... یہ تھے لالہ نہال چند۔ ان کے مزاج پر عمر اور زندگی کے جھمیلوں کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جب کبھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا انھیں ہمیشہ ہی خوش و خرم اور ہنسی مذاق کا دلدادہ پایا۔ اس شخص سے میرے بہت گہرے تعلقات تو کبھی نہیں رہے تھے۔ البتہ ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ضرور تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ مجھے دیکھ پائے تو ضرور خوش ہوگا۔ بڑے مزے کا آدمی تھا، سوچا، اسے ملتا چلوں۔

جب میں اس کی دکان کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ حضرت حسبِ عادت اپنی دکان کے چبوترے ہی پر پاؤں کے بل اکڑوں بیٹھے گنا چوس رہے ہیں۔ میں قریب پہنچا تو امید کے مطابق اس نے فوراً مجھے پہچان لیا۔ بڑے تپاک سے ملا اور علیک سلیک کے بعد اپنے قریب ہی چبوترے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا

اور جڑ کی طرف سے گنے کا بالشت بھر ٹکڑا مجھے دکھا کر خاص انداز میں ہلاتے ہوئے کہا۔ "لو چوس لو۔" اس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔ وہ...... عمر و رتبہ کا لحاظ کیے بغیر ہی ہر کسی سے بے تکلف ہو جاتا اور پھر مذاق کرنے سے بھی نہ چوکتا۔

میں اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ ڈیڑھ برس کے عرصے میں اس کی صورت میں کوئی نمایاں فرق نہ آیا تھا۔ وہی متحرک بھنویں، چمکتی ہوئی آنکھیں، پھڑکتے ہوئے ہونٹ، بے چین طبیعت، وہی ہنسی، وہی ٹھٹھول۔ میں نے اسے اپنی آوارگی کے چند چٹ پٹے واقعات سنائے اور اس نے ان میں کچھ ایسی دلچسپی لی، جیسی میرا کوئی ہم عمر دوست ہی لے سکتا تھا۔ بات بات پر لا استاد ہاتھ۔

آدھ پون گھنٹہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں گزر گیا۔ پھر اس نے پوچھا کہو برخوردار! اب یہ مٹر گشت کیسی؟

میں نے جواب دیا۔ "بس یونہی گھومتے پھرتے اِدھر آ نکلا۔ آپ کو بھولا نہیں تھا میں نے سوچا درشن ہی کر لوں۔"

وہ ہنسا۔ "تو اب آئندہ کیا کام کرنے کا ارادہ ہے۔"

میں کچھ سوچ میں پڑ گیا اور پھر ایک بات جو سوجھی تو کہا۔ 'کام وام کیا اب تو نوکری کریں گے۔"

"نوکری کیسی؟"

"کوئی بھی ہو۔"

"مثلاً"

"...... مثلاً...... آپ ہی کے ہاں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہو گا کہ میں فوٹو گرافی کا کام بھی بہت اچھا جانتا ہوں۔ یاد ہے نا وہ میرے ہاتھ کے بنے نیگٹو۔"

اس کی بھنویں سکڑ گئیں۔ "اوہاں ہاں...... مگر...... بھئی بات یہ ہے کہ مجھے تو ملازم کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی زبان منہ میں گھما پھرا کر اسے مسوڑھوں پر پھیرنے لگا۔ میں جانتا تھا۔ بوڑھا بھی ایک ہی گھاگ ہے۔ شیشے میں پری اتارنا چاہتا ہے...... میں خاموش رہا۔

پھر اس نے خود بخود مہر سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ "خیر بھئی! اب تم ہو بھی بیکار...... اور بھئی سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے بھی تم سے کچھ انس سا ہو گیا ہے۔ کہو مانتے ہو کہ نہیں...... اچھا یہ تو بتاؤ لو گے کیا؟"

میں نے قدرے توقف سے کہا۔ "بندہ پرور! چالیس پر مان جاؤں گا۔"

وہ ہنس دیا۔ "دیکھو برخوردار یہ چالیس والیس کی بات تو ہے جھوٹ...... کیا سمجھے...... کہو بیس پر کام کرو گے......"

میں نے یہ بات نامنظور کر دی۔

"تو بھئی پچیس پر مان جاؤ۔ ہٹاؤ اب تمہیں پچیس ہی دے ڈالوں گا۔ جو ہو سو ہو۔ آخر تم کون پرائے ہو؟"

"ارے صاحب توبہ کیجئے۔ میں چالیس سے ایک پائی کم نہ لوں گا۔"

اب اس نے اپنے کندھوں کو حرکت دے کر کہا۔ "تو بھئی تمہاری مرضی۔"

اس کے بعد کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ جب میں اٹھ کر چلنے لگا تو اس نے میری تنخواہ تیس تک پہنچا دی۔ لیکن میں نہ مانا۔

جب میں وہاں سے لوٹا تو راستے میں اسی بات پر غور کرتا رہا کہ اگر وہ چالیس تک منظور کر لے تو پھر کچھ نہ کچھ اوپر کی آمدنی بھی ہو سکتی ہے۔ میرا کام چل نکلتا۔ ہر مہینے کچھ روپے بھائی صاحب کی ہتھیلی پر بھی دھر دیتا تو وہ خوش بھی ہو جاتے اور کبھی آڑے وقت پر کام بھی آتے۔ اتنا تو میں جانتا تھا کہ بھائی صاحب بھابی کی لگائی بجھائی کے باوجود مجھ سے محبت کرتے اور میری بہتری چاہتے ہیں۔

سوچتے سوچتے مجھے ایک بڑے مزے کی چال سوجھی۔ اس وقت میرے پاس روپیہ بھی بہت کم تھا۔ لیکن میں اپنی حقیر پونجی داؤں پر لگانے کو تیار ہو گیا۔ چنانچہ میں اسی وقت مال روڈ کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر میں پھگا مل اینڈ سنز کی مشہور فرم کے آگے رک گیا۔

پھگا مل کا لڑکا مکھن رائے میرا لنگوٹیا یار تھا۔ ان لالوں کے نام بھی عجیب تھے۔ باپ پھگا مل اور بیٹا مکھن رائے۔

دو تین میمیں دُکان سے باہر نکل رہی تھیں۔ میں ان کی چکنی پنڈلیوں کو دیکھتا ہوا اُن کے لیے

راستہ چھوڑ کر الگ کھڑا ہو گیا اور جب وہ چلی گئیں تو میں اندر داخل ہوا۔ وہی پُرانی فضا تھی۔ جہاں ہم کاؤنٹر کے پیچھے چھپ کر تاش کھیلا کرتے تھے۔ میری آنکھیں مکھن رائے کو ڈھونڈ رہی تھیں اور مکھن رائے بڑی میز کے آگے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو مارے خوشی کے ہانپنے لگا۔

مکھن رائے بس مکھن کا پیڑا ہی تو تھا۔ مزے میں کرسی پر ڈھیر ہو رہا تھا۔ اجلے پلپلے گوشت کا انبار۔

"ارے یار کہاں۔ اتنی مدت......" اس نے اپنی باریک آواز میں چیخ کر پوچھا "آنکھیں ترس گئیں تم کو، ٹکے کا کارڈ بھی تو نہیں بھیجا۔"

وہ کس قدر خوش خوش نظر آ رہا تھا، لیکن اس روز مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ حد سے زیادہ موٹے آدمی کو اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے میں کس قدر دقت پیش آ سکتی ہے۔

مجھے کرسی پر بیٹھایا گیا۔ بڑے اصرار سے آئس کریم سوڈا پلایا گیا اور پھر پان کا بیڑا کھلانے کے بعد ہاتھ میں ایک عدد اعلیٰ قسم کا سگریٹ تھما دیا گیا۔

میں نے ایک لمبا کش لگایا اور دھواں چھوڑ کر جو الف لیلیٰ کی داستان شروع کی...... تو دو اڑھائی گھنٹے آنکھ جھپکتے میں گزر گئے۔ آخر میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ رابن روڈ پر ان کی اپنی کئی دُکانیں موجود تھیں۔ میں نے کل احوال سنا کر کہا کہ مجھے عارضی طور پر ایک دُکان دلوا دو۔

اِس نے جواب دیا کہ یہ کام فوراً ہو جائے گا......

دُکان مل گئی۔

میری دُکان سڑک کے دوسری جانب تھی۔ لیکن نہال چند کی دُکان سے اس دُکان کا فاصلہ پچاس ساٹھ قدم تھا۔ میں اپنی دُکان سے نہال چند کو دُکان میں گھستے یا باہر نکلتے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دکھائی نہ دینے کے باوجود اس کی حرکات سے میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

میں نے کپڑے کے ایک بہت بڑے ٹکڑے پر جلی حروف میں یہ عبارت لکھوائی۔ "یہاں ڈیویلپنگ مفت کی جاتی ہے......" اور اسے اپنی دکان کے آگے لگا دیا۔ گھر سے چند گری پڑی پرانی فلمیں بھی اٹھا لایا اور انھیں یونہی اِدھر اُدھر لٹکا دیا۔ اپنے دوست بھی کئی ایک تھے۔ انھیں بھی سازش میں شامل کر لیا اور نتیجہ یہ کہ میری دُکان میں گاہکوں کا تانتا سا بندھا رہتا۔ تین چار روز ہی

تماشا ہوا ہوگا کہ ایک دن دوپہر کے وقت لالہ نہال چند پشت کی طرف ہاتھ باندھے خراماں خراماں میری دُکان پر آپہنچے۔ مَیں نے بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا۔ کرسی پر بٹھایا۔ پان منگوایا...... صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کافی مرعوب ہو چکے ہیں۔

''کہو بھائی یہ کیا تماشا ہے۔''

میں نے انکسار سے سر جھکا کر کہا۔ ''بس صاحب! سوچا کچھ کرنا تو ہے ہی...... چلو دُکان ہی کھول ڈالو اپنی......'' وہ چپ چاپ منہ ہلاتا رہا اور یونہی ہوا میں گھور گھور کر دیکھنے لگا۔

پھر اس نے پیک تھوک کر منہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ''اور بھئی وہ نوکری کرنے کا جو ارادہ تھا تمہارا......''

''اجی تین حرف بھیجو نوکری ووکری پر۔ میں باز آیا......''

اب نہال چند نے جبڑے ہلا ہلا کر مسوڑھوں پر چپکے ہوئے لبدے کو ہٹایا لیکن صورت سے ظاہر تھا کہ گہری سوچ میں ہے اور پھر کھانس کے حلق صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو برخوردار! نئے سرے سے کام چلانا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ کیا سمجھے! اور بھئی یہ تو کہو کہ میری دکان کو تم نے پرائی سمجھا۔ کیا تمہاری کھوپڑی میں ایک کوڑی بھر گودا بھی نہیں۔ اگر تنخواہ ہی کی بات تھی تو مجھ سے کہا ہوتا...... اچھا جو ہوا سو ہوا...... چلو تم جیتے میں ہارا! اب تمہاری بات ہی رہے......''

میں نے جی ہی جی میں خوش ہو کر بظاہر متین صورت بنا کر کہا۔ ''دیکھیے حضور! اب وہ دن ہوا ہوئے...... کیا سمجھے آپ!...... میں اور چالیس پر مان جاؤں، اجی توبہ بندہ تو اب نوکری کرنے پر تیار ہی نہیں ہے!''

نہال چند نے بھنویں سکیڑ کر میری طرف دیکھا۔ ''اچھا...... بننے لگے اب۔''

''نہیں یہ حقیقت ہے...... اپنے کام کی بات ہی کچھ اور ہے...... میں گورنمنٹ کالج میں گیا تھا۔ وہاں سب لوگ میرے واقف کار ہیں۔ پروفیسر پریم چند چوپڑا کہتے تھے کہ آئندہ سارا کام تمہیں کو دیا کریں گے۔ دیال سنگھ کالج میں بھی تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ اور ہاں! ایس۔ ڈی کالج بھی گیا تھا......'' اس بات پر وہ چونکا۔ مجھے یاد تھا کہ جب میں پہلے دن اسے ملنے کے لیے اس کے ہاں گیا تھا تو

ایس ڈی کالج کے چند طلبا اس کے ہاں آئے ہوئے تھے اور اس کی سہل انگاری کی شکایت کر رہے تھے۔ چنانچہ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا...... ''تو لڑکوں کے سیکرٹری نے کہا۔ نہال چند بہت ست آدمی ہے۔ اس کا کام تسلی بخش نہیں ہے...... اس لیے آئندہ ہم سارا کام تم کو دیا کریں گے...... اور تو اور کل مجھ سے مکتی فوج والی میم صاحب نے کہا کہ ''نہال چند کھر اب کام کرتا...... آگے سے ہم تم کو دینا مانگتا......''

نہال چند نے اب ہتھیار ڈال دیے اور مرعوب ہو کر بولا۔ ''برخوردار جانتا ہوں تم نے مجھے پریشان کرنے کے لیے یہ دکان کھولی ہے۔ یہ ہے بھی درست تم خود تو کام کیا کرو گے البتہ میری چلتی میں روڑا اٹکا ہی دو گے...... اچھا کہو تم کیوں کر میری جان چھوڑو گے؟''

میں نے مسکین بنتے ہوئے کہا۔ ''میں تو آپ کا داس ہوں...... زیادہ لالچ تو ہے نہیں۔ بس پچاس روپے پر مان جاؤں گا۔''

اس پر حضرت بری طرح تڑخے۔ ''یہ سراسر چار سو بیس ہے...... چار سو بیس کیا آٹھ سو چالیس ہے...... یاد رکھنا......'' یہ کہا اور مٹھیاں کس کر میری جانب دیکھا۔ میں سر تسلیم خم کیے کھڑا تھا...... پھر جیسے غبارے میں سے ہوا نکل جائے۔ ''اچھا استاد مان لیا تمہیں کل سے کام شروع کر دو۔''

''اقرار نامہ لکھا جائے گا۔''

''ہاں ہاں بھئی ضرور لکھا جائے گا۔''

اور جب وہ اٹھ کر خوش و خرم واپس جانے لگا تو میری کمر میں ہاتھ ڈال کر بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھنے لگا۔ ''ہاں یار کہو تو وہ مکتی فوج کی ڈھڈو نے واقعی یہ بات کہی تھی کہ...... نہال چند کھر اب کام کرتا...... اور...... آگے سے ہم تم کو دینا مانگتا......''

اس کی گھنی بھنوؤں تلے اس کی روشن آنکھیں شوخی سے چمک رہی تھیں۔

دوسرے دن سے میں اس کے ہاں ملازمت کرنے لگا۔ اقرار نامہ بھی لکھا گیا اور اس میں احتیاطاً ایک شرط میں نے یہ بھی شامل کروا دی کہ اگر اس نے مجھے نوکری سے برطرف کیا تو ایک ماہ کی تنخواہ زائد دینی پڑے گی۔

اس کی دُکان میں دو ملازم پہلے ہی سے موجود تھے۔ ایک اس کا شاگرد اور دوسرا پرنٹر۔ پرنٹر ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اور اس کے گھر میں کوئی نہ کوئی بیمار ضرور رہتا تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ بیماریوں اور دواؤں کے اخراجات کا رونا روتا رہتا۔ نہال چند کا شاگرد عجب روکھی سی طبیعت کا تنہائی پسند نوجوان تھا۔ اس کا منہ قدرے پھولا سا تھا جیسے وہ سب سے روٹھا ہوا ہو۔

دکان کا کام عجب طریقے سے چل رہا تھا۔ سامان اِدھر اُدھر بکھرا ہوا، گرد اڑتی ہوئی، دیواروں پر چھپکلیاں مکھیوں پر جھپٹتی ہوئی اور کونوں میں مکڑیوں کے جالے لہراتے ہوئے۔ دُکان میں کبھی فوٹو کا کاغذ نہ ہوتا، کبھی مسالہ ندارد اور کبھی لوشن ختم!

نہال چند اپنا کام چلانے کے لیے غیر معمولی جدوجہد نہ کرتا تھا۔ وہ اسے بس چالو رکھتا تھا۔ اس نے فوٹوگرافی کی ضروریات کی چیزیں کبھی ایک ہی مرتبہ لاکر نہ رکھیں۔ حال یہ تھا کہ اِدھر کام آیا پڑا ہے اور ادھر چھوکرے کو کاغذ کے لیے بھگایا جا رہا ہے۔

دکان میں کام بالکل ہی ختم ہو جانے پر وہ دو ڈھائی گھنٹے کے لیے دکان سے رخصت ہو جاتا۔ شہر کے کالجوں اور کوٹھیوں کے چکر لگاتا اور بالآخر کچھ نہ کچھ کام لے ہی آتا...... یہ ایک قطعاً علیحدہ بات ہے کہ بعض اوقات بہت زیادہ کام مل ہی جاتا تھا اور اسے خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ مگر اپنی طرف سے اس نے کام بڑھانے کے لیے زیادہ زور کبھی نہیں لگایا۔ بلکہ اگر کام کافی موجود ہو تو پھر ہر شخص اسے مرعوب کر سکتا تھا۔ مثلاً کوئی دن ایسا ہے کہ جیب میں پیسہ نہیں کام بھی کم ملا ہے تو گاہک کے تقاضا کرنے پر اس کے اندازِ گفتگو میں دنیا بھر کی ملائمت جمع ہو جاتی...... "بندہ پرور! یہ ہاتھ میں تھوڑا سا کام ہے۔ بس اس کے بعد فوراً آپ ہی کا کام شروع کیا جائے گا۔"

گاہک برہم ہو کر کہتا۔ "دیکھیے نا! آپ مجھے پریشان کرتے ہیں۔ پرسوں کا وعدہ تھا۔ آپ نے کام کر کے نہیں دیا، کل آیا آپ نے انکار کر دیا...... اور پھر آج......"

"حضور...... آج کا کیا ذکر ہے۔ آج تو ابھی شروع ہی ہوا ہے۔ ختم تو نہیں ہو گیا۔ رہی پرسوں کی بات، سو آپ کو معلوم ہی ہے۔ اس روز ہولی کی چھٹی تھی، اور جناب کل یونہی بادل گھرے رہے...... اب دیکھیے سر سے بلا ٹالنے والا کام تو ہم کرتے نہیں۔ آپ ہی کہیے کہ اگر آسمان پر بادل

چھائے ہوں......"

"جی یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن...... لیکن آپ کو گاہکوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے......"

"ارے آپ گاہک ہیں۔" یہ کہہ کر اپنے مخصوص انداز میں ہنسنے لگتا۔ "نہیں صاحب ہم تو آپ کو گاہک نہیں سمجھتے......" پھر مجھے وہ آواز دیتا۔ "دیکھئے بابو یوگراج جی...... یہ ہیں ہمارے...... اب کیا کہوں...... بس گاہک کے سوا کچھ ہی سمجھ لو...... ہمارے کرم فرما...... اور سنیئے کان کھول کر۔ آج ان کا کام انھیں مل جانا چاہیے...... کیا سمجھے؟...... خواہ کچھ بھی ہو۔ گورنمنٹ کالج والوں کا کام جہاں تک کیا ہے بس وہیں چھوڑ دوں کوئی ضرورت نہیں اس کے کرنے کی جب تک کہ آپ کا کام ختم نہ ہو جائے......"

اس قسم کی چکنی چپڑی باتیں سن کر گاہک خوش ہو جاتا اور نہال چند حسب موقعہ بعض اوقات گاہک کی کمر میں ہاتھ ڈال لیتا اور بعض دفعہ بڑے ادب سے بار بار سر تسلیم خم کرتا اور جی بندہ پرور...... جی بندہ پرور کی رٹ لگائے جاتا...... یہ قصہ بس اسی جگہ ختم نہ ہو جاتا تھا بلکہ گاہک پر وہ کچھ ایسے ڈورے ڈالتا کہ رخصت ہونے سے پہلے وہ دو چار روپے بھی دے جاتا۔
جب کبھی نہال چند کی جیب گرم ہوتی تو پھر اس کا رویہ بالکل مختلف ہوتا تھا۔ ایسے موقعہ پر جب گاہک آتا۔ نہال چند دُکان کے چبوترے پر اپنی ترنگ میں آنکھیں نیم وا کیے بیٹھا ہوتا یا گنا چوسنے میں مصروف ہوتا یا سنگترے کی پھانکیں کھانے میں منہمک...... گاہک آتا۔ "ہمارا کام ہو گیا۔" پہلی مرتبہ سوال ہونے پر وہ عموماً چپ رہتا۔ دوبارہ سوال کیے جانے پر روکھا سا جواب دے دیتا۔ "ابھی نہیں ہوا۔"

"تو پھر؟"

"بس ہو جائے گا۔"

"کب؟"

اس پر وہ کچھ گرم ہو کر کہتا۔ "بس ہو ہی جائے گا۔ میں لکھ کر تو نہیں دے سکتا کہ کب ہو گا۔"
اس پر گاہک شکایتوں کے دفتر کھول دیتا۔ لیکن وہ چپ ہی رہتا۔ گاہک پوچھتا "تو پھر کب آؤں؟"

"کہہ دیانا...... کل ول آجایئے گا۔"

"یہ ناممکن ہے مجھے آج ہی شام چاہیے۔ واہ صاحب یہ بھی خوب رہی......"

اس پر وہ چمک کر کہتا۔ "بندہ پرور! ہم بھی انسان ہیں۔ جانور یا مشین تو ہیں نہیں۔ ایک تو ہمارے پاس کام زیادہ اور پھر سبھی گاہک بہترین کام کروانا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے تو کچھ وقت چاہیے۔ ان بھاڑے کے ٹٹوؤں کی طرح نہیں کہ بس اپنا الو سیدھا کر کے بچارے گاہک کو چلتا کیا۔"

اس پر گاہک مرعوب سا ہو کر واپس چلا جاتا۔

وہ روز کی آمدنی بلاناغہ گھر لے جاتا اور جہاں تک میرا خیال ہے وہ پس انداز کچھ بھی نہیں کرتا تھا۔ جو آیا چٹ۔ اول تو خود ہی بڑا چٹوزا تھا۔ سارا دن منہ ہلائے جاتا اور پھر گھر میں اس کا جوان بیٹا جو کالج میں پڑھتا تھا۔ نئی نویلی بہو اور آٹھ ماہ کی پوتی، نوکر وغیرہ ادھر دُکان کے اخراجات علیحدہ تھے۔ تین نوکروں کی تنخواہیں، دُکان کا کرایہ اور بیسیوں بکھیڑے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ایسے کھلے خرچ کے بعد اس کے پلے کیا پڑتا ہوگا۔ ہر روز جب دُکان پر آتا تو جیب خالی...... بالکل بائبل کے اس مقولے کے مطابق کہ "اے خدا ہماری آج کی روٹی آج ہمیں دے۔"...... مگر تھا قسمت کا دھنی۔ عام طور پر ہر روز اسے ایک اچھی خاصی رقم مل جاتی تھی۔ آمدنی کے کم و بیش ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا رویہ نہ صرف گاہکوں سے بدل جاتا تھا بلکہ گھر والوں سے برتاؤ میں بھی فرق پڑ جاتا تھا۔

ان کے گھریلو نوکر کا معمول تھا کہ ہر روز شام کو "بی بی جی" یعنی بڈھے کی بہو کے حکم کے مطابق وہ دُکان پر نہال چند سے یہ پوچھنے کے لیے آتا کہ رات کو کھانے کے لیے کیا چیز پکائی جائے۔

اگر اس کی جیب میں خوب سی رقم ہوتی تو دور ہی سے نوکر کو آتے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل جاتیں۔ رخساروں پر لہو جھلکنے لگتا۔ نوکر قریب پہنچتا تو پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہے۔ وہ خود ہی ہنس کر کہتا۔ "سنا بے منڈو! آج تو اتنا خوش کیوں ہے بے۔"

نوکر ابھی تیرہ چودہ برس کا لڑکا ہی تھا لیکن بڑا چلتا پرزہ۔ نہال چند کو خوش دیکھ کر وہ خود بھی خوب دانت نکال کر ہنستا...... "جی کچھ نہیں۔"

"ابے کچھ نہیں کے بچے جھوٹ مت بول بتا تو کوئی لمڈیا تو نہیں پھنسالی۔ اور اب تو سالے

"بہت تھوڑی سی ہے۔"

"اور وہ ماش کی۔"

"بہت ہی کم ہے۔"

"وہ چنے کی دال۔"

"تھوڑے سے دانے بچے ہیں۔"

اس پر وہ چلا کر کہتا۔ "ابے الو سب کو ملا کر پکالو۔ گھلی ملی دال۔ کمبخت کچھ اپنا دماغ بھی لڑایا کر......"

پھر منڈو سر جھکائے زمین کی طرف دیکھتا ہوا واپس چلا جاتا۔

نہال چند کو اپنے لڑکے سے جسے وہ "ننھا" کہہ کر پکارتا تھا، بہت زیادہ محبت تھی۔ "ننھا" شادی شدہ تھا، ایک بچی کا باپ تھا۔ لیکن ایک عرصے سے کالج میں بی اے کا متعلم تھا۔ کئی برس سے وہ امتحان پاس نہیں کر پایا تھا۔ بی اے پاس نہ ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ فیل ہوتا رہا ہو بلکہ اس نے کبھی امتحان ہی نہیں دیا تھا اور امتحان نہ دینے کا سبب یہ تھا کہ ...... جب ننھا باپ کے پاس دُکان پر آتا۔ باپ پوچھتا۔ "بیٹے تم لوگوں کے امتحانات کب شروع ہوں گے۔"

"جی اپریل میں۔"

"اپریل میں۔" نہال چند منہ پھیلا کر پوچھتا۔

"جی۔" مسکین سا جواب ملتا۔

"اپریل میں تو بہت زیادہ گرمی ہو جاتی ہے بیٹے۔"

"جی۔"

"اچھا تو بیٹا! اب کے امتحان مت دے پھر دے دیں گے۔ آخر جلدی بھی کیا ہے۔" اس کے بعد نہال چند مجھ سے مخاطب ہو کر کہتا۔ "بابو یوگ راج! ابھی بچہ ہی تو ہے نہ۔"

میرے پلے سے بھلا کیا جاتا تھا میں فوراً جواب دیتا۔ "جی اور کیا۔ ابھی تو "ننھا" بچہ ہے۔ کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ امتحان کا کیا ہے اور پھر اس قدر گرم موسم......"

اس دوران میں اس کا جیم شحیم "ننھا" سر نیچے ڈالے خاموش کھڑا رہتا۔ میری یہ بات سن کر

نہال چند پھولا نہ ساتا۔ ''ہاں اور کیا..... مت دو امتحان بیٹے..... جاؤ کھیلو۔''

اس پر بھی ''ننھا'' اپنی جگہ کھڑا رہتا۔ نہال چند اس کی پیٹھ تھپتھپا کر کہتا۔ ''بیٹے کچھ اور چاہیے۔''

اس پر ننھا کھڑے کھڑے یونہی فرش کو پاؤں سے کرید ڈالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اپنا دھڑ عجب بے ڈھنگے طریقے سے ہلا ہلا کر ادھر اُدھر جھولنے لگتا ''جی..... یونہی..... میں بائیسکوپ جاؤں گا۔''

''بائیسکوپ جاؤ گے؟ جاؤ بیٹے..... جاؤ..... بابو یوگ راج ننھے کو بائیسکوپ کے لیے پیسے دے دو۔''

''اور پتا جی۔'' ننھا لاڈ سے منہ پھلا کر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہتا..... ''میرے ساتھ میرے چار دوست بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہمیں بھی لے چلو.....''

جتنے روپوں کی ضرورت ہوتی۔ نہال چند اسے دے دیتا..... اس طرح اس کا بے کار لڑکا دوسرے تیسرے روز دُکان پر آ جاتا تھا۔ وہ در حقیقت بڑا لاڈلا اور سیدھا سادا نوجوان تھا..... اگر کبھی وہ دھوپ میں چلا آئے تو چاہے سردیوں ہی کا موسم کیوں نہ ہو۔ نہال چند ہمیشہ اس سے خفا ہوتا کہ وہ دھوپ میں اتنی دور کیوں چلا آیا۔

نہال چند خود بھی کھانے پینے کا شوقین تھا۔ باہر سے گھوم پھر کر دُکان پر واپس آتے ہی مجھ سے کہتا، ''بابو یوگ راج کہو کچھ پیسے ویسے آئے یا نہیں۔'' اور پھر تجوری میں سے نکال کر انھیں گننے لگتا اور گنتے گنتے میری آنکھ بچا کر دو تین روپے اڑا لیتا..... اس بارے میں وہ مجھ سے نہ معلوم کیوں ڈرتا تھا۔ روپے اڑا لینے کے بعد وہ، ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کرتا اور پھر کھانستا ہوا دکان کے باہر والے کمرے میں جا کھڑا ہوتا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھل والے کی آواز آتی۔ ''بینگو والا۔ ہجور بینگو والا۔'' بھلا نہال چند کو صبر کہاں۔ کیا مجال جو کوئی بھی خوانچے والا ادھر سے گزرے اور نہال چند کی رال نہ ٹپکے۔ چنانچہ وہ دن بھر پھل، آئس کرم، آلو کی ٹکیاں اور پاپڑ پکوڑیاں کھاتا رہتا۔ لیکن کھاتے وقت مجھے ضرور بلا لیتا۔

گاہکوں کے حساب کتاب کا یہ حال تھا کہ رُکی ہوئی رقمیں دروازے پر یا کرسی کے بازو پر یا دیوار

پر لکھ لیتا تھا۔ زبانی بھی اسی طرح حساب یاد رکھا تھا کہ فلاں بادامی رنگ کی پگڑی والے سردار سے تین روپے سوا چار آنے لینے ہیں۔ فلاں رنگ کے جمپر والی کرنٹی سے دو روپے اور فلاں مکھی کی سی مونچھوں والے آدمی سے دو روپے سات آنے اور مکتی فوج والی میم سے...... مکتی فوج والی میم سے اسے بہت انس تھا۔ وہ میم عموماً دُکان پر آیا کرتی تھی اور یوں تو قبول صورت اور چال ڈھال والی عورت تھی۔ لیکن عمر کچھ زیادہ ہو چکی تھی۔ جسم میں بھی بھاری پن پیدا ہو گیا تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی آنکھیں بڑی کٹیلی تھیں۔ فراخ سینے میں بھی ابھی تناؤ باقی تھا اور قدو قامت میں نہال چند سے چار انگلی بڑی ہی تھی۔ نہال چند اس کے سامنے بچھا جاتا تھا۔ خوب لہک لہک کر اور بعض اوقات لنک لنک کر باتیں کیے جاتا۔ جس وقت میم صاحب دکان میں داخل ہوتی وہ سب گاہکوں کو میرے سپرد کر کے خود اس سے باتیں کرنے لگتا۔ یورپین لوگ یوں بھی ہنس کر بات چیت کرنا معیوب نہیں سمجھتے۔ اور پھر تبلیغ کرنے والے عوام میں خوب گھل مل جانا اپنے مقصد کے لیے مفید بھی سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ میم بھی ضرورت سے زیادہ دُکان میں ٹھہری رہتی۔ شاید نہال چند نے اسے بھی کوئی جھانسا دے رکھا ہو۔ ورنہ اس کی آم کی سی صورت ایسی نہ تھی کہ میم اس پر ریجھ جاتی۔

اس طرح دن بڑے آرام سے گزرتے رہے۔ نہال چند نے دکان کا سیاہ و سفید میرے سپرد کر رکھا تھا اور میں بھی اس کے اعتماد کا ناجائز حد تک فائدہ نہیں اٹھاتا تھا۔ البتہ پان سگریٹ کے لیے چند آنے اِدھر اُدھر کر دینے میں حرج بھی نہیں سمجھتا تھا۔ جس روز چاہتا چھٹی بھی منا لیتا تھا۔ ایک مرتبہ جب نہال چند دن کے گیارہ بجے کے قریب دُکان سے باہر جانے لگا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ دوپہر کو دو بجے سے پہلے پہلے واپس پہنچ جائے۔ مجھے خود چند دوستوں کے ساتھ سینما کا میٹنی شو دیکھنے کے لیے جانا تھا۔ میں نے بار بار تاکید کی کہ وہ ضرور وقت پر واپس پہنچ جائے تاکہ میرے دوست بائیسکوپ پر میرا انتظار ہی کرتے نہ رہ جائیں۔ اس نے بھی مجھے یقین دلایا کہ میں ضرور واپس چلا آؤں گا۔ چنانچہ میں مطمئن ہو گیا لیکن حضرت بھلا کہاں پہنچنے والے تھے۔ ہر گھڑی یہی گمان ہوتا تھا کہ شاید اب آ جائے، اب آ جائے لیکن اسے نہ آنا تھا نہ آیا۔ یہاں تک کہ میں مایوس ہو گیا اور پھر آیا، تو سات بجے کے قریب، جب کہ دوسرے شو کا وقت بھی گزر چکا تھا۔ مجھے بہت کوفت ہوئی۔ جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ لیکن وہ مجھ سے بات کیے بغیر دُکان کے چبوترے پر جا

بیٹھا۔ اِدھر سے کابلی چنوں والا گزرا تو اس نے اسے بلایا اور مجھے بھی آواز دی۔ میں نے انکار کر دیا۔ لیکن جب اس نے بڑا اصرار کیا تو میں اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ میرا منہ مارے غصہ کے پھول رہا تھا۔ چنے کھانے کے بعد اس نے بڑی مسکین آواز میں کہا۔ "بیٹا یوگ راج......" وہ بزرگ تھا کبھی بیٹا بھی کہہ لیتا تھا...... "سنو بھائی اب تمہیں اصل بات سناتا ہوں۔ آج میں یوں ہی گھومتا ہوا لارنس گارڈن چلا گیا۔ وہاں ایک خاموش گوشے میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔" یہ کہہ کر اس نے ہلکی سی ایک سرد آہ بھری...... "جانتے ہو کیا ہوا؟ بس مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی...... میں سوچنے لگا یہ دنیا کیا ہے۔ یہ انسان کیا ہے۔ یہ پرماتما کیا ہے۔ یہ خاک کا پتلا کیوں بنایا گیا ہے۔ اس دنیا میں آخر کسی کو رہنا تو ہے نہیں...... اف کس قدر تنہائی تھی وہاں پر۔ مکمل خاموشی۔ میں اس قسم کی باتیں سوچنے لگا۔ یہاں تک کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک اور گہری سانس لے کر سرد آہ بھری۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرا جی پسیجا اور جب میں نے شام کے دھندلکے میں اس کی بے نور آنکھوں، جھریوں والے چہرے اور نیچے کو لٹکی ہوئی سفید سفید مونچھوں کی طرف دیکھا، تو میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کی متین صورت میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی اور دنیا کی ناپائداری کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ میں نے سوچا بچارے بوڑھے کو اپنے گزرے ہوئے دن اور کھوئی ہوئی جوانی یاد آ گئی ہو گی۔ اس قسم کی باتیں سوچ کر میرے دل سے نہ صرف ساری کدورت دور ہو گئی بلکہ میں الٹا اسی کو تسلی دینے لگا۔ زندگی کے فلسفے پر جو تھوڑا بہت میں کہہ سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ وہ غور سے میری باتیں سنتا رہا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ بس گاہے گاہے ایک ہلکی سی سرد آہ کھینچ کر رہ جاتا۔

دوسرے روز مجھے ایک اور شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت اس روز سارا دن گھوڑ دوڑ کے میدان میں بازی لگاتے اور مکتی فوج کی میم صاحب کے ساتھ شام تک اِدھر اُدھر مٹرگشت کرتے اور چہکتے رہے تھے۔ مجھے یقین نہ آیا تو وہ شخص کہنے لگا کہ میں نے نہال چند کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور میں یہ اس کے منہ پر کہنے کو تیار ہوں۔ میں دُکان جا رہا تھا، وہ آدمی بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ اسے بھی اسی رستے سے گزرنا تھا۔ نہال چند دور سے چبوترے پر بیٹھا دکھائی دیا۔ ہم دونوں کو

ساتھ ساتھ دیکھا تو دُکان کے اندر گھس گیا۔ خیر وہ شخص تو آگے بڑھ گیا اور میں دُکان کے اندر چلا گیا۔ میں نے ایک نیگیٹو کو سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''لالہ جی میں نے آپ کی ایک شکایت سنی ہے۔''

''کیا؟''

میں نے جواب دینے کے لیے اس کی طرف دیکھا تو وہ تنکے سے دانت کریدتے ہوئے شوخ انداز سے کچھ اس طرح مسکرایا کہ اور کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔

میں تین چار ماہ تک وہاں ملازم رہا۔ آخر میں حسبِ عادت اس ملازمت سے جی تنگ آگیا۔ ایک روز کسی چھوٹی سی بات پر بگڑ کر اپنے گھر جا بیٹھا اور دوسرے روز دُکان پر بھی نہ گیا۔

مجھے میرے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ اس نے جب نہال چند سے پوچھا کہ بابو یوگ راج کہاں ہے تو اس نے جواب دیا کہ میں نے اسے نکال دیا ہے۔ مجھے یہ سن کر بڑا طیش آیا۔ فوراً وکیل سے مشورہ کر کے میں نے اسے نوٹس بھیج دیا کہ چونکہ تم نے مجھے نکال دیا ہے اور اس بات کی شہادت بھی موجود ہے اس لیے اب تم اقرار نامے کے مطابق نہ صرف میری پچھلے مہینے کی تنخواہ دو بلکہ ایک ماہ کی زائد تنخواہ بھی ادا کرو۔

نوٹس ملتے ہی اس نے فوراً کل رقم مجھے بھیج دی۔ اس کے بعد ایک روز بازار میں ملا تو کہنے لگا کہ میں نے کب کہا تھا کہ یوگ راج کو نکال دیا ہے۔ میں نے کہا۔ ''گواہ پیش کروں؟'' اس پر وہ بڑے پیارے انداز میں مسکرایا...... ''اور اگر میں نے کہا بھی ہو تو کیا تم میرے بیٹے نہیں ہو۔''

اس کی مسکراہٹ اور بوڑھی آنکھوں کی چمک میں عجب دل کشی تھی۔ میں نے کہا، ''اب ساری تنخواہ کون واپس کرے۔'' وہ فوراً بولا۔ ''تو نصف پر ہی مان جاؤ۔''

میں نے آدھی تنخواہ کے روپے اسے واپس دے دیئے۔

بھائی صاحب نے مجھے زیادہ عرصے تک بیکار نہ بیٹھنے دیا۔ بمبئی میں کاروبار کی صورت نکل آئی۔ مجھے بھی بمبئی دیکھنے کی تمنا تھی۔ فوراً آمادہ ہو گیا۔ بھائی صاحب نشیب و فراز سمجھا کر دفتر کو چل دیے۔ میں اسٹیشن پر پہنچا۔

وہاں مجھے نہال چند دکھائی دیا۔ نہ جانے اسے کیوں کر معلوم ہو گیا کہ میں جا رہا ہوں۔ مجھے الوداع کہنے کے لیے پلیٹ فارم پر آن پہنچا۔ جب میں گاڑی پر سوار ہو گیا، اور گارڈ نے سیٹی بجا دی تو

اس نے اس چھوٹی سی پوٹلی بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو اس میں آلو کے پراٹھے ہیں...... اچار بھی ہے اور پیاز بھی۔ بھوک لگے گی تو راستے میں کھالینا۔"

میں نے پوٹلی لے لی۔ گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ چل دی۔ میں نے پوٹلی ٹٹولتے ہوئے شرارت سے کہا۔ "کیا واقعی یہ پراٹھے ہماری بھابی کے نازک ہاتھوں کے پکے ہوئے ہیں۔"

یہ سُن کر اس نے پاؤں زمین پر مار کر کہا۔ "کھڑا تورہ......پاجی......" اور پھر اس کے لبوں پر وہی پرانی شوخ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

گاڑی بڑھتی جارہی تھی اور سفید شلوار اور طرے دار پگڑی میں گڈا سا نہال چند الوداعی رومال ہلا رہا تھا۔

# خوددار

جن دنوں صوبہ بہار میں زلزلہ آیا میں آسام کی ایک غیر معروف ریاست میں بحیثیت ایک انجینئر ملازم تھا۔ زلزلے کے بعد ریلیف کا کام شروع ہوا تو میں نے بھی ملازمت کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ ریاست کا وزیر ایک بارسوخ شخص تھا۔ اس کے ساتھ میرے اچھے مراسم تھے۔ چنانچہ مجھے ملازمت مل گئی۔ میرا کام بہت تسلی بخش تھا۔ جلد ہی اگزیکٹو انجینئر بنا کر موتی ہاری بھیج دیا گیا۔

اس جگہ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ قدرت کی تباہ کاریاں دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ہمارا دفتر میری کوٹھی کے قریب ہی تھا۔ دفتر کی عمارت ابھی زیرِ تعمیر تھی۔ تین چار کمرے ہمارے تصرف میں تھے۔ سوائے میرے کمرے کے باقی کمروں میں سفیدی بھی نہ ہوئی تھی۔ فرش کی بھدی اینٹوں کو چھپانے کے لیے دری بچھا دی گئی تھی۔ میرے کمرے میں دو بڑی کھڑکیاں اور دروازے تھے۔ ایک دروازہ بڑے کمرے میں کھلتا تھا۔ یہاں کلرک کام کرتے تھے۔ اس وقت عملہ میں آٹھ کے قریب اشخاص تھے۔ چپراسی ان کے علاوہ۔

زلزلے نے جہاں ایک طرف خاندان کے خاندان تباہ اور بدحال کر دیے تھے۔ وہاں بیکاروں کے لیے روزی کے دروازے بھی کھول دیے۔ کئی اشخاص کے لیے یہ سانحہ دولت و شادمانی کا مژدہ لے کر آیا تھا۔ جب شام کے وقت ہم لوگ سیر کے لیے باہر نکلتے تو جگہ جگہ دھرتی ماتا کو نہنگ کی

طرح منہ کھولے پاتے۔ بچے حیرت سے ان اتھاہ دراڑوں میں جھانکتے۔

سردیوں کی ایک صبح کو جب میں دفتر میں پہنچا، تو رگھوناتھ نے کاغذوں کا بڑا سا پلندہ میرے سامنے رکھ دیا۔ پچھلی شام کو میں دورے سے واپس آیا تھا۔ تین چار دن کے کاغذات جمع ہو گئے تھے...... پہلے رگھوناتھ کاغذات رکھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ لیکن آج وہ ہاتھ سہلاتا ہوا میری میز کے قریب ہی کھڑا رہا۔ یہ سوچ کر کہ شاید وہ مجھے کچھ کہنا چاہتا ہے میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری ذہنی کش مکش میں مبتلا تھا۔

پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہے چپڑاسی خبر لایا کہ پنڈت دیوی دیال اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ میں اس چاپلوس شخص سے ملنا نہ چاہتا تھا لیکن میری غیر حاضری میں وہ کئی مرتبہ میری کوٹھی کے چکر لگا چکا تھا۔ بچوں کے لیے پھل اور مٹھائیاں بھی دے گیا تھا...... میں نے اس کو بلوا لیا۔ اس پر رگھوناتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

دیوی دیال سنیما کے پاس لایا تھا۔ وہ شہر کا ایک متمول رئیس تھا۔ اس کے باوجود وہ میری اس قدر زیادہ چاپلوسی کر رہا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ دھکے دے کر باہر نکلوا دوں۔ میری بے اعتنائی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے دور از کار اشاروں سے اپنا مدعا بیان کیا وہ چاہتا تھا کہ میں ٹھیکیداروں سے اس کے بھٹے کی اینٹوں کی سفارش کروں......

میرا دھیان رگھوناتھ کی طرف تھا۔ رگھوناتھ ہمارے عملے میں سب سے معمر شخص تھا۔ بلکہ دوسرے تو سب کے سب نوجوان تھے۔ دسویں پاس سٹینوگرافر، نشست و برخاست میں سلیقہ مند، بات چیت میں ہوشیار، لیکن مجھ کو رگھوناتھ پر ہی بھروسہ تھا وہ ہمیشہ رُک رُک کر دھیمی آواز میں بات کرتا۔ اس کو دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک ذمہ دار شخص ہے۔ اسی وجہ سے اس کو کام بھی زیادہ کرنا پڑتا تھا۔

نوکری کے لیے وہ براہ راست مجھ کو ملنے کے لیے آیا تھا۔ دوپہر کے وقت کھانا کھانے کے بعد قیلولے کے لیے پلنگ پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ نوکر نے رگھوناتھ کا ملاقاتی کارڈ لا کر دیا۔ میں نے اس کی بے وقت آمد کو محسوس کیا۔ نوکر کی زبانی معلوم ہوا کہ ملازمت کے لیے آئے ہیں۔ میں نے جواب

دیا کہ دفتر میں ملیں۔

اتفاق کی بات اس وقت میں ڈرائنگ روم میں ایک کتاب لینے کے لیے گیا۔ سونے سے پہلے کسی رسالے یا کتاب کی ورق گردانی کرنا میری عادت سی ہوگئی تھی۔ کھڑکی میں سے مجھ کو رگھوناتھ واپس جاتا ہوا دکھائی دیا۔ کھدر کا ایک نیل لگا ہوا پاجامہ۔ انگلش ٹویڈ کا ایک پرانا گرم کوٹ، سر پر کالے رنگ کی گول ٹوپی، گھٹنے کے قریب اس کے پائجامے میں ایک ابھار سا پیدا ہو گیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھ کو خیال آیا کہ بچارا بوڑھا شخص ہے۔ اس کو بلا لینا چاہیے۔ چنانچہ نوکر بھیج کر میں نے اسے بلوا لیا۔

جب میں نے اس کے چہرے پر خصوصاً اس کی نیچے کو لٹکتی ہوئی سفید مونچھوں پر نگاہ ڈالی تو مجھ کو اپنا جواب یاد کر کے افسوس ہوا۔ اس نے آتے ہی بے موقع آمد کے لیے معذرت چاہی، اس نے کہا کہ وہ میرا زیادہ وقت خراب نہیں کرے گا۔ وہ نوکری کے لیے آیا تھا، ٹائپ کرنا جانتا تھا۔ ہر قسم کی کاروباری نیز دفتری خط و کتابت میں اس کو کافی تجربہ حاصل تھا۔

میں نے اس کو شام تک بٹھائے رکھا۔ وہ اسی جگہ کا باشندہ تھا۔ میں اس سے مختلف باتیں پوچھتا رہا۔ اس کے چشم دید واقعات کے حالات بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔ باتوں باتوں میں میں نے اس کے ذاتی حالات بھی معلوم کر لیے۔ پہلے وہ ایک متمول شخص تھا۔ اس نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ سب سے بڑا بیٹا وٹرنری ڈاکٹری پاس کر کے سرکاری ملازمت کرنے لگا۔ اس کے ملازم ہو جانے پر گھر والوں کو کچھ تسلی ہوئی۔ کیونکہ اس کی کمائی کا بیشتر حصہ انھیں کی تعلیم اور لڑکیوں کی شادیوں پر خرچ ہو چکا تھا...... لیکن جب برے دن آتے ہیں تو آنکھ جھپکتے میں تقدیر کا پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ بھرا پرا گھر بری طرح تباہ ہوا۔ لڑکے چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے تھے۔ شادی شدہ لڑکیاں بھی والدین کو ملنے کے لیے آگئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے یہ سازش کر رکھی تھی کہ ان کے گھر کے سب افراد کو یکجا کر کے کچل دیا جائے۔ قدرت کی ستم ظریفی، اب گھر میں رگھوناتھ کی نیم پاگل بیوی، اس کی بیوہ بہن، اس کا تین سالہ پوتا رہ گئے تھے۔ صرف بڑا لڑکا بچا تھا۔ لیکن وہ بھی دق میں مبتلا ہو کر گھر پہنچا۔ باپ نے رہی سہی پونجی اس پر خرچ کر دی۔ لیکن اس کو موت کے چنگل سے نہ بچا سکا...... اس کی آپ بیتی سن کر دل کو یقین نہ آتا تھا کہ قدرت اس قدر جابر بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت تھی۔

شام کی چائے کے بعد جب وہ رخصت ہونے لگا تو میں نے کہا۔ ''رگھوناتھ جی اتنے مصائب جھیلنے کے بعد بھی آپ کی ثابت قدمی اور حوصلہ دیکھ کر میں آپ کی بہت عزت کرنے لگا ہوں۔''

وہ اپنی چھڑی سے زمین کریدنے لگا۔ ''نوازش ہے جناب کی......'' قدرے سکوت کے بعد مجھ سے نظر ملانے سے کتراتے ہوئے بولا...... ''لیکن میرا حافظہ کمزور ہو گیا ہے کچھ...... میں بھول جاتا ہوں کئی باتیں......''

اس کے چلے جانے کے بعد میں دیر تک اس کی بابت سوچتا رہا۔

میری سفارش پر وہ دفتر میں ہیڈ کلرک مقرر ہو گیا۔ اس کی موجودگی میرے لیے اطمینان کا باعث تھی مجھ کو تسلی اس بات کی تھی کہ دفتر میں کم از کم ایک ذمہ دار شخص موجود تھا۔ چونکہ میں خود محنتی اور ذمہ دار شخص ہوں اس لیے اس قسم کے اشخاص پا کر ہمیشہ خوشی محسوس کرتا ہوں۔ غیر ذمہ دار کلرکوں کا مجھے بہت تلخ تجربہ تھا۔ کئی بار مجھ کو رگھوناتھ سے مشورہ بھی لینا پڑا۔ بارہا ایسا ہوا کہ ضروری کام پڑنے پر میں اطمینان کے ساتھ دورے پر چلا جاتا۔ لیکن میری غیر حاضری میں دفتر کے کام میں گڑبڑ نہ ہوتی تھی۔

اپنی میز کے آگے بیٹھے بیٹھے میرا دل رگھوناتھ کی طرف کھنچا رہتا۔ اس کی بعض حرکتوں سے میرا دل بہت متاثر ہوتا۔ مثلاً اس کے کوٹ کا کالر گردن کے قریب پھٹ گیا تھا۔ وہ قمیص کے کالر کو اس پر چڑھا کر اسے چھپائے رکھتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ فائل لیے میرے کمرے کی طرف بڑھتا۔ پردے کے قریب پہنچ کر ایک دم رُک جاتا۔ مجھ کو معلوم ہو جاتا کہ اس وقت وہ کوٹ کے کالر پر قمیص کا کالر چڑھا رہا ہے...... کبھی کبھی اس کی قمیص کے بوسیدہ کف کوٹ کی بانہہ سے باہر نکل آتے۔ وہ زخم چھپاتے ہوئے کبوتر کی طرح انگلیوں سے کف کو کوٹ کی بانہہ کے اندر کر دیتا۔ ہر چند وہ یہ حرکتیں اس انداز سے کرتا کہ مجھ کو پتہ نہ چلے لیکن میری متجسس نگاہوں سے اس کی کوئی حرکت پوشیدہ نہ تھی۔

دیوی دیال باتیں کیے جا رہا تھا۔ لیکن میرا دھیان دوسری طرف تھا۔ چنانچہ جس قدر جلد ہو سکا میں نے اس کو ٹالا۔ پھر تھوڑی دیر تک میں رگھوناتھ کا منتظر رہا۔ لیکن وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ دو تین مرتبہ بلا پیاس، چپراسی سے پانی منگوا کر پیا۔ کھڑکی کے آگے کھڑا ہو کر سگریٹ کے لمبے لمبے کش

لیتا رہا تا کہ رگھوناتھ کو معلوم ہو جائے کہ میں اتنا مصروف بھی نہیں وہ چاہے تو آ کر مجھ سے بات کر لے۔ اس کے بعد میں کچھ دیر کاغذات دیکھتا رہا...... کھانا بھی دفتر میں ہی منگوا لیا۔ لیکن وہ نہ آیا۔

شام کو دفتر کا وقت ختم ہو جانے پر عملہ میری روانگی کا منتظر تھا۔ میں نے چپراسی کی زبانی کہلوا دیا کہ وہ میرا انتظار نہ کریں۔ کھڑکی میں سے میں ان لوگوں کو ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیروں کے قریب سے ہو کر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ اسکول کے لڑکوں کی طرح ایک دوسرے پر لپکتے جھپٹتے چلے جا رہے تھے لیکن ان میں رگھوناتھ شامل نہ تھا۔ چپراسی نے بتایا کہ بابو رگھوناتھ ابھی کام کر رہے تھے۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کاغذات پر جھک گیا۔

دس پندرہ منٹ بعد رگھوناتھ اندر آیا۔ میں نے قلم ایک طرف رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ”کیا آپ کا کام ختم نہیں ہوا؟ آج آپ نے دوپہر کے وقت آرام بھی نہیں فرمایا...... اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمایئے......“

میں جواب میں ہنس پڑا۔ معمول کی نسبت زیادہ بے تکلفانہ انداز میں بولا۔ ”آپ بزرگ ہیں۔ خدمت کرنا تو ہمارا فرض ہے...... آپ ابھی تک گھر کیوں نہیں گئے۔ اگر کچھ کام باقی رہ گیا ہو تو کل ہو سکتا ہے۔“

”جی بس اب چلا جاؤں گا...... آپ، کیا آپ ابھی تشریف رکھیں گے؟“

”جی ہاں میں ذرا ایک صاحب کا منتظر ہوں۔“

رگھوناتھ اِدھر اُدھر بے معنی نظروں سے دیکھتا رہا...... ”آپ باہر لان میں بیٹھنا پسند کریں گے؟ کہیے تو کرسیاں نکلوا دوں۔“

میں رگھوناتھ کے روبرو زیادہ افسرانہ شان کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا کچھ اس لیے اور کچھ اپنی عمر کے تقاضے سے مجبور ہو کر وہ کبھی کبھی پدرانہ لہجہ میں باتیں کرنے لگتا تھا۔

”نہیں رگھوناتھ جی۔ میں ذرا یہ کاغذات دیکھوں گا۔“

قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن کچھ تذبذب میں تھا۔ وہ دفتر کی نامکمل عمارت، فرنیچر، ٹھیکیداروں، ایک حد سے زیادہ رشوت خور اوورسیئر کی باتیں کرتا رہا...... بالکل اس نے کچھ کہنے کے انداز سے میری طرف دیکھا۔ میں ہمہ تن گوش تھا...... ”اچھا...... تو...... اگر آپ

اجازت دیں..... میں جاسکتا ہوں۔"

میں مایوس سا ہو گیا۔ "ضرور ضرور ......" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

اس نے کھانس کر چھڑی اٹھائی۔ ٹوپی کو سر پر درست کرتے ہوئے وہ رک رک کر دروازے کی طرف بڑھا۔

"رگھوناتھ جی!"

"جی۔" وہ واپس چلا آیا۔ میرے سامنے میز کے قریب کھڑا ہو گیا۔

میں نے سگریٹ کا لمبا کش کھینچ کر اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ "کیا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر وہ یونہی کمرے کے کونے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے لبوں سے ایک مبہم سی آواز نکلی۔

"کہیے نا۔"

"میں...... میں......" اس نے اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی۔ "مجھ کو......"

وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "رگھوناتھ جی آپ کرسی پر تشریف رکھئے۔ کوئی حرج نہیں تشریف رکھئے۔"

وہ بیٹھ گیا۔ مجھ کو منتظر پا کر وہ آہستہ سے بولا۔ "میں بہت شرمسار ہوں۔"

میں کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ "رگھوناتھ جی! آج تو آپ نے تکلف کی حد کر دی...... توبہ۔"

لاٹھی سے فرش کو بجاتے ہوئے وہ بڑی جرأت سے کام لے کر بولا...... "مجھ کو ایک روپیہ درکار ہے......"

"ایک روپیہ؟" میں نے حیرت سے نسبتاً بلند آواز میں پوچھا۔

اس نے پھر میری طرف اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ شاید وہ میرے چہرے پر اپنی بات کا رد عمل معلوم کرنا چاہتا تھا۔

اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "شاید آپ کو یاد ہو گا۔ آپ نے مجھ سے ایک دفعہ ایک روپیہ لیا تھا۔ یہ تین ساڑھے تین مہینے پہلے کی بات ہے......"

ایک روپیہ؟...... وہ کب؟ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ میرے چہرے پر غور و خوض کے آثار دیکھ کر اس نے پھر کہا۔ "اس دن بنک کا چپراسی آیا تھا۔ آپ کے پاس دس سے کم کا نوٹ نہیں تھا۔ آپ نے مجھ سے ایک روپیہ لیا۔ آپ نے یہ بھی ہدایت کی تھی کہ اگر آپ کو یاد نہ رہے تو میں آپ کو یاد دلا کر روپیہ واپس لے لوں۔" وہ پھیکی ہنسی ہنسا۔ "اور میں نے جواب میں کہا تھا کہ ایک روپیہ بھی کوئی بڑی رقم تھی جو میں یاد دلاتا پھروں...... سچ پوچھیے تو میں بھول چکا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں۔ میرا حافظہ کمزور ہو چکا ہے...... لیکن کل شام مجھ کو نہ معلوم کس طرح یہ بات یاد آ گئی۔ مجھ کو امید ہے آپ بھولے نہیں ہوں گے۔"

ہاں مجھ کو یاد آ گیا۔ رگھوناتھ پر مجھ کو بے اعتمادی نہ تھی۔ لیکن افسوس اس امر کا تھا کہ میں روپیہ واپس کرنا بھولا کیوں؟ وہ روپیہ...... لیکن میرا خیال ہے میں نے روپیہ واپس کر دیا تھا اسی دن شام کو۔ یقیناً میں نے واپس کر دیا تھا۔ رگھوناتھ اس جرأت کے لیے معذرت طلب کرتا رہا۔ میں نے چپکے سے اپنی نوٹ بک نکالی۔ اکتوبر کی سات تاریخ کو رگھوناتھ سے ایک روپیہ لیا گیا تھا۔ میں نے یادداشت کے لیے نوٹ بک پر لکھ لیا تھا اور اسی شام کو روپیہ واپس کرنے کے بعد میں نے اس کے آگے انگریزی میں پیڈ لکھ دیا تھا۔

رگھوناتھ کو میں یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں ایسا غیر ذمہ دار اور بے اصول شخص نہیں کہ اس کا روپیہ لے کر بھول جاتا۔ "رگھوناتھ جی میں نے وہ روپیہ......"

"میں پھر دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں۔ باور فرمایئے۔ شرم کے مارے میری نظر نہیں اٹھتی...... ضرورت ہی کچھ ایسی آن پڑی...... ورنہ میں ایک روپیہ کے لیے تقاضا نہ کرتا۔"

میں خاموش ہو گیا۔ رگھوناتھ پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ اس کی نظریں فرش پر گڑی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ مارے ندامت کے زمین میں سما جانا چاہتا ہو۔

"نہیں نہیں رگھوناتھ جی معمولی بات ہے۔" یہ کہہ کر میں مسکرایا اور کرسی پر پیچھے کی طرف جھک گیا۔ "شرمندہ تو میں ہوں۔ معافی کا طلب گار تو مجھ کو ہونا چاہیے۔"

شکر گزاری کے آنسو اس کی آنکھوں میں جھلکنے لگے۔ "آپ سے کیا چھپانا...... کل سے روٹی نہیں پکی...... آٹا ختم ہے۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی میری عادت نہیں...... بس یہ تھی اصل

بات...... ورنہ ایک روپیہ کی حیثیت ہی کیا...... میں ہرگز آپ کو اس کی یاد نہ دلاتا۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ کو کتنے روپوں کی ضرورت ہے...... میرا مطلب ہے تنخواہ ملنے پر مجھ کو واپس دے دیجئے گا۔"

اس کے چہرے پر اذیت کے آثار پیدا ہوئے۔ "میں نے آپ کو گھر کی حالت اس لیے بتائی تھی کہ آپ ایک روپیہ کے لیے تقاضہ کرنے پر مجھ کو اوچھا اور نیچ نہ سمجھنے لگیں۔" یہ کہہ کر اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جو میں عمر بھر نہ بھلا سکوں گا۔ "میں ایک بااصول اور باعزت شخص ہوں۔ اگرچہ یہ گستاخی ہے کہ آپ مجھ پر عنایت فرمانا چاہیں اور میں انکار کروں۔ لیکن چونکہ میں نے آج تک نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا نہ کبھی ایک کوڑی کا قرضدار بننا منظور کیا۔ اس لیے آخری عمر میں اپنے اصول سے گرنا نہیں چاہتا......"

میں نے چپکے سے ایک روپیہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اسے اٹھا کر اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے پردہ ہٹا کر، لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

# سمجھوتہ

وہ مجھے نئے مکان میں چھوڑ دفتر کو چل دیے۔

سامان ابھی بکھرا ہوا ہی تھا۔ میں ایک کرسی لے کر بیٹھ گئی۔ سوچا ذرا ستالوں تو کپڑے بدل کر سامان ٹھکانے سے رکھوں۔

عجب سنسان مکان تھا۔ شہر کی یہ ایک نئی آبادی تھی۔ مکانوں کی تعداد نہ صرف کم تھی، بلکہ جو تھے وہ بھی دور دور۔ مجھے تو ان کے دوست کے ہاں اور زیادہ ٹھہرنا دوبھر ہو رہا تھا۔ مکان کا مسئلہ بھی آج کل ایک معمے سے کم نہیں، انھوں نے کوچہ کوچہ کی خاک چھانی، ہر واقف کار سے کہا۔ ہزار مصیبتوں کے بعد یہ مکان ملا۔ ان کا خیال تھا کہ سرکاری کوارٹرز میں سے کوئی نہ کوئی کوارٹر مل ہی جائے گا۔ لیکن بدقسمتی سے کوئی کوارٹر خالی نہیں تھا۔ اگر ان کو معلوم ہوتا کہ رہائش کے لیے جگہ ملنے میں اتنی دشواری ہوگی تو وہ مجھے ہمراہ ہرگز نہ لاتے۔

مرد آپس میں گزارہ کر ہی لیتے ہیں۔ لیکن عورتوں کا نباہ ممکن نہیں۔ جس کے ہاں ہم اتنے دنوں تک ٹھہرے رہے وہ دراصل ان کا دوست نہ تھا۔ بس یہی کہ وہ دفتر میں ان کے نیچے کام کرتا تھا۔ بے چارے کی تنخواہ کم، اور ہماری حیثیت بھی افسرانہ سی تھی، ہماری وجہ سے ان کو تکلف بھی کرنا پڑتا تھا۔ اپنے گھروں میں تو ہر کوئی گزارہ کر ہی لیتا ہے۔ میں نے ہر چند چاہا کہ گھر کے کام میں

میزبان عورت کا ہاتھ بٹاؤں۔ لیکن وہ بیچاری مجھ کو ایسا کرنے کی اجازت کیوں کر دیتی، ایک تو میں اس کے شوہر کے افسر کی بیوی، دوسرے نئی نویلی دلہن پھر پڑھی لکھی بھی۔ ادھر میں حساس۔ ان سب باتوں کو سوچتی اور دل مسوس کر رہ جاتی۔ ان کے دل کا حال پرماتما جانے۔

ادھر وہ بھی پریشان، ابھی نو عمر ہی تو ہیں۔ نئی نویلی پیاری پیاری بیوی سے چوبیس گھنٹوں میں ایک لحمہ کے لیے بھی کھل کر بات کرنے کا موقعہ نہ ملتا۔ مردانے میں بیٹھے گپ ہانک رہے ہیں۔ کبھی تاش کھیلتے ہیں، کبھی شطرنج۔ مگر دل میں بیوی کا تصور، سو سو بہانوں سے آتے ہیں۔ دبی زبان سے کچھ پوچھتے ہیں، میں شرماتی ہوں۔ آخر دوسروں کے سامنے شرمانا ہی پڑتا ہے۔ ہوں ہاں کر کے ٹالتی ہوں۔ کبھی کبھی غصہ آنے لگتا ہے۔ کیوں بار بار بے مطلب کی بات پوچھتے یا کہنے کے لیے آجاتے ہیں۔ لیکن پھر سوچتی ہوں کریں بھی کیا۔ ہمارے میزبان بھی حالات سے غافل نہ ہوں گے۔ لیکن ناچار تھے۔ جگہ تنگ اور کنبہ بڑا۔

اب جو نئے مکان میں آئے تو دفتر جانے سے پہلے مجھ کو گلے سے لگایا اور میرا منہ چوما۔

میں چونکی آخر اب یہ نئے خیالات کیا سوجھنے لگے۔ ہاتھ اٹھا کر لمبی سی جماہی لی۔ پھر اٹھی، کمروں کا جائزہ لینے کے بعد سوچنے لگی کہ اب ان کی تقسیم کیوں کر ہو۔ دو بڑے کمرے تھے۔ ایک چھوٹا، ایک غسل خانہ، ایک کچن اور پاخانہ سامنے کی چھت پر، سامنے کا حصہ مالک مکان کا تھا۔ مگر تسلی بخش بات یہ تھی کہ مالک نے اس حصہ کو گودام بنا رکھا تھا۔ ورنہ جس مکان میں مالک خود بھی رہے وہاں مجھ کو رہنا پسند نہیں کیونکہ اس طرح ضرور جھگڑے کی کوئی صورت نکل آتی ہے۔

کمروں کی بابت تو میں نے یہی طے کیا کہ ایک بڑا کمرہ تو ان کے لیے مخصوص ہوگا۔ دوسرے میں سامان اور ہمارے پلنگ چھوٹا کمرہ گودام کا کام دے گا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ دل میں کیا کیا ارمان تھے۔ لیکن مکان ملتے کہاں تھے۔

شام کے پانچ بجے اسٹوو پر پانی ابل رہا تھا، سوچتی تھی وہ آئیں تو چائے ڈالوں۔

ان کو دیکھنے کے لیے چھت پر چڑھ گئی۔ ایک بات سے میں بہت خوش تھی۔ وہ یہ کہ جگہ اگرچہ محدود تھی لیکن تھی ہوادار۔ ایک تو دوسری منزل پر دوسرے شہر سے بالکل باہر پرے کھیتوں کی

ہریالی تک نظر آتی تھی۔ سوچا وہ آئیں تو کھیتوں کی ہوا کھانے چلیں۔ سامنے لکڑیوں اور کوئلوں کی ٹال تھی۔ دو چار کاشمیری کلہاڑیاں لیے گھوم رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ہی دھوبیوں کے مکانوں کی قطاریں تھیں۔ بائیں ہاتھ بڑا میدان سا تھا۔ پھر مکانوں کے سلسلے۔ سب سے نزدیکی مکان ہمارے پچھواڑے تھا۔ اس مکان کے مکین ہی ہمارے پڑوسی تھے۔ انھیں سے کچھ بات چیت ہو سکتی ہے۔ حالانکہ میں زیادہ جھک جھک پسند نہیں کرتی۔ عام ہندوستانی عورتوں کی صحبت مجھے راس نہیں آتی۔ لیکن کیا کیا جائے آخر ہماری بہنیں ہی تو ہیں، اور پھر انسان کہاں تک چپ سادھے رکھے، کتابیں پڑھے تو کہاں تک، سینا پرونا کرے تو کب تک آخر دو باتیں کرنے کو جی چاہنے ہی لگتا ہے۔

''کوئی بڑا کنبہ ہوگا،'' میں نے پڑوسیوں کے مکان کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا۔ تقریباً آدھا حصہ ادھر سے نظر آتا تھا اور باقی آدھا ہمارے مکان کے عین پچھواڑے تھا اور ہماری اپنی چھت کو سیڑھی تک نہ تھی۔ ورنہ دوسرا حصہ بھی دیکھا جا سکتا۔ سامنے دو کمرے تھے۔ دروازوں کے آگے چقیں پڑی تھیں۔ تیسری منزل پر دو کمرے نظر آرہے تھے۔ ان کے درمیان چھوٹا سا صحن بھی تھا۔ لکڑی کے چوڑے چوڑے تختوں والی سیڑھی سب سے اوپر والے کمرے کی چھت پر چلی گئی تھی۔ نیچے کا صحن بڑا وسیع تھا۔ صحن میں ہماری طرف کو ایک دستی نل بھی لگا ہوا تھا۔

معلوم ہوتا تھا کہ گھر کے لوگ گھر میں نہیں تھے، کوئی صورت دکھائی نہ دیتی تھی۔

میں پھر ان کو دیکھنے کے لیے گلی کی طرف کو جھک گئی۔ ابھی تک نہ لوٹے تھے غصہ آنے لگا۔ پانچ سے اوپر وقت ہو گیا۔ آخر ان کو اتنا بھی خیال نہیں کہ گھر میں اکیلی گھبراتی ہوگی۔ کچھ خاص کام پڑ گیا ہوگا۔ ورنہ بچارے تو پر لگا کر مجھ تک پہنچ جاتے۔

میں اس وقت سیڑھیوں میں کھڑی تھی۔ ہوا خوشگوار تھی۔ میں سینہ پھلا پھلا کر گہرے سانس لینے لگی جیسے کہ ہمارے اسکول میں ہم کو سکھایا گیا تھا۔ اتنے میں مجھے احساس ہوا کہ کوئی شخص میری طرف دیکھ رہا ہے نظر اٹھائی ہمارے ساتھ والے مکان کے وسیع صحن میں ایک سکھ صاحبزادے کھڑے تھے۔ نظریں ملتے ہی انھوں نے احترام سے جھک کر مجھ کو فرشی سلام کیا۔ میں بوکھلا کر بھاگتی ہوئی سیڑھیوں سے اتری اور ادھر سے بڑے زور سے ہو ہو کی آوازیں آئیں، اور منہ سے بلبلوں کے

لڑنے کی سی آوازیں نکالی گئیں۔

مارے شرم کے فرش پر گڑی جارہی تھی۔ آخر میں کیسی بے شرم دکھائی دیتی ہوں گی۔ بال کھلے ہوئے۔ دوپٹہ نیچے لٹکتا ہوا، اور میں سینہ پھلا پھلا کر گہرے سانس لے رہی تھی۔ پھر ہاتھ سے اپنے پیٹ کو دبا دبا کر اس بات کا جائزہ لے رہی تھی کہ پیٹ کتنا دب رہا تھا۔ اسی پر بس نہیں کی، بلکہ میں اپنا ہاتھ چھاتیوں کے اوپر سے پیٹ تک پھیرتی جارہی تھی، اور دل ہی دل میں اپنے پھیپھڑوں کے پھلاؤ پر اپنے آپ کو مبارک باد بھی دیتی جارہی تھی۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ کوئی شخص مجھے اس حالت میں دیکھتا ہوگا۔

اتنے میں سب سے اوپر والے کمرے کی چھت پر سے کوئی پکار کر بولا۔

"لو بھئی مبارک، پورے پانچ مہینوں کے بعد ہمارا پڑوس آباد ہوا۔"

پھر نیچے کے بڑے صحن سے جواب میں کسی کی تیز سی آواز سنائی دی۔

"خدا کرے ہمیشہ آباد رہے۔ کنواروں کی بھی خدا نے سنی۔"

"کچھ نہ پوچھو غضب ہے غضب۔"

اور میں دم بخود۔

دوسرے دن 'ان' کے دفتر چلے جانے کے بعد، میں گھر کے کام دھندوں سے فارغ ہو کر، موزے لے کر بیٹھ گئی۔ برآمدے میں ٹھنڈک تھی۔ سوچا دھوپ میں ہی بیٹھوں پھر خیال آیا کہ اگر دھوپ میں بیٹھی تو ممکن ہے پڑوس سے پھر کچھ داد ملنے لگے اپنی جگہ سے اٹھ کر میں نے پڑوسیوں کے مکان پر نظر ڈالی وہاں کوئی نہ تھا۔ اس بات کا تو کل ہی پتہ چل گیا تھا کہ وہاں بے گھر بار والے ہی رہتے ہیں۔ سوچا ممکن ہے اپنے اپنے کام پر گئے ہوں گے۔ چار بجے سے پہلے تو واپس نہ آتے ہوں گے۔

میں نے صحن کی بجائے چوڑی دیوار پر بیٹھنا زیادہ مناسب سمجھا۔ وہاں دھوپ سامنے کی تھی۔ احتیاط سے دیوار پر چڑھ گئی۔ اور آہستہ آہستہ کھسکتی ہوئی اس جگہ پہنچی جہاں سے دیوار اوپر کو اٹھ گئی تھی۔ میں مونڈھے پر بڑی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ایک طرف سے بلندی اس قدر زیادہ تھی کہ نیچے دیکھنے سے خوف معلوم ہوتا تھا۔ میں چست و چالاک لڑکی تھی کوئی بھدی موٹی عورت تو تھی

نہیں۔ یہاں بیٹھ کر میں ایسے محسوس کرتی تھی جیسے کوہ ہمالیہ کی چوٹی پر بیٹھی ہوں۔ پہلے تو اِدھر اُدھر کے مناظر سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ پھر پاؤں شلوار کے پانچوں سے ڈھک کر میں ٹوکری میں سے بجائے موزوں کے کتاب نکالی۔ اور پڑھنے لگی۔

کھانسنے کی آواز آئی۔

چونکی۔ دیکھا کونے کے سب سے اوپر والے کمرے میں ایک صاحب نکلے اور بغلوں میں ہاتھ دے کر کھڑے ہوگئے۔ آپ کی داڑھی بے ترتیب تھی۔ سر کے بال الجھے ہوئے، موٹے بھدے سے۔ آپ نے مجھ کو دیکھ کر بڑے تعجب کا اظہار کیا۔ ہاتھوں کے اشارے سے سطح زمین اور میرے درمیان کے فاصلہ کو ناپا، پھر ابروؤں کے اشارے سے اس خطرناک حرکت کا سبب پوچھا، پھر ہاتھوں کو جھٹکا کر اور شانوں کو حرکت دے کر تعجب کا اظہار کیا، اور قدرے توقف کے بعد غائب ہوگئے۔

میں نے چھوٹا سا گھونگھٹ نکالا اور منہ پھیر کر پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ اتنے میں آپ ایک ٹوٹا پھوٹا مونڈھا لیے نمودار ہوئے۔ اپنے صحن کی دیوار پر اسے رکھ دیا۔ پھر نچلے بڑے صحن سے اوپر تک کے فاصلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ ایک موٹی سی کتاب نکال کر گھٹنوں پر رکھ لی۔ اور بڑے انہماک سے پڑھنے لگے۔

میں نے بظاہر ان کی حرکتوں پر کچھ دھیان نہ دیا۔

"ارے مر جائے گا بھئی مر جائے گا۔" کہیں سے آواز آئی۔

"مرنے دو ہمیں، جیتے رہے تو کیا مل جائے گا۔ کسی کی نظر میں سما جائیں گے کیا۔"

میں بڑی زچ ہوئی۔ یک نہ شد دو شد۔ خیر اسی میں سمجھی کہ کھسک جاؤں۔ بوریا بستر سنبھال کر گھسٹتی گھسٹتی اپنے صحن تک آئی...... "ارے پکڑنا بھئی پکڑنا۔"

میں دھڑام سے چھلانگ لگا کر کمرے کے اندر......

دو تین آدمیوں کے نعرے۔ "کیا بات ہے، بھئی کیا بات ہے۔ ارے جو بات ہے خدا کی قسم لاجواب ہے۔"

اس کے بعد بے پناہ شور و غوغا۔ وہی منہ سے بلیوں کے لڑنے کی سی آوازیں۔

یہ تھے ہمارے پڑوسی، سب کے سب سکھ تھے اندازے سے معلوم ہوتا تھا کہ زیادہ تر طالب علم تھے یا کلرک۔ صبح و شام دھما چوکڑی مچی رہتی۔ دن کے وقت ذرا امن رہتا۔ شام کے وقت پھر وہی ہنگامہ۔

برائے نام ہی سہی لیکن صبح کے وقت تھوڑا بہت پاٹھ کرنا میرا معمول تھا۔ لیکن اب وہ بھی نہ رہا۔ ادھر صبح کے آثار نمودار ہوئے اُدھر پڑوسیوں میں سے کسی ایک نے موٹی سی گالی سے اعلان صبح کر دیا۔ پھر عجیب عجیب آوازیں، بھانت بھانت کے لہجے، گندے گندے لطیفے، پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ دُہرائے جاتے اور وہ بھی اس شان سے کہ بولنے والا سب سے اوپر والی چھت پر، اور سننے والے نیچے کے صحن میں کھڑے ہائے وائے کے نعرے لگا رہے ہیں۔

پھر داتن کر کے، زور زور سے کھانستے، ہنستے۔ "ہی ہی۔ ہاؤ ہاؤ۔ قہ قہ قہ، کھِ کھِ کھِ کھِ......"

اتنی قسم کی اس قدر بیہودہ ہنسیاں میں نے کبھی نہ سنی تھیں۔ بدن پر مالش کی جاتی۔ ڈنڈ پیلے جاتے، بیٹھکیں لگائی جاتیں، اگر کہیں میری جھلک دیکھ پاتے تو پھر جوش میں الٹی سیدھی قلابازیاں کھانے لگتے۔ سیٹیاں بجاتے، چیختے اور آوازے کستے۔

کوئی خوانچے والا، سبزی فروش، یا اخبار والا ایسا نہ گزرتا جس کی آواز کی وہ نقل نہ اُتارتے ہوں۔ اس کھلے میدان میں اگر کوئی مرد پیشاب کرنے بیٹھ جاتا، تو اس پر ڈھیلے پھینکتے، اور گالیاں دیتے۔ ارے شرم کرو، یہاں عورتیں رہتی ہیں۔"

جیسے خود تو عورتوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔

شام کے وقت دوسری مجلس بیٹھتی، ایک دوسرے پر فقرے چست کیے جاتے، بے ہودہ گانے گائے جاتے۔

پھر بغلیں بجاتے دس عاشقوں کے کارنامے معشوقہ کی زبانی سنائے جاتے اور دسویں عاشق کی کارستانی پر "ہو ہو" کا شور مچاتے، بے ڈھنگے طریقے پر ناچتے، آنکھیں مٹکاتے، ایسے موقعوں پر ان کے سر کے بال بکھر جاتے، داڑھیاں بے ترتیب ہو جاتیں، گال دہکنے لگتے اور وہ پسینے میں تر ہو جاتے...... تب کوئی نہ کوئی گالی کی ایک پھلجھڑی چھوڑتا اور اس کے بعد بے ہودگی کی انتہا ہو جاتی۔

ایک چھوٹے سے دریچہ میں سے ان کے صحن کا آدھا حصہ بھی نظر آتا تھا۔ اب میں ان کی صورتیں بھی پہچاننے لگی تھی۔ انھوں نے ایک دوسرے کے نام بھی دھر رکھے تھے۔ ایک تو وہ موٹے، کدو سے حضرت جو میرے مقابل دیوار پر بیٹھے تھے۔ داڑھی قینچی سے کتری ہوئی، مونچھیں کبھی ڈھیلی کبھی تنی ہوئی۔ چہرہ گول، آنکھیں چھوٹی، سر کے بال عموماً شانوں پر گرے رہتے، ان میں چکنائی نام کو بھی نہ ہوتی، معلوم ہوتا تھا کہ نہ کبھی بال دھوتے ہیں، نہ تیل لگاتے اور نہ کنگھی کرتے ہیں۔ گردن موٹی اور اس کی لمبائی نہ ہونے کے برابر، جب ہنستے تو درودیوار ہل جاتے۔ کئی قسم کی ہنسیاں ہنسنے میں ماہر تھے، آواز بڑی کرخت بدزبانی، بے ہودگی، گپ بازی میں سب کے سردار، عموماً بھینسا کہہ کر ان کو چڑایا جاتا تھا۔ کافی بے شرم تھے۔ لیکن زیادہ چڑانے پر چڑ بھی جاتے، کبھی میں ان کے سامنے آجاؤں تو بڑی بے تکلفی سے رازدارانہ لہجے میں پوچھتے۔ "صبح سے درشن نہیں ہوئے تھے...... ہم نے بھی کھانا نہیں کھایا آج۔"

ان کے بالمقابل ایک صاحب تھے لمبے تڑنگے، دُبلے پتلے، صورت سے یرقان کے مریض، آواز باریک، چھدری داڑھی، سر پر چھوٹا سا جوڑا اور اس کے بیچوں بیچ سے بالوں کا ایک گچھا اوپر کو ہوا میں لہراتا ہوا، ان کو "ککڑ" یعنی مرغ کہا جاتا تھا۔ ہر آنے جانے والے پر رعب ڈالتے، آوازے کم کستے، لیکن بک بک پر اتر آئیں تو شیطان پناہ مانگے، جسم کی بناوٹ خوبصورت تھی۔ یعنی "بھینسے" کی طرح بے ڈول نہ تھے، مجھ کو دیکھ پاتے تو منہ سے کچھ نہ کہتے، آنکھیں مٹکاتے، پہلے سر ہلاتے، پھر شانے، تب کمر اور کولھے اس شدت سے ہلاتے کے شاید نازک سے نازک لڑکی بھی نہ ہلا سکے اور پھر کمر اور کولھوں کی لرزش ٹانگوں پر سے ہوتی ہوئی پاؤں میں غائب ہو جاتی۔ کلاسیکل ناچ کی دھجیاں اڑاتے، اس وقت عموماً "بھینسا" ستار بجاتے۔ ستار بھی ایسی کہ اس کے تین چار تار ہمیشہ نیچے لٹکے ہوتے تھے۔

ایک گورا بلی کی سی آنکھوں والا لڑکا بھی تھا۔ اس کے بال سنہری تھے، داڑھی کے بال بڑے باریک اور غالباً ملائم، اس کا قد بھی "انکارِ محبوب" کی مانند مختصر، اس کا ایک دانت سونے کا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک ملائم سی ہلکی ہنسی ہنستا رہتا، اپنی دونوں کہنیاں دیوار پر رکھے ہتھیلیوں پر ٹھوڑی ٹکائے وہ مجھ

کو دیکھا کرتا، دیر تک میری طرف دیکھتا رہتا۔ اور کبھی کبھی بڑے اہتمام کے ساتھ ایک آنکھ بند کر کے آہ بھرتا اور پھر برش ہاتھ میں لے کر آہستہ آہستہ تصویر بنانے لگتا۔

ایک تھے باقر تیز...... عام فہم زبان میں ان کو "بکرا" کہا جاتا تھا۔ اس کے سر کے بال بہت لمبے تھے۔ جوڑا اتنا بڑا تھا جیسے "بھینسے" نے سر پر گوبر کر دیا ہو، ہنستے تو بڑے بڑے دانت نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ اس رعایت سے کبھی کبھی ان کو "دانتیں" بھی کہا جاتا تھا۔ گالوں پر لکیریں بھی بہت پڑتی تھیں، داڑھی دیکھ کر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا تھا۔ یعنی صرف ٹھوڑی پر چند بال، خمیدہ گردن، بہر حال سانس کی آمد و رفت جاری تھی۔ سب سے زیادہ شریف اور نیک دل تھے۔ آسمان کی بادشاہت انھیں کی تھی...... مجھ کو چق کے پیچھے سے دیکھنے کے عادی تھے۔

ایک اور "ڈھل مل" سا شخص تھا۔ اس کی داڑھی عموماً بندھی رہتی تھی۔ رنگ سیاہی مائل گندمی، بڑے ترنم سے بولتے۔ صورت سے متانت ٹپکتی تھی، گال پھولے ہوئے، عموماً بڑے وقار سے قدم اٹھاتے، بات کرتے تو ذرا سنجیدگی کے ساتھ، مجھ کو دیکھنے کی باقاعدہ کوشش کرتے تھے۔ دیکھ پاتے تو خوب منہ پھاڑ کر ہنستے۔ آوازے نہ کستے، زیر لب ہی رائے کا اظہار فرما کر رہ جاتے، دزدیدہ نظروں سے مجھ کو دیکھتے رہتے۔

کہیں پرے کونے کے کمرے میں ایک صاحب اور تھے۔ ان کی صورت کا کچھ تعین نہ تھا۔ اور نہ ہی میں ان کو سمجھ سکی، بقول موپاساں سب سے زیادہ دکھی شخص وہ ہے جسے کوئی سمجھ نہ سکے۔ کبھی وہ سکھ ہیں تو کبھی بال انگریزی طرز پر اور داڑھی صفاچٹ اور کبھی فرنچ کٹ بھی، کبھی ایک مونچھ غائب ہے تو کبھی دوسری، سر پر کبھی ٹوپی کبھی پگڑی، کبھی ہیٹ، ہر آن گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے تھے۔ بات کم کرتے، ہنستے زیادہ اور ہنسنے سے بھی زیادہ شرماتے۔ کمرے سے باہر ان کو کم ہی دیکھتی تھی۔ جب نکلتے تو شرماتے ہوئے، "بھینسا" سب سے اوپر کی چھت پر کھڑے ان کے شرمانے کی "پیروڈی" کرتے۔ ادھر "بھینسا" شرمانے میں سو سو ڈھنگ سے منہ بناتے، شانوں کو حرکت دیتے، نہ ہل سکنے والی کمر کو ہلاتے، سکڑتے، کبھی پہلو بدلتے ادھر ہنسی کے مارے پیٹ میں دکھن، لیکن شرمانے والے کو اس پیروڈی سے ذرا عبرت حاصل نہ ہوتی، وہ شرمائے ہی جاتے مجھے کم دیکھتے،

آوازے بالکل نہ کستے۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ منہ میں زبان رکھتے ہیں۔

دو لڑکے اور بھی تھے، گھوڑے کے بچھیروں کی طرح کبھی دُلکی چال سے ادھر آتے، کبھی اُدھر جاتے۔ مجھے دیکھ کر بڑا مچلتے تھے، ہائے ہائے مار ڈالا، مار ڈالا کے نعرے لگاتے۔

وہ لوگ مجھ سے عشق جتلاتے وقت اپنی صورت آئینہ میں دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ سب کے سب بیچ کھیت، ڈنکے کی چوٹ میرے دامِ عشق میں مبتلا تھے۔

مالک مکان کا بوڑھا نوکر کہتا۔ ''اب تو یہ کچھ زیادہ ہی شور مچانے لگے، ورنہ پہلے اتنی وقت بے وقت دھما چوکڑی نہ مچتی تھی۔''

لیکن میں کچھ مانوس سی ہو گئی۔

ایک دفعہ میں ان کی نظروں کی زد سے ہٹ کر صحن میں ایک طرف کو بیٹھی تھی۔ ''بھینسا'' چھت پر سے پکار کر بولے۔ ''بھئی ایک بات پوچھوں؟...... فرض کرلو تم عورت ہو۔''

''میں عورت ہوں؟''

''اہا...... بھئی فرض کرلو۔''

''فرض کرلیا۔''

''......اور ہم تم کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہیں۔''

''بے شک۔''

''تو ہم دیکھا کریں، تمہارا کیا لیتے ہیں۔ یعنی (منہ پھاڑ کر) سونچو۔''

مجھ پر چوٹ تھی۔

بھئی پڑے دیکھیں، پڑے چلائیں، چھت نہ جائیں؟ سبزی کے چھلکے میدان کی طرف نہ پھینکیں؟ کپڑے نہ پہنیں؟

ایک دن مالک کی اماں چلی آئیں، ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے دیواروں پر سفیدی کے لیے کہا، پانی کی نالی کی مرمت کی ضرورت کا احساس دلایا، وہ ہامی بھرتی گئیں۔

میں نے چائے پلائی۔ اتفاقاً ہم صحن کے اس حصہ میں چلے گئے، جہاں سے وہ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ کپڑے بھی ذرا شوخ رنگ کے پہن رکھے تھے۔

"بیٹی اگر دل نہ لگے تو ہمارے گھر آجایا کرو۔ وہ کونے پر تو گھر ہے۔"

"جی نہیں، دل کا کیا ہے۔ فرصت ہی کہاں، مصروف رہتی ہوں۔"

آواز آئی۔ "بھئی ہے! ہے! ادھر م سے حد ہو گئی۔ آج تو نظر نہیں نکتی۔" میں بدکی۔

بڑھیا نے آواز سنی یا نہیں۔ لیکن بشرے سے اس نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میرا دماغ کھول رہا تھا نہ معلوم بڑھیا کیا سوچتی ہوگی۔ یہی کہ آخر دل کیوں نہ لگے۔ میری مصروفیات کی "حقیقت" بھانپ گئی ہوگی۔

اس کے جانے کے بعد جنون کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ یہ وہ مرض تھا جس کا کچھ علاج نہ تھا۔ کہیں شنوائی نہ ہو سکتی تھی، صبر کا دامن ہاتھ سے جاتا رہا۔ میں خود کو روک نہ سکی۔ انتہائی غضب کی حالت میں ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگے۔ غصہ کے مارے میرے ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے۔ مٹھیاں کس کر غضب ناک آواز میں چلائی۔ "تم لوگوں کو واقعی شرم نہیں آتی...... میں آپ لوگوں کے پاؤں پڑتی ہوں......"

میں رو پڑی...... ریت کے گھروندے کی طرح گرنے لگی۔ لیکن بہ مشکل سنبھل کر ہٹ گئی۔

بڑی دیر بعد طبیعت سنبھلی۔ منہ ہاتھ دھویا۔ اتنے میں "وہ" بھی آ گئے۔ لیکن میں نے اس بات کا ذکر نہ کیا۔ آخر ان لفنگوں کا کیا بگاڑا جا سکتا تھا؟ یہی نا! مردوں میں تُو تُو میں میں ہو جائے تو پھر بے پر کی بچہ بچہ کی زبان پر ہو۔

دوسرے دن میں پانی کا لوٹا لے کر چھت پر گئی۔ مجھے دیکھ کر کسی نے چوں تک نہیں کی۔ آتی مرتبہ بھی کوئی نہ بولا میں نے اس طرف دیکھا ہی نہیں۔ نظریں جھکائے کمرے میں چلی آئی۔

دن گزرتے گئے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے پڑوس میں انسانوں کی بستی نہیں مرگھٹ ہے۔ حسبِ معمول صبح ہوتی۔ شام ہوتی۔ لیکن کوئی آوازہ کوئی بے ہودہ کلمہ سنائی نہ دیتا۔ ہائے دل، جگر کی صدائیں بالکل بند۔ نہ رقص ہوتے، نہ لطیفے کہے جاتے۔ نہ بازاری گانے گائے جاتے۔ نہ منہ سے بلیوں کے لڑنے کی سی آواز نکالی جاتیں۔

پہلے پہل دل کو ایک تسکین سی محسوس ہوئی۔ لیکن آہستہ آہستہ طبیعت الجھنے لگی۔ کیا یہ بدتمیز

اخلاق کے اس قدر ہی قائل ہو گئے ہیں۔ وہ کون سا احساس یگانگی تھا۔ جس کی شدت میں پہلے ہی دن وہ مجھ سے اس قدر بے تکلف ہو گئے تھے۔ پانچ مہینوں کے طویل وقفہ کے بعد پڑوس کے آباد ہو جانے پر پہلے پہل انھوں نے اتنی خوشیاں کیوں منائی تھیں۔ تعداد میں اتنے ہوتے ہوئے بھی ان میں تڑپتی ہوئی زندگی کے آثار کیوں مفقود ہو گئے تھے۔ وہ اس قدر تنہائی کیوں محسوس کرتے تھے۔ وہ کون سی خلا تھی جو پر ہونے سے رہ گئی تھی۔ یہ کیسے عاشق تھے۔ ان میں کوئی دوسرا رقیب نہ تھا۔ وہ سب جانتے نہ تھے کہ میں ان کے ہاتھ نہیں آسکتی؟ ان کو معلوم نہ تھا کہ مشرقی بالخصوص ہندوستانی لڑکی کن قوانین کی پابند ہوتی ہے۔ اور اس کا کیا ایمان ہوتا ہے! پھر بھی ان سب کو بلا کسی جھجک کے مجھ سے بے پناہ عشق تھا۔

اب وہ بھوت دکھائی دیتے تھے۔ وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق معلوم ہوتے تھے۔ اب وہ شریف تھے۔ اب میں اپنے پڑوسیوں پر فخر کر سکتی تھی۔ وہ کس قدر عمر رسیدہ معلوم ہوتے تھے۔ بوڑھے!...... بوڑھے!!

جیسے صدیاں گزر چکیں جب وہ جوان تھے۔

ایک اتوار کو ہم دونوں "ان" کے ایک دوست کے ہاں چلے گئے۔ وہاں سے سنیما گھر پہنچے۔ سارا دن ہنسی خوشی گزرانے کے بعد لوٹے۔ گھر کے پاس ہی وہ محلّہ کے ایک آدمی سے بات کرنے لگے، میں چلی آئی...... پڑوسیوں کے ہاں آج کچھ شور سا سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

دریچے سے جھانک کر دیکھا۔ وہ بڑی بڑی چارپائیوں پر سب کے سب بیٹھے تھے وہ "بھینسا" وہ "ککڑ"، وہ "بچھیرے"، وہ "باقرتیز" وغیرہ کیسے معصوم دکھائی دیتے تھے۔ اس آسمان تلے چند بندے تھے پرماتما کے...... بھینسا آہستہ آہستہ ستار ٹنٹنا رہے تھے۔

جی چاہا وہ مجھے بھی شامل کرلیں۔ کچھ آوازے ہی کس لیں، کچھ شور و غل ہی کرلیں۔ کچھ الٹی قلابازیاں ہی لگالیں۔

ہے بے شرمی کی بات، میں باہر صحن میں اس انداز سے کھڑی ہو گئی کہ ان کو نظر آسکوں۔ دور کھیتوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اس سے بھی زیادہ بے شرمی کی بات یہ کہ میرے سر سے میرا رنگین دوپٹہ کھسک کر شانوں پر آرہا۔ لیکن میں نے سر نہیں ڈھانپا......

معاً! باتیں بند ہو گئیں۔ میں نے چھپی نظروں سے دیکھا۔ وہ آنکھیں جھکائے صحن کے اس حصہ کی طرف لپک رہے تھے جدھر نہ وہ مجھے دکھائی دے سکتے تھے اور نہ میں ہی ان کو نظر آسکتی تھی۔ شام کے دھندلکے میں میلی میلی چادریں لپیٹے، آگے پیچھے سے چارپائیاں اٹھائے ......اور پھر موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی۔

نقاہت سے میں نے اپنا سر تھام لیا۔ اور تقریباً لڑکھڑاتی ہوئی واپس کمرے میں آئی۔ بڑے کمرے میں کرسی پر بیٹھی کیا گر پڑی۔ جب میں نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی، تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری آنکھوں کی شراب غائب ہے اور ہونٹوں کی مٹھاس گم، گالوں کی سرخی ندارد، سینے کی کشش ختم، اور میں بوڑھی کھوسٹ ہو چکی ہوں بڑھیا...... بڑھیا!

رات کو جب "وہ" واپس آئے تو میں نے کہا کہ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ گھر جلدی ہی بدل لیں۔

"کیوں؟"

"میرا جی نہیں لگتا۔"

طے پایا کہ اگلے اتوار کو ہم یہ گھر چھوڑ دیں گے۔ کیونکہ اس وقت ایک کوارٹر مل سکتا تھا۔

دوسرے اتوار کو ہمارا سامان ٹھیلوں پر لد رہا تھا۔

وہ سب لوگ چھپی نظروں سے ہمارا سامان لدتا دیکھ رہے تھے۔ ان کے پڑوس کا مکان پانچ مہینوں کے طویل عرصے تک خالی رہنے کے بعد مختصر عرصہ کے لیے آباد رہا اور اب پھر خالی تھا......

ان کی صورتیں رنجیدہ ہیں، چادریں لپیٹے کاہلی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہے ہیں۔ مالش نہیں کرتے، ناچتے نہیں، الٹی قلابازیاں نہیں لگاتے، سب سے اوپر کی چھت پر "بھینسا" نیچے ...... "ٹکڑ"، "بکرا" نل سے پانی بھر رہا ہے، وہ بلی کی سی آنکھوں والا گورا سا لڑکا اداس نظروں سے دوسری طرف کو دیکھ رہا ہے......

ہم تانگے پر بیٹھے ہیں۔ تانگہ والا گھوڑے کو چابک دکھاتا ہے۔

میں محسوس کرتی ہوں۔ جیسے چاہیے تھا کہ ان کو اپنی حفاظت میں لے لیتی، جیسے میں نے ہی ان کو جنم دیا تھا، جیسے میں نے ہی ان کو پال پوس کر......

# پیپرویٹ

وہ کتنا خوش تھا۔ آخر چھبیس برس کی عمر بھی کیا ہوتی ہے۔ اسے ترقی دے کر اب بنک کا منیجر بنا دیا گیا تھا۔ آہا! اس کی مسرت کا بھلا کیا ٹھکانہ تھا۔ وہ دفتر سے گھر اڑ کر پہنچا۔ جب وہ مدن مینشنز کے صحن میں داخل ہوا تو دفعتاً اس کے لبوں کی مسرت معدوم ہو گئی۔ اس کی بیوی آج پھر ڈرائنگ روم کی کھڑکی کھولے عین اس کے سامنے کاؤچ پر بیٹھی تھی......

اس نے فرحت کو بار بار منع کیا تھا کہ اس طرح کھڑکی کھول کر نہ بیٹھا کرے۔ سامنے کے فلیٹ پر غالباً کالج کے چند طلبا رہتے تھے۔ جو اکثر تاک جھانک کرتے رہتے تھے فرحت کی عمر بہ مشکل بیس برس کی ہوگی۔ کاشمیری ماں کی بیٹی تھی۔ کون تھا جو اسے بے پردہ اپنے سامنے پائے اور پھر دل مسوس کر نہ رہ جائے اور طلبا بظاہر بڑے شریف بنتے تھے۔ کبھی کوئی بدتمیزی نہ کرتے تھے۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ ضرور تاک جھانک کرتے ہیں۔ اگر وہ صحن میں گوالے سے بھی باتیں کرتے تو اسے یہی شبہ ہوتا کہ فرحت کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اور اگر فرحت کو سمجھاتا تو وہ کہتی، دیکھ لیں گے تو میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ کیا میں اندر دم گھونٹ کر مر جاؤں اور جب بہت خفا ہوتا تو کہتی اچھا آئندہ نہیں بیٹھوں گی...... لیکن وعدوں کے باوجود آج پھر وہاں بیٹھی تھی۔

وہ بھاری قدموں سے سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ اس کا فلیٹ دوسری منزل پر تھا راستے میں وہ

سوچتا رہا کہ آخر اس کا کیا علاج ہو۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے دستک دی۔ اندر سے شہد میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ "چلے آیئے دروازہ کھلا ہے۔"

اس کے کانوں میں بیوی کی شیریں آواز گونج رہی تھی وہ اس مٹھاس سے زبردست لطف اندوز ہو گیا۔ چنانچہ جب اس نے اندر قدم رکھا تو بیوی پر ایک دم برس پڑنے کا خیال بھی کمزور پڑ گیا...... لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ بیوی کی اس حرکت کو اور زیادہ عرصے تک برداشت کرنے پر رضامند تھا۔ آج دوٹوک فیصلہ کر دینا چاہتا تھا۔

اس نے ہیٹ اتارا اور بے پروائی سے گھما کر کرسی پر پھینک دیا۔ پھر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے اس نے خشمگیں نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا لیکن وہ ڈبل روٹی کے ٹکڑے کاٹنے میں مشغول تھی۔ اس وقت فضا ایسی تھی کہ اگر وہ پینترا بدل کر ہنسنے کھیلنے لگتا تو بھی کچھ حرج نہ تھا۔ آج خوشی کا موقع بھی تھا۔ لیکن وہ اس بات پر تلا ہوا تھا۔ اب اس معاملے میں زیادہ ڈھیل نہ دے گا۔

وہ منہ پھیر کر دوسری کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا اور پتلون کے دونوں سروں کو پکڑ کر اوپر کی طرف کھینچا۔ اس کی کمر پتلی تھی اور چوتڑوں کا ابھار بھی برائے نام ہی تھا، نیچے کو ڈھلک جاتی تھی۔ پھر وہ الٹ پلٹ کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ بھی چھوٹے چھوٹے ہلکے پھلکے سے تھے۔ انگلیاں پتلی اور نازک۔ ایک تو اس میں یہ بڑی کمی تھی کہ اس کے تیور مردانہ نہیں تھے۔ نہ اس کی آواز بھاری اور بارعب تھی چنانچہ خواہ وہ کس قدر غضب کی حالت میں ہو۔ دیکھنے والے پر خاک رعب نہ پڑتا تھا۔

کھڑکی کے سامنے کھڑا کھڑا وہ انگلیاں چٹخاتا رہا۔ ایک مرتبہ پھر اس نے ابرو پر بل ڈال کر بیوی طرف دیکھا۔ لیکن وہ بچوں کے سے انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھی۔ یہ بھی ایک بڑی بھاری دقت تھی۔ آخر وہ بچہ ہی تو تھی۔ اسے اشاروں اور کنایوں سے کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ بے وقوف نہ تھی۔ بس اس کے مزاج میں بچوں کی سی سادگی تھی۔ اگر کوئی بات کہو تو وہ نہایت بھول پن سے کوئی سوال پوچھتی۔ اس کا جواب دو تو پھر کوئی اور سیدھا سادا سوال پوچھ بیٹھتی۔ اب وہ محض لڑکی نہ تھی۔ شادی ہوئے لگ بھگ ایک سال ہو چکا تھا۔ لیکن اسے اس بات کی بھی کچھ خبر نہ تھی کہ مرد کن بھوکی نظروں سے خوبصورت عورتوں کو دیکھتے ہیں۔ اسے اگر یہ بات سمجھایئے تو بس ایک ہی

جواب دیتی...... دیکھتے ہیں تو دیکھنے دیجئے......"

اس نے جب دیکھا کہ فرحت کا دھیان اس کی طرف نہیں ہے تو اس نے منہ پھیر لیا۔ اور سوچنے لگا کہ اب گفتگو کا آغاز کیوں کر کرے اگر وہ اس کی طرف دیکھ لیتی تو اُسے معلوم ہو جاتا کہ وہ خفا ہے۔ اب وہ سمجھ رہی ہے کہ شوہر کپڑے بدل رہا ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا۔ توں توں خفا ہونے کا امکان کم ہوتا جا رہا تھا۔ دراصل جھگڑا فوراً شروع ہو جانا چاہیے تھا۔ اس طرح سوچ سوچ کر خفا ہونے میں کوئی اثر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس نے مزید تاخیر کو مناسب نہ سمجھتے ہوئے بیوی کی طرف پیٹھ پھیر لی اور کہا۔ "فرحت!......"

پھر وہ اپنی آواز کی نوعیت پر غور کرنے لگا کہ واقعی اس سے اس کی دلی ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے یا نہیں...... لیکن وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

"جی"...... فرحت کی آواز سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا ہے۔

اب اس نے فیصلہ کیا کہ اسے نہایت ڈرامائک انداز میں گھوم کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینی چاہئیں اور اسے دیر ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن جلدی کے یہ معنی بھی نہیں کہ اس کے چہرے سے غیظ و غضب کے آثار ہی مفقود ہوں۔ اس سوچ بچار میں کچھ دیر بھی ہو گئی۔ وہ گھوما تو چہرے سے جذبات کا اظہار تو بالکل صحیح طور پر ہو رہا تھا لیکن افراتفری میں اسے وہ جوشیلے الفاظ بھول گئے جو اسے اس موقع پر کہنے چاہیے تھے۔ دو چار لمحوں تک تو وہ چپ چاپ بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ملائے رہا۔ لیکن الفاظ نہ ملنے کے سبب وہ چہرے کے جذبات کی شدت کو قائم نہ رکھ سکا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اسے کچھ نہ کچھ کہنا چاہیے۔ "فرحت آج تم پھر کھڑکی میں بیٹھی ہو؟"

یہ سن کر فرحت نے بڑے طفلانہ انداز سے دانتوں تلے زبان کو دبایا اور کھڑکی سے ذرا ہٹ کر دوسری کرسی پر جا بیٹھی۔ وہ سوچنے لگا کہ فرحت کہیں موٹی تو نہیں ہو رہی۔ اسے پتلی عورت پسند نہیں تھی۔ وہ ذرا گدرائے ہوئے جسم والی عورت کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ اس وقت فرحت کا جسم آئیڈیل جسم تھا۔ لیکن اب اسے اور زیادہ موٹا ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج اس کے ہاتھ اور پاؤں مہندی سے رنگے ہوئے تھے۔ صبح اس نے اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔ اس کے جسم کی رنگت پر

مہندی کا رنگ خوب کھلتا تھا......

خاوند کو چپ چاپ گھورتے دیکھ کر فرحت نے کہا۔ "اب تو میں کھڑکی سے ہٹ گئی ہوں۔"

اسے دفعتاً یاد آیا کہ اسے خفا ہونا چاہیے۔ اور اس جھگڑے کا ہمیشہ کے لیے فیصلہ کر دینا چاہیے لیکن کس قدر مشکل آن پڑی تھی۔ فرحت کو غلطی کا احساس تک نہیں۔ تو پھر اسے اس حرکت سے باز کیوں کر رکھا جائے۔ آج کل کی لڑکیاں ساتوں آسمانوں کی خبر رکھتی ہیں۔ ایک فرحت تھی کہ بس لڑکپن کیا بچپن چھوڑتی ہی نہ تھی۔ صورت دیکھو، باتیں سنو، حرکات و سکنات کا مطالعہ کرو۔ کیا مجال جو گہرے سوچ بچار کی ہوا تک لگی ہو ابھی تک جیلی اور کریم کھانے کی شوقین ہے۔ بندر بندریا کا تماشہ دیکھتی ہے۔ اگر کہیں کوئی بدھو شوہر مل گیا ہوتا تو اسے آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔

پھر اس نے سوچا یہ نئی روشنی کا زمانہ ہے۔ مجھے اپنی بیوی کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے۔ تبھی اسے سیدھے راستے پر لایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک گہری بحث کے لیے مستعد ہو کر اس نے کہنا شروع کیا۔ "دیکھو فرحت! اب میرے کہنے سے تم ہٹ گئی ہو لیکن سوال یہ ہے کہ تم وہاں بیٹھتی ہی کیوں ہو؟"

فرحت نے اپنے ناخنوں کی سرخی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تو یونہی بیٹھ جاتی ہوں۔ اندر روشنی کم ہوتی ہے۔ ادھر روشنی بھی خوب ہے کھڑکی کھول دینے سے ہوا بھی آتی رہتی ہے......"

"تم ہوا کا بہانہ گھڑتی ہو ہمیشہ......" پھر اس نے سوچا یہ لفظ "بہانہ" درست نہیں یہاں پر۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ مجھے فرحت کے چال چلن پر شبہ ہے حالانکہ خواہ کچھ بھی ہو فرحت کے کیریکٹر پر شک نہیں کیا جا سکتا...... "میرا مطلب یہ ہے کہ بار بار اس بات کو دُہراتی ہو۔ میں کہتا ہوں کہ غیروں کو دیکھنے کا بہانہ مل جاتا ہے اور وہ تمہیں دیکھتے رہتے ہیں۔"...... پھر اس نے سوچا کہ فرحت کہے گی کہ اگر دیکھتے ہیں تو میرا کیا بگاڑ لیں گے...... "دیکھو نا! دنیا کی زبان نہیں پکڑی جا سکتی...... اب یہ ناخنوں کا دیکھنا بند کرو...... جو میں کہتا ہوں وہ بھی تو سن لیا کرو غور سے......"

"میں تو سن چکی اتنی بار......

اس بار اسے بڑا طیش آیا۔ "اگر سنا ہوتا تو عمل نہ کرتیں۔"

"میں تو ہمیشہ غور سے سنتی ہوں۔"

"تو کیا کہہ رہا تھا میں؟"

فرحت نے آنکھیں چھپکاتے ہوئے لاڈ سے منہ پھلا پھلا کر کہا۔ "آپ کہہ رہے تھے کہ دنیا کی زبان پکڑی نہیں جا سکتی۔"

"ہاں تو میں......"

فرحت اٹھ کر اس کے قریب آ گئی اور انگلیاں بڑھا کر بولی۔ "لایئے میں آپ کی زبان پکڑ لوں......"

"خدا کی قسم میں مار بیٹھوں گا...... اتنا بھی تو سمجھو کہ جب تم کھڑکی کھول کر سامنے جا بیٹھتی ہو تو دوسرے کیا سمجھیں گے؟"

"تو اب وہاں کون بیٹھا ہے......"

"گڑ کھلا پڑا ہو تو کیا مکھیوں کو آتے دیر لگے گی؟"

"آتی ہیں مکھیاں تو آیا کریں۔ ہمیں ڈر ہے کسی کا؟"

"ہاں تم تو یہی کہو گی...... لوگ اس طرح بات کو نہیں ٹالتے۔"

"تو وہ کیا کہتے ہیں؟......"

"کہتے کیا ہیں یہی کہ عورت کی اپنی خواہش ہے کہ لوگ اسے دیکھیں۔ ورنہ خواہ مخواہ کھڑکی میں کیوں آن کر بیٹھے......"

"تو گویا آپ کا مطلب ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ لوگ مجھے دیکھا کریں......"

"توبہ میری...... بھئی میں نہیں کہتا لوگ کہتے ہیں......"

"آپ نے کسی کو کہتے سنا؟......"

"پھر وہی بات...... بھئی مجھے کہنے کی کسی کی مجال بھی ہے لیکن میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ آخر شریف عورت......!"

وہ چپ ہو گیا۔ فرحت ایک پھول بالوں میں اڑس کر کھڑکی کے شیشے میں اچک اچک کر دیکھ رہی تھی۔ کہ کیسا معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے منہ پھیر کر اس سے مخاطب ہو کر بولی:

"آپ چائے نہیں پئیں گے۔ آج سلائیس نمکین انڈوں میں تلے جائیں گے......"

"اور میں جو بات کہہ رہا تھا۔ تم نے بیچ ہی میں کاٹ دی......"

"میں نے کب کاٹی بات آپ خود ہی چپ ہو گئے میں سمجھی بات ختم ہو گئی۔"

وہ تھک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ انگلیوں سے کنپٹیاں دبانے لگا۔

"کیا سر میں درد ہے؟" فرحت نے پریشان ہو کر پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو چائے منگواؤں۔"

"نہیں میں چائے نہیں پیوں گا۔"

"واہ کیسے نہیں پئیں گے۔" یہ کہہ کر دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے کیے وہ مٹک مٹک کر آگے بڑھی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

اب بڑا نازک وقت آ رہا تھا۔ عنقریب فرحت اس کو گدگدائے گی۔ گلے میں باہیں ڈال کر لٹک جائے گی لیکن وہ اپنی سنجیدگی قائم رکھنا چاہتا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس انداز سے جیسے اس نے اس کی طرف دیکھا ہی نہ ہو۔ رکھائی سے بولا "اچھا جلدی سے منگوا لو۔ مجھے بہت ضروری کام سے باہر جانا ہے۔"

نوکر چائے لے آیا۔ چائے پیتے وقت اس نے سنجیدگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ دل ہی دل میں وہ سوچتا رہا کہ فرحت کو کیوں کر سمجھائے۔ چائے کے خاتمے پر اس نے تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے فرحت کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ "فرحت! حقیقت یہ ہے کہ تم اپنی حرکتوں سے مجھے بہت دکھ پہنچاتی ہو۔ میں نے تمہیں پیار سے سمجھایا۔ خفا ہوا۔ لعنت ملامت بھی کی لیکن نہ معلوم تم کس مٹی کی بنی ہوئی ہو......"

اتنے میں نوکر نے اطلاع دی کہ رشیدہ کی باجی ملنے آئی ہیں...... یہ سن کر فرحت کے چہرے پر مسرت کی لہر سی دوڑ گئی۔ اس کی صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دل میں خدا کی از حد شکر گزار تھی...... اس سے پیچھا چھڑا کر وہ زنانے میں چلی گئی۔

فرحت کا اس انداز سے رخصت ہونا اسے بالکل پسند نہ آیا۔ وہ فلسفیانہ انداز میں غور کرنے لگا کہ شادی شدہ انسان کی مسرت کا دارومدار زیادہ تر اس کی بیوی پر ہوتا تھا۔ وہ بھی کیسے سنہرے دن تھے

جب وہ کنوارا تھا۔ اسی فلیٹ میں وہ اکیلا رہتا تھا۔ یار دوست جمع ہوتے تھے۔ فرصت کا ہر لمحہ عیش و نشاط میں گزرتا تھا۔ رنج و فکر کو قریب پھٹکنے نہ دیتے تھے۔ اس وقت خوش رہنا قطعاً آپنے بس میں تھا۔ اب بیوی سے پالا پڑا تھا۔ وہ البیلے دوست بھی رخصت ہوئے اور بیوی گھر کی رانی بن بیٹھیں۔ رات کو گھر آنے میں ذرا دیر ہو جائے تو جواب طلب کرتیں۔ روٹھ جاتیں بلکہ ٹھنکنے لگتیں...... اب اس کا خوش رہنا بیوی کے ہاتھ میں تھا اور بیوی کو اس بات کا احساس تک نہ تھا۔ وہ بیوی سے مار پیٹ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جب کبھی انتہائی غیظ کی حالت میں اسے مارنے پر تل بھی جاتا تو پھر سوچنے لگتا کہ بیوی کے جسم کے کس حصے پر چپت مارے...... اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر پاتا......

اس کی کتنی خواہش تھی کہ فرحت سے اس کے تعلقات اچھے رہیں۔ لیکن اس نے تو گویا اسے نہ سمجھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اف کس بے اعتنائی سے اٹھ کر چلی گئی حرامزادی...... رشیدہ کی آپا جی کو ملنے کے لیے۔

اسے اپنے آپ پر رحم آنے لگا۔ وہ کس قدر بے بس تھا۔ آج کی شام بیکار جانے پر اس کا دل بالکل ہی ٹوٹ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ منیجر بن جانے کی خوشی میں فرحت کو جیکب والوں کے ہاں کی جیلی اور کریم کھلاؤں اور وہ کس قدر خوش ہو گی اور چٹوری بلی کی طرح انگلیاں تک چاٹنے سے باز نہ رہے گی...... لیکن کمبخت نے خود ہی کام بگاڑ دیا۔ آپس میں محبت اور اشتراک سے رہنے کا جس قدر شدید جذبہ اس کے اپنے دل میں تھا۔ اگر فرحت کے دل میں اس جذبے کی شدت اس کی نسبت دسواں حصہ بھی ہو تو بھی آپس میں تعلقات بہت مضبوط ہو سکتے ہیں...... لیکن وہ یوں سمجھنے والی نہیں! اگر کل کو وہ مر جائے تو کمبخت کو اس کی قدر معلوم ہو۔

اپنے مرنے کے خیال سے اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔ فرحت کے خوبصورت چہرے پر پھیلے ہوئے بالوں، اس کی سرخ ناک اور دلدوز چیخوں کے تصور سے اس کے دل کی ڈھارس بندھی...... اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے......

وہ میز پر ٹائم پیس کے قریب کھڑے ہوئے تانبے کے بارہ سنگھے کو ہاتھ میں اٹھا کر دیکھنے لگا......

فرحت رشیدہ کی آپا سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اپنے شوہر کی دلی کیفیت سے بے خبر کیسے مزے مزے۔ ۔ گپ اڑانے میں مصروف تھی...... پھر دفعتاً ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی چمک کی طرح کوند گیا...... وہ گھر سے چلا جائے گا نا معلوم جگہ کو...... پھر واپس نہیں آئے گا...... موت کی نسبت یہ خیال اچھا تھا۔ مرنا مشکل تھا اور یہ آسان بھی تھا اور نتائج تقریباً موت کے برابر ہی حاصل ہو سکتے تھے۔ اس نے سوچا کہ کل صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے...... بلکہ ساڑھے چار بجے والی گاڑی پر وہ سوار ہو جائے گا۔ اور کبھی واپس نہیں آئے گا۔ صبح کے وقت جب وہ جاگے گی تو ادھر اُدھر بھاگی بھاگی پھرے گی۔ نوکر سے پوچھے گی۔ تار دلوائے گی۔ پاگلوں کی مانند حرکتیں کرے گی۔ اس وقت وہ خود نہ معلوم کس جگہ پہنچا ہو گا۔

یہ خیال صحیح تھا۔ رشیدہ کی آپا بھی رات کے ساڑھے نو بجے تک بیٹھی رہی بلکہ فرحت نے جان بوجھ کر بٹھائے رکھا ہو گا...... یہ سوچ کر اسے اور بھی غصہ آیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد فرحت نے کھانے کے لیے کہلوا بھیجا۔ اس نے انکار کر دیا۔ پھر معلوم ہوا کہ اس نے اکیلے ہی کھانا کھا لیا ہے۔ اس پر اسے غصہ تو بہت آیا لیکن خیر کوئی ہرج نہیں۔ اب وہ اس سے سب باتوں کا انتقام لے گا۔ پھر نوکر کی زبانی معلوم ہوا کہ فرحت سونے کی تیاری کر رہی ہے اور اسے کہلوا بھیجا ہے۔ اس نے کہہ دیا کہ کام کر رہا ہوں۔

اب اس نے سوچا کہ جانے کی تیاری ابھی سے کر لینی چاہیے۔ اس نے نوکر بھیج کر اندر سے اپنا سوٹ کیس منگوایا...... نوکر سوٹ کیس لے آیا تو اس نے پوچھا کہ بی بی نے کچھ کہا تو نہیں۔ نوکر بولا کچھ نہیں کہا۔

اس نے سوٹ کیس تیار کر لیا۔ بستر باندھ دیا۔ اور نوکر کو ہدایت کر دی کہ صبح جلدی ہی اٹھنا ہو گا اور تانگہ لانا ہو گا۔

اس کے بعد اس نے تین بجے کا الارم لگا دیا۔

نوکر چلا گیا۔ سب طرف سکون ہو گیا۔ چھوٹے فریم میں اس کی بیوی کی تصویر رکھی تھی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے الوداعی چٹھی لکھنے کی ٹھانی۔ کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گیا۔

"جان سے پیاری فرحت......" یہ ٹھیک نہیں صرف "ڈیر فرحت" کافی ہو گا۔ بلکہ محض فرحت لکھ دیا جائے تو ذرا اچھا ہو گا۔

پھر اس نے ایک دردناک سا مضمون بنایا۔ میں تم سے تنگ آکر جارہا ہوں اور ہمیشہ کے لیے جارہا ہوں۔ مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ اب میں نہیں مل سکتا۔ دیکھو شوہر کو خوش نہ رکھنے کا یہی نتیجہ نکلتا ہے...... وغیرہ۔

چٹھی لکھ کر اس نے میز پر اس انداز سے رکھ دی کہ اس پر فوراً نظر پڑ سکے۔

رات اسی طرح صوفے پر سوتے جاگتے کاٹی۔ گھڑی کا الارم بجتے ہی اس نے نوکر کو جگایا۔ جو منہ دھو کر کپڑے پہننے لگا۔ نوکر سے کہا کہ تانگہ لے آؤ اور سامان رکھ دو۔

پھر اس نے کمرے پر الوداعی نظر ڈالی...... چند لمحوں تک اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ پھر سونے کے کمرے کے قریب سے گزرا تو اس نے دروازے کو یونہی تھوڑا سا دھکا دیا کہ دیکھیں دروازہ کھلا ہے یا نہیں۔ دروازہ کھلا تھا۔ اس کے معنی ہیں کہ اس کی بیوی اس کا انتظار کرتی رہی تھی۔

اس نے اندر کی طرف جھانکا۔ بڑی کھڑکی کے قریب اس کی بیوی سوئی پڑی تھی۔ اس نے سوچا کہ آخری بار بیوی کو دیکھ لیا جائے۔

اس کی بیوی بس بچہ ہی تھی۔ سوتے میں رضائی اِدھر اُدھر کھسک جاتی لیکن اس کی نیند ایسی گہری تھی کہ اسے کچھ خبر تک نہ ہوتی۔ چنانچہ اب پھر رضائی کھسک گئی تھی۔

قریب پہنچا تو کھڑکی کے شیشوں میں سے آنے والی چاندنی میں اس کی بیوی بہت حسین نظر آرہی تھی۔ شاعروں کے قول کے مطابق اس کے ہونٹ کھلے تھے۔ ان میں سے دانت موتیوں کی لڑی کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ بند آنکھیں جیسے دو پیسوں سے ڈھکی ہوئی ہوں۔ گریبان کے بٹن بھی کھلے تھے اور قمیص بھی اِدھر اُدھر کھنچ گئی تھی اور......

اس نے رضائی کے دونوں کونے پکڑ کر اوپر کو کھینچے۔ ہر رات اسے اس طرح کرنا پڑتا تھا......! ایسا نہ ہو بیچاری صبح سردی سے اکڑ جائے۔ رضائی اوپر کھینچ کر اس نے اس کے سرے فرحت کے پہلوؤں میں دبائے تاکہ جسم ہر طرف سے ڈھکا رہے...... پھر وہ جانے کے لیے مڑا...... میں جارہا ہوں پیاری فرحت میری جان سے عزیز......اس نے سوچا کہ جانے سے پہلے اس کی پیشانی کا ہلکا سا بوسہ لے لے۔ اسے اس بات کی خبر تک نہ ہوگی......

اور وہ اوورکوٹ کو سمیٹ کر آہستہ سے نیچے کو جھکا...... فرحت کی نیند کی ماتی آنکھیں نیم وا

ہوئیں۔اس نے خاوند کو دیکھا تو ہونٹوں پر موہوم سا تبسم کھل اٹھا۔ شوہر ٹھٹکا۔ فرحت نے نیند ہی میں انگڑائی کے لیے بازو اٹھائے اور ملائمت سے لپٹ کر لطافت سے اپنی طرف کھینچا......اور وہ باوجود انکار کے کھنچ گیا...... فرحت نے اسے جوتوں سمیت رضائی میں چھپالیا۔

نوکر کی آواز آئی "جی سامان تانگے میں رکھ دیا ہے......"

فرحت نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہہ دیا۔ "سامان اتار کر اوپر لے آؤ......" اور وہ کچھ نہیں بولا۔

# دیمک

چابیوں کا گچھا زینو کے میلے آنچل سے بندھا لٹک رہا تھا۔ وہ پھونکیں مار مار کر آگ جلانے میں مصروف تھی۔ منہ لال، آنکھیں پر آب اور بالوں میں راکھ۔ خالد ہاتھ میں یوکلپٹس کی چند سبز پتیاں لیے اپنی ماں کو ان کی خوشبو سنگھانے کی کوشش کر رہا تھا...... جب آلوؤں کے قتلے مسالہ اور گھی میں خوب لت پت ہو گئے تو اس نے پتیلی میں پانی ڈال کر اسے ڈھکنے سے ڈھانپ دیا۔ پانی ڈالنے سے جو سوں کی آواز نکلی تو خالد سوں سوں کر کے اس کی نقل اتارنے لگا۔ اس کے بال آگے کو گرے ہوئے تھے اور آنکھیں بہ مشکل نظر آتی تھیں۔

ناجی، آٹھ سالہ بچی، منی پور ناچ ناچتی ہوئی باورچی خانہ میں آ گئی۔ پیچھے پیچھے اس کا بڑا بھائی مجو چھوٹے کنستر کا مردنگ بجاتا داخل ہوا۔ ناجی نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر بازو اٹھائے اور آنکھوں پر ہاتھوں کا سایہ کر کے آنکھیں مٹکانے لگی۔ گاہے ناک کے ایک نتھنے میں سے بہتی ہوئی ریزش باہر کی طرف جھانکتی لیکن سرڑ کی ایک ہی آواز کے ساتھ غائب ہو جاتی۔ ناجی گردن کو خاص انداز میں گھما گھما کر کولہوں کو بھدے طریقے سے جھٹکے دے دے کر لٹو کی طرح چکر جو کھانے لگی تو اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ اوندھے منہ بالٹی میں جا گری۔ خالد ہنس کر آگے کو

جھکا۔اس کی ٹیڑھی کمزور ٹانگیں اس کا بوجھ نہ سنبھال سکیں توازن خراب ہو گیا۔وہ ناک کے بل گرا تو دو تین تھالیاں بھی لڑھک گئیں، ایک ہنگامہ مچ گیا۔ مجو نے مردنگ بجانا بند کر کے انگریزی ناچ شروع کر دیا۔جب وہ پتلی پتلی ٹانگیں اٹھا اٹھا کر ناچتا تو اس کے گھٹنے گلے میں لٹکے ہوئے کنستر سے ٹکرا ٹکرا کانوں کے پردے پھاڑ دینے والا شور پیدا کرنے لگے۔

ٹونکل ٹونکل لٹل سٹارز
ہاؤ آئی ونڈر وٹ یو آر
ٹونکل ٹونکل......

ماں کی للکار سنائی دی۔ بچوں کو شور کرنے سے باز رکھنے کے لیے وہ خود ان سے بھی زیادہ زور سے چلانے لگتی تھی۔

"میں کہتی ہوں تو نے میری ریڈر کہاں رکھ دی؟ ناجی کی بچی؟" سب سے بڑی بہن نجمی آن چلائی۔ان کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔گردن کی رگیں بولتے وقت ابھر آتی تھیں۔

ناجی کو ماں پچکارنے لگی۔ اس کے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ روئے جاتی تھی۔ ماں نے دلاسہ دیتے ہوئے دو آنے کا لالچ دیا۔ تاکہ وہ چپ ہو جائے لیکن وہ رضامند نہ ہوئی۔ "نہیں میں دو آنے نہیں لوں گی۔ میں تو وہ لال لال پھولوں والا فراک پہنوں گی۔" گویا یہ ناچ نہ تھا ایک سازش تھی۔جس میں اماں کو پھنسا کر دراصل پھول دار فراک اینٹھنے کا ارادہ تھا۔

"نجمی مردود تو سارس کی طرح لمبی لمبی ٹانگیں نکالے بے شرمی سے اِدھر اُدھر بھاگی پھرتی ہے۔ تجھ کو عقل کب آئے گی؟"

"ہائے اللہ میں کہاں جاؤں۔ میری ریڈر جو چھپا دی ہے ناجی کی بچی نے۔"

بچوں کے ابا آئے۔ "پانی گرم ہو گیا کیا؟"

"ہو رہا ہے۔ دیکھئے نا! بچوں نے کیا غدر مچا رکھا ہے؟"

"ارے کم بختو! تم کو آج پڑھنے کے لیے نہیں جانا ہے کیا؟ ایں؟ کیوں بے خالد! تو جتنا چھوٹا اتنا ہی کھوٹا۔ اپنی ماں کو کام نہیں کرنے دیتا، ہر وقت اس کا آنچل پکڑے رہتا ہے۔ گدھے کے بچے؟" اپنی گالی پر خود ہی مسکرا کر اس نے کنکھیوں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ "تیرا باپ گدھا اور تیری اماں

گدھی۔"

"ہٹایئے بھی۔" زینو بگڑی۔ "صبح سویرے اللہ کا نام لیجیے نا! بچے کیا تمیز سیکھیں گے؟"

زینو کو خالد بہت پیارا تھا۔ وہ اس کو نیک بخت سمجھتی تھی۔ اتنا بڑا ہو گیا تھا، پر وہ ماں کا دودھ پیے جا رہا تھا اور وہ پلائے جا رہی تھی۔ اس نے گھسیٹ کر خالد کو گود میں لے لیا۔ قمیص اٹھا، چھاتی اس کے منہ میں دے دی اور اوپر دوپٹے کا سایہ ڈال لیا۔

"بھئی یہ کیا حرکت ہے، سو مرتبہ سمجھایا کہ اب اسے اپنا دودھ نہ پلایا کرو۔"

"کہاں پلاتی ہوں۔ یہ تو کبھی کبھار چپ کرانے کا حیلہ ہے۔"

"لاؤ پانی۔"

"ذرا صبر کیجیے نا! بیٹھ جایئے گھڑی کی گھڑی۔"

وہ اسٹول پر ٹڈے کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا۔

زینو نے پانی میں انگلی ڈالی۔ "نجمی! یوں تو تُو بڑی شوقین بنتی ہے۔ ایک کی بجائے دو دو چوٹیاں لٹکائے پھرتی ہے۔ لیکن بال سمٹتے بھی ہیں تجھ سے۔ دیکھ تو بالوں کی لٹیں کیسی الجھ رہی ہیں۔"

"شوقین، شوقین، کہاں ہوں میں شوقین؟ آپ جب کب مجھ ہی پر الزام دھرتی رہتی ہیں۔ دو چوٹیاں نہ کروں تو کروں بھی کیا؟ اتنے گھنے بال ایک چوٹی میں سمٹتے ہی کہاں ہیں؟" بڑبڑاتی زمین پر زور زور سے پاؤں مارتی ہوئی وہ چلی گئی۔

"مجو جا میرا بیٹا! چچا سے کہو کھانا کھا لیں آکر۔ آج تو یوں بھی دیر ہو گئی ہے۔"

زینو کا دیور بی۔ اے آنرز کا طالب علم تھا۔

مجو چچا کو بلانے گیا۔ چچا کتنے عرصے سے بیٹھا اُبل رہا تھا۔ اب اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ بھوکا ہی پڑھنے چلا جائے گا تاکہ اس کا بڑا بھائی بھابی پر خفا ہو اور آئندہ وہ اس کو ایک غیر اہم ہستی سمجھ کر کھانا تیار کرنے میں دیر نہ لگایا کرے۔ چنانچہ اس طرف سے مجو کمرے کے اندر داخل ہوا، اور دوسری طرف سے چچا کمرے کے باہر "چچا اماں کہتی ہیں کھانا کھا لو۔"

"اب اتنا وقت کہاں ہے؟ کھانا کھا لیجیے اب"...... اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا چل کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی صورت پر ایسی مظلومیت طاری کر لی جیسے اس گھر میں ہفتہ بھر سے اس کو کھانا نہ ملا

ہو اور نہ آئندہ ہفتہ بھر تک کوئی امید ہو۔

مجو خبر لایا۔ "چچا چلے گئے۔ وہ کہتے تھے اب وقت نہیں ہے۔"

"ہائے میں مر گئی۔ بچارہ بھوکا چلا گیا۔ سارا دن بھوکا رہے گا۔ اچھا مجو کے ہاتھ کھانا کالج ہی بھجوا دوں گی۔"

"کالج کیا کرو گی بھجوا کر۔ اس نے سو مرتبہ کہا ہے کہ اس کا کھانا کالج نہ بھیجا کرو۔ سب کے سامنے کھانے سے اس کو شرم محسوس ہوتی ہے۔ لاؤ مجھے پانی دو کہیں میں دفتر سے نہ رہ جاؤں۔"

"یہ لیجئے پانی تو ہو گیا گرم...... اچھا میں کہتی ہوں دوست کو بلا لو۔ کھانا کھا لے اسے بھی جانا ہو گا۔"

"بہت اچھا، پکاؤ روٹی۔"

وہ اٹھا، اسٹول اندر کے کمرے میں رکھا اور ایک کرسی کھسکا دی۔

"مجو میرا اچھا بیٹا! جانا جی کو ساتھ لے جا۔ اپنا منہ بھی دھو اور چھوٹی بہن کا منہ بھی دھو ڈال۔ پھر آ کر کھانا کھا لو۔ تب میں تم کو اچھے کپڑے پہناؤں گی۔"

"کمبخت نوکر کہاں ہے؟"

"وہ دودھ لینے گیا ہے۔ جہاں جاتا ہے بیٹھ جاتا ہے۔ آپ نہا لیے کیا؟"

"صابن کا پتہ نہیں تولیہ ملتا نہیں۔"

"ٹھہریے میں نکالے دیتی ہوں نیا تولیہ۔" خالد کو چھاتی سے ہٹایا تو وہ ٹھنکنے لگا۔ "ارے ہٹ بیٹا! ماں کو نوچ کر کھا ہی جائے گا کیا؟"

شوہر کو صابن اور تولیہ دینے کے بعد وہ پھر چولھے کے آگے آن بیٹھی۔ مجو اور نا جی بھی منہ دھو کے آ گئے۔

"شاباش شاباش کتنے اچھے بیٹے ہیں۔ لو بیٹھو اب کھانا کھا لو...... مجو بیٹا تمہاری آپا کہاں ہے؟"

"آپا ابھی اندر کے کمرے میں کپڑے سینے کی مشین سے لپٹی رو رہی ہیں۔"

زینو نے جلدی سے ان کے آگے کھانا رکھا۔

"مجو چھوٹے بھیا کو بھی بٹھا لو اپنے پاس۔ اس کو بہت چھوٹا لقمہ شوربے میں خوب بھگو بھگو کر دینا۔ جھگڑنا نہیں۔ روٹی کی ضرورت ہو تو رکابی میں سے لے لینا...... میں ابھی آئی۔"

اندر والا کمرہ جہاں "آپا نجمی" کپڑے سینے کی مشین سے لپٹی رو رہی تھیں۔ نسبتاً تاریک تھا۔ وہاں بہت بڑے بڑے ٹرنک پڑے تھے جو زینو کو آج سے قریباً چودہ برس پہلے شادی کے موقعہ پر جہیز میں ملے تھے۔ ان کے علاوہ قیمتی کپڑوں کے ٹرنک، لوہے کی پیٹی، گہنے نقدی وغیرہ سب کچھ اسی کمرے میں رکھا جاتا تھا۔ آپا نجمی بقول مجو کے سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھیں۔ اس کی گدرائی ہوئی ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ اوندھے منہ پڑی تھی۔ چہرہ بالوں کی گھٹاؤں میں پوشیدہ تھا۔ اس نے اماں کے پاؤں کی چاپ سنی لیکن سر اوپر نہ اٹھایا اور نہ رونا بند کیا۔ وہ تسلسل کے ساتھ ہچکیاں لیتی رہی۔ جب وہ گہری گہری سسکیاں لیتی تو اس کے بازوؤں اور کمر میں لرزش پیدا ہو جاتی۔ زینو چپ چاپ اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ چندے سکوت کے بعد وہ بیٹھ گئی۔ اور اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ اور بھی شدت کے ساتھ رونے لگی۔ زینو اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

"نجمی رانی! کیا بات ہے؟ میری بچی تو میرے کہے کا بُرا مانے گی؟ تُو تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ میری آنکھوں کا نور ہے۔ پگلی تجھے اتنا بھی معلوم نہیں تمہاری اماں تجھے کتنا پیار کرتی ہے۔ میری رانی! تیرے ہی دم سے تو اس گھر کی رونق ہے۔ تجھے کیا تکلیف ہے۔ تیرے پاس اچھے اچھے کپڑے نہیں، یا خرچ کرنے کے لیے پیسے نہیں، یا خوبصورت گڑیا نہیں۔ کوئی لڑکی ہے اڑوس پڑوس میں جس کے پاس تجھ سے زیادہ کپڑے ہوں۔ تو میری سیانی بیٹی ہے۔ تو اس دن فاطمہ کی اماں سے کہہ رہی تھی کہ ہماری اماں جی ہم کو فضول پیار نہیں کرتیں۔ وہ تہ دل سے ہم سے محبت کرتی ہیں۔ بتا تو میری لاڈلی آج تجھ پر کیا وہم سوار ہو گیا کہ تیری اماں تجھ کو پیار نہیں کرتی۔ کیوں تو اس کال کوٹھری میں پڑی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ تیرے روئیں دشمن۔ تیری بلا جانے یہ رونا دھونا کیا ہوتا ہے۔ کیا اب تو یہ سمجھنے لگی ہے کہ تیری اماں بے انصاف ہے، جابر ہے، بے رحم ہے؟"

نجمی سسکیاں بھرتی رہی۔

زینو نے گھسیٹ کر بیٹی کو گود میں لے لیا۔ "میری لاڈلی! اب تو سیانی ہو گئی ہے۔ جانتی ہے اب تیری عمر کیا ہے۔ اب تجھ کو تیرھواں برس شروع ہو چکا ہے۔ میں پندرہ برس کی عمر میں بیاہی گئی

تھی۔ تجھے کیوں کر سمجھاؤں۔ تو خود ہی سمجھ لے۔ اب تو دودھ پیتی بچی نہیں رہی۔ اچھا تو ہی بتلا کہ تیری عمر کی لڑکی ایک تنگ سا فراک اور ایک جانگیہ پہنے، رانوں تک ننگی ٹانگیں نکالے گھومتی اچھی معلوم ہوتی ہے؟ مانا کہ تو اپنے گھر میں رہتی ہے لیکن اب تیری عمر گھر میں اس طرح گھومنے کی نہیں ہے۔ میری بچی! یہ باتیں والدین کو اشارۃً کنایۃً کہنی پڑتی ہیں۔ عقلمند اور سگھڑ بیٹیاں تھوڑے کہے کو بہت سمجھتی ہیں۔ ابرو کے اشارے سے مطلب کو پالیتی ہیں...... اپنے بال دیکھ رانی! بالوں کی دیکھ بھال کیا کر۔ کتنے لانبے، کتنے کالے، کتنے گھنے اور کس قدر بوجھل ہیں تیرے بال۔ میں تجھ کو دو چوٹیاں گوندھنے سے منع نہیں کرتی اور نہ میں اس کو برا سمجھتی ہوں۔ سن میری لاڈلی یہ بھی تو درست نہیں کہ تیرے بال ہر پابندی سے آزاد ہوا میں لہراتے رہیں اور تو سر پر چندریا تک نہ رہنے دے۔ تو کنواری ہے۔ تو اب کم سن بھی نہیں کہ تیری حرکات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اتنی سی بات تھی جو میں نے تجھ سے کہی۔ میں سمجھتی تھی کہ میری بیٹی میرا کہنا مان جائے گی۔ لیکن تو بجائے میری نصیحت پر عمل کرنے کے رونے لگی۔"

نجمی نے اپنی باہیں ماں کے گلے میں حمائل کر دیں۔

"اری دیکھ تو، اب تو میری برابر ہونے کو ہے۔ اب تو تیرے بوجھ تلے میری ٹانگیں دکھنے لگتی ہیں۔ جب بیٹی ماں کے برابر ہو جائے تو وہ بیٹی نہیں رہتی بلکہ بہن بن جاتی ہے۔ میری نازوں پلی بٹیا! تجھ کو چاہیے کہ تو اب ہر کام میں میرا ہاتھ بٹائے۔ گھر کے معاملات میں اپنی رائے دے۔ میں اب تھک گئی ہوں۔ میرا جسم کھوکھلا ہو چکا ہے۔ تو پرائی دولت ہے۔ لیکن جب تک میرے پاس ہے اس وقت تک تو میرا سہارا بن کر رہ۔ میں تو تجھ سے ان باتوں کی امید رکھتی ہوں اور تو نہ معلوم کون سی دنیا میں بستی ہے۔ اب تو سیانی بیٹی بن۔"

زینو کی رانیں سچ مچ دکھنے لگیں۔ نجمی کو دیکھ کر اسے خوف معلوم ہوتا تھا۔ کس قدر بڑھ گئی تھی کمبخت! قدو قامت میں پوری عورت معلوم ہوتی تھی اور دو ڈھائی برس تک تو اس پر نظر ہی ٹھہر سکے گی۔ وہ نجمی کے جسم کو غور سے دیکھنے لگی۔ کس قدر بھرا ہوا، لچکدار، بے عیب، بے داغ، تنی ہوئی جلد، مہکا ہوا جسم جیسے کھیت کی صاف ستھری نمدار مٹی کی بو یا جیسے جنگل میں خود رو سرسبز

گھاس کی سوندھی سوندھی خوشبو...... وہ اس کے جسم پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ کس قدر خوبصورت، مکمل، دلفریب، جاذب نظر، بال بل کھاتے اور لہراتے ہوئے جیسے سر کی جلد میں فوارے کی طرح پھوٹ کر لاوے کی سی تیزی کے ساتھ بہ نکلے ہوں۔ جیسے وہ آگے ہی بڑھتے چلے جائیں گے...... اس کے بازوؤں میں جکڑا ہوا نجمی کا جسم کس قدر جاندار، کسمسایا، بل کھاتا اور لچکتا ہوا سا تھا۔ اس بات کا احساس کر کے کہ یہ جسم اسی کے خون کا پروردہ ہے، اس کو عجیب قسم کی راحت سی محسوس ہونے لگی۔ جب اس نے نجمی کے نصف کے قریب بال مٹھی میں لیے تو اس کی مٹھی بھرپور ہو گئی۔ وہ ان کو مٹھی میں آہستہ آہستہ دباتی رہی...... اس نے نجمی کا منہ اوپر اٹھایا اور اس کے نمدار رخسار پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ کتنی لذت تھی۔ وہ فخر کرنے لگی۔ اسی نے اس جسم کو اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا...... وہ نجمی کو از سر نو دیکھنے لگی۔ جیسے اس نے اس کو زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ اس کے لیے وہ ایک عجوبہ تھی۔ ایک طلسم تھی۔ جوں جوں نجمی جوان ہوتی جا رہی تھی۔ توں توں اپنی ماں کے دل کے قریب ہوتی جا رہی تھی...... وہ اپنی کنواری بیٹی کے اچھوتے جسم کو چومنے لگی۔ جب اس نے اس کی گردن پر اپنے لب رکھے تو وہ کسمسا کر ہنسنے لگی۔ "مجھے گدگدی ہوتی ہے۔"

"شریر کہیں کی لے اب اٹھ میں اور کام بھی کر لوں۔"

"نہیں میں نہیں۔" یہ کہہ کر نجمی ماں کے گلے سے لپٹ گئی۔ اور جیسے ماں کے کان میں جادو پھونک رہی ہو۔ "امی! اب میں کبھی نہیں روؤں گی۔ نہ کبھی سارس کی طرح ٹانگیں نکالے پھروں گی اور نہ سر کو ننگا رہنے دوں گی۔"

"میری لاڈلی بیٹی! میری لاڈلی بیٹی!!"

"اور امی! آپ ناجی اور مجو کے کپڑے نکال دیں میں ہی ان کو کپڑے پہناؤں گی۔"

"میری سیانی بیٹی! اچھا تو چل میں تجھ کو کپڑے نکال دوں۔"

"اور امی!" نجمی نے اور بھی لپٹتے ہوئے کہا۔ "آج میرے لیے دو انڈے منگوا لینا۔ جب میں اسکول سے واپس آؤں گی تو انڈوں کی سفیدی میں دودھ ملا کر اپنے بالوں کو گھنگریالے بناؤں گی۔"

گھر کے بیسیوں چھوٹے چھوٹے کاموں سے فارغ ہو کر دوپہر کے وقت زینو دسوتی دھاگہ اور پٹاری سنبھال ڈرائنگ روم میں کوچ پر جا بیٹھی۔ دسوتی پر جھکے جھکے وہ رونے لگی۔

"چچی آپ رو رہی ہیں؟ کیوں؟"

اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔ "آ سلمیٰ! میرے پاس بیٹھ جا۔ تو کب آئی چپکے سے دبے پاؤں، مجھے تو پتہ بھی نہ چلا۔"

"آپ رونے میں اس قدر محو تھیں کہ میری آمد کی خبر بھی نہ ہوئی۔"

"اوہ! میں چھوٹی بہن کو یاد کر کے رو رہی تھی، بچاری......"

سلمیٰ کے چہرے کی سب سے زیادہ دل کش چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ وہ آنکھوں سے ہنستی، آنکھوں سے روتی، آنکھوں سے سنتی اور آنکھوں ہی سے باتیں کرتی...... چنانچہ اب اس نے آنکھیں جھکا لیں۔

زینو نے بات کا رُخ بدلنا مناسب سمجھا۔

"تمہاری اماں کیا کر رہی تھیں۔"

"کچھ بھی نہیں بس لیٹی تھیں۔"

"ہمارے ہاں کیوں نہیں چلی آتیں۔"

"نہ جانے۔"

کچھ دیر سکوت رہا۔

"سلمیٰ اب میرا جی نہیں لگتا۔"

"کیوں؟"

"نہ معلوم۔"

سلمیٰ فرش کی طرف دیکھنے لگی، جیسے اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ......"

"کیا جی چاہتا ہے آپ کا؟"

"یہی کہ تم جلد دلہن بن کر ہمارے ہاں آ جاؤ۔"

سلمیٰ نے شرما کر برقعہ کے آنچل میں چہرہ چھپا لیا۔ سوائے آنکھوں کے حالانکہ اس کو چاہیے تھا کہ آنکھیں چھپا لیتی۔ باقی چہرہ خواہ کھلا رہنے دیتی۔ زینو کے دیور سے اس کی منگنی ہو چکی تھی۔

زینو ہمیشہ کی طرح سلمیٰ کو بحیثیت دُلہن کے جانچنے لگی۔ سلمیٰ اور زینو کو ایک دوسرے سے محبت تھی۔ سلمیٰ نے اپنی اماں کو جتا دیا تھا کہ وہ زینو چچی ہی کے ہاں دُلہن بن کر جائے گی۔

"جب تو میرے پاس آجائے گی سلمیٰ! تو میرے آدھے دکھ ختم ہو جائیں گے۔ تو آکر اس دکھ کو سنبھال لے۔ پھر میں آرام سے کھاٹ پر پڑی رہا کروں گی۔ رانی اپنے گھر کی آپ دیکھ بھال کر لیا کرے گی۔"

سلمیٰ کو چچی کی گفتگو کا یہ انداز بہت پسند تھا۔ اس کی یہ میٹھی زبان اور دل نشین حرکات پر وہ فدا تھی۔

قدرے توقف کے بعد سلمیٰ بولی۔ "چچی اب تو نجمی بھی جلد ہی دلہن بنے گی۔"

"دیکھ تو کتنی بڑھ گئی ہے کمبخت۔ خدا میری لاڈلی کو نظر بد سے بچائے۔ اس کی جوانی ہے یا جوار بھاٹا۔ اللہ سب کی آبرو رکھنے والا ہے۔ سلمیٰ بیٹی اب تو بھی خیر سے جوان ہے، صحت در ہے۔ لیکن وہ موئی ہاتھ پاؤں کی کتنی مضبوط، کس قدر تیز اور تند مزاج ہے۔ اس کے لیے تو کوئی ایسا دُلہا چاہیے جو اس کو ہر طرح سے قابو میں رکھ سکے۔ ورنہ وہ سب کا ناک میں دم کر دے گی...... لیکن میری بیٹی دل کی بُری نہیں۔"

"ہاں چچی! یوں تو بات بے بات پر مجھ سے الجھ پڑتی ہے لیکن چچی سچ کہتی ہوں اگر کبھی میں خفا ہو جاؤں تو پھر سو سو طرح سے مناتی ہے مجھ کو...... ہم دونوں ساتھ ساتھ کھیلی ہیں۔ شادی ہونے پر نہ معلوم کہاں جائے گی، ہماری نجمی!"

"بیٹی یہی دستور ہے دنیا کا۔ کیسی کیسی سہیلیاں تھیں میری۔ میں تصور میں سب کی صورتیں دیکھ سکتی ہوں۔ کیسی شوخ، کھلنڈری، ہنس مکھ، البیلی ہائے ایک دفعہ بچھڑ کر پھر ہم سب ایک مرتبہ بھی پہلے کی طرح یکجانہ ہو سکیں۔ اپنے اپنے دھندوں میں پھنس کر رہ گئیں سب، ان کو یاد کرتی ہوں تو دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے۔ وہ جھولے، وہ چرخے......"

"ایک بات اور کہہ دوں چچی! آپ ابھی بالکل نوجوان دکھائی دیتی ہیں۔ نجمی نے تو یوں ہی بڑھ کر آن لیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آپ اس کی ماں تو معلوم ہی نہیں ہوتیں۔ آپ تو اس کی بڑی بہن دکھائی دیتی ہیں۔"

زینو ہزار سنجیدہ اور سگھڑ سہی لیکن یہ بات سن کر بھول گئی۔ اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنی مسرت کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ "بھئی میری عمر بھی کیا ہے۔ ذرا حساب تو لگاؤ پندرہ برس کی عمر میں میری شادی ہوئی...... اور بھئی ایک سال بعد نجمی پیدا ہوئی۔ یعنی میں اس وقت سولہ برس کی تھی۔ اور اب نجمی خیر سے سات مہینہ اُوپر بارہ برس کی ہے۔ اب حساب لگاؤ تو...... ہوئی نا میں اٹھائیس برس کی...... پہلے تو شادیاں بھی چھوٹی سی عمر میں ہو جایا کرتی تھیں۔ بیٹی اب تیری عمر بھی خیر سترہ سے اوپر کی ہے۔ تین برس سے پہلے تیری شادی کیا ہو گی۔ کیا تو سمجھتی ہے کہ شادی کے سات آٹھ سال بعد تو بوڑھی بھی ہو جائے گی۔"

بار بار اپنی شادی کا ذکر سن کر سلمیٰ خوش بھی ہوتی تھی اور جھینپتی بھی تھی...... اب پھر بچاری کو تھوڑی دیر کے لیے زمین کی طرف دیکھنا پڑا...... "چچی! ایک بات اور بھی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کی طبیعت ناساز رہتی ہے۔ آپ کچھ غم کرتی رہتی ہیں۔"

"غم کیا سلمیٰ! یہی چھوٹی بہن کے مرنے سے دل دُکھی رہتا ہے۔ بچاری کی یاد آتی ہے۔ تو بے اختیار رو دیتی ہوں۔"

"نہیں چچی یہ تو ایک مہینہ پہلے کی بات ہے نا! لیکن میں آپ کو قریباً ڈھائی مہینہ سے یونہی دیکھ رہی ہوں۔ آپ کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں...... اچھا بتایئے چچا نے آبائی مکان کیوں بیچا؟...... میں کوئی غیر تو نہیں ہوں۔ آپ چھپاتی کیوں ہیں؟"

"نہیں بیٹی! میں اکیلی جان اور اس پر اتنی پریشانیاں۔ چھوٹے چھوٹے بچے، دیور، بچوں کے ابا سبھی کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ گھر کے بیسیوں چھوٹے موٹے کام تجھ سے پوشیدہ نہیں۔ ہمدردی کا ایک کلمہ تک کہنے والا کوئی نظر نہیں آتا، البتہ میری بوٹیاں نوچنے کو سب تیار۔ یہ گرہستی بھی جان جوکھوں کا کام ہے اور تو اور نوکر تک نہیں کہ ہاتھ ہی بٹائے۔ لے دے کر وہ چندھی آنکھوں والا چھوکرا ہے۔ نوکر ہیں کہ ٹکتے ہی نہیں کمبخت فاقے کرتے چیتھڑے لٹکائے آتے ہیں۔ اچھا کھانے کو

ملتا اور اچھا پہننے کو۔ آنکھوں پر چربی چڑھ جاتی ہے، پھر تو اونچے اڑنے لگتے ہیں۔ کہاں یاد رہتی ہے ان کو اپنی حیثیت۔"

"کمبخت نوکروں کا بھی کال پڑ گیا۔ ہمارے گھر میں بھی یہی حال ہے۔ تبھی تو ہم نے بھینس بیچ ڈالی۔ اب کون کرے دیکھ بھال...... چچی آپ دوپہر کے وقت ہمارے گھر آجایا کریں۔ ہمارے بنگلوں کے درمیان ایک باڑ ہی تو ہے۔ کون سا کالے کوسوں کا فاصلہ ہے۔ دیکھیے نا میں دن بھر میں ایک دو چکر ضرور لگاتی ہوں...... اگر آپ وہاں آجایا کریں تو آپ کا دل بہلا رہے گا۔ اکیلے میں آپ رونے لگتی ہیں۔ مفت میں صحت برباد ہوتی ہے۔"

"میرا نکلنا بھی ہو۔ گھر اکیلا چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ جب تک بچے گھر پر رہتے ہیں۔ سر کھجانے تک کی فرصت نہیں ملتی...... اے لو آگیا غریب کالج سے۔ آج صبح کھانا بھی نہیں کھا کر گیا تھا، اٹھوں اب دوں کچھ بیچارے کو۔"

اِدھر تو سلمٰی کے ہونے والے شوہر بھوکے مرغ کی طرح چونچ کھولے لڑکھڑاتے اندر داخل ہوئے اُدھر ان کی ہونے والی بیوی برقعہ جھپٹ بگولے کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔

صبح کے ہنگامے کے بعد شام کا ہنگامہ شروع ہوا، رونا دھونا، چیخنا چلانا، مارنا پیٹنا، کھانا پینا، ناچنا گانا، پیار دلاسا...... سب کچھ ہو چکا تو بچے پڑ کر سو گئے۔ کالی رات...... زینو طویل و عریض کھڑکی کی چوکھٹ پر کہنی ٹیکے اور ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے تھکی ماندی سی کھڑی تھی۔ ساتھ کے کمرے سے بچوں کے ہلنے جلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سب سے پرلے کمرے میں کھتی رنگ کے سمٹے ہوئے پردے میں سے اس کو اپنا دیور نظر آرہا تھا جو کھانا کھانے کے بعد بڑے اطمینان سے سرکنڈوں کی بنی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھا ریڈیو سننے میں محو تھا...... زینو نے ابھی تک کھانا نہ کھایا تھا۔ وہ شوہر کی منتظر تھی۔

"ابھی ابھی دہلی سے آپ استاد عبدالستار سے ٹھمری سن رہے تھے۔ اس وقت گیارہ بجنے کو ہیں۔ ہمارا آج کا پروگرام ختم ہوتا ہے۔ ہم کل صبح آٹھ بجے تک آپ سے رخصت چاہتے ہیں۔ آداب عرض۔"

جواب میں "آداب عرض" کہہ کر...... اس کے دیور نے ریڈیو بند کر کے روشنی گل کر دی اور کمبل لپیٹ کر سو گیا۔

یہ آخری آواز تھی...... اس کے بعد خاموشی ہی خاموشی...... تاریکی ہی تاریکی۔ لامتناہی کس قدر وسیع آسمان۔ کس قدر پھیلی ہوئی تاریکی۔ پرے کھیتوں کے سلسلے۔ تاریکی میں اینٹوں کے ٹوٹے پھوٹے بھٹے کے آثار، اس سے بھی پرے گارے کے بنے ہوئے مکانوں والا گاؤں، تاروں کی چھاؤں میں ایک دھبے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

پاؤں کی چاپ سنائی دی...... وہ اس آواز سے آشنا تھی۔ یہ اس کے شوہر کے پاؤں کی چاپ تھی۔ وہ اندر داخل ہوا، اس نے چند فائلیں میز پر پٹخ دیں اور اس کے قریب چلا آیا۔

کھانا وہ باہر ہی سے کھا کر آیا تھا۔ اس نے زیادہ باتیں نہ کیں۔ کیونکہ آج اس کو ایک دوست کے ہاں برج کھیلنے کے لیے جانا تھا۔ لیکن اس وقت وہ تھا خوش، از حد خوش......

چنانچہ جب وہ چلا گیا تو وہ کھڑی رہی حرکت کرنے کی سکت باقی نہ تھی۔ دماغ مضمحل تھا۔ اس پر غنودگی سی طاری تھی۔

کھڑکی میں سے اوپر کو اٹھی ہوئی ہری ہری بھنگ کے پودوں کی نازک نازک کونپلیں...... خودرو اونچے پودوں کے ہلکے نیلے رنگ کے پھول...... ساکن، چپ چاپ۔

برج؟

کیا واقعی وہ اس کو دودھ پیتی بچی سمجھتے تھے۔ کیا ان کا یہ خیال تھا کہ وہ کچھ نہ سمجھتی تھی؟

کس قدر وسیع آسمان تھا...... آنکھ جھپکاتے ہوئے سے تارے کس قدر دھندلے، گدلے، پھیکے، مٹیالے......

# کٹھن ڈگریا

رکھی رام دکان سے واپس آ رہا تھا۔ صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس وقت کوئی مزے دار بات سوچ رہا ہے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ چلتے چلتے جب اسے سگریٹ جلانے کی خواہش محسوس ہوئی تو اس خیال آیا کہ ماچس تو دکان ہی پر رہ گئی ہے۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ اب وہ گھر کے قریب پہنچ چکا ہے۔ وہ اپنی دھن میں اس قدر مگن تھا کہ اسے سگریٹ منہ سے نکالنے کا خیال تک نہ آیا۔ کسی راہ گیر کی نظر اس کے ڈھیلے ڈھالے ہونٹوں میں پھنسے ہوئے سگریٹ پر جا پڑتی تو وہ بے اختیار مسکرا دیتا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ خود بخود مسکرائے جا رہا تھا۔ کبھی سر کو حرکت دینے لگتا۔ کبھی زیر لب کچھ کہنے لگتا۔ وہ بالکل پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا تھا لیکن وہ پاگل نہیں تھا۔ چونتیس پینتیس برس کے قریب عمر، صورت بھی بری نہیں تھی۔ صحت بھی کافی اچھی تھی۔ تین بچوں کا باپ تھا۔ اعلیٰ پیمانے پر ریڈیو کی دکان چلا رہا تھا۔ گیارہ بجے دکان پر جاتا۔ اس کا معاون پہلے ہی سے موجود تھا۔ ایک سے دو بجے تک لنچ کے لیے دکان بند کر دی جاتی۔ شام کے پانچ بجے کے قریب وہ گھر چلا آتا۔ البتہ دکان سات بجے تک کھلی رہتی۔ آج کاروبار کے سلسلے میں ایک شخص کو ملنے کے لیے اُسے دہلی جانا تھا۔ اس نے اپنی بیوی شانتا کو سامان تیار کرنے کے لیے بھی کہہ دیا تھا لیکن اچانک دکان پر اسے تار ملا کہ کل وہ شخص خود لاہور پہنچ رہا ہے۔ چلو سفر کی مصیبت سے جان چھوٹی۔ لیکن آج شام کا

پروگرام کیا ہو؟ یہ سوال فوراً اس کے ذہن پر ابھر آیا اور وہ چند لمحوں تک بے سبب اس فکر میں غلطاں رہا اور پھر دل کی پکار خود بخود واضح ہو گئی کہ یہ شام اپنے دوست بیج ناتھ کے ہاں گزاری جائے بلکہ رات کا کھانا بھی وہیں کھایا جائے۔

کچھ روز سے بیج ناتھ کی بیوی کامنی اس کے لیے خاص کشش کا باعث بنی ہوئی تھی۔ یہ بات اخلاق سے گری ہوئی ضرور تھی لیکن وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ جوانی کے زمانے میں وہ حد سے زیادہ مجبور بنا رہا۔ زندگی کا سنہرا زمانہ کسی سے محبت کی پینگیں بڑھائے بغیر گزر گیا۔ جب شادی ہوئی تو چند سال تک وہ بیوی کا دیوانہ سا رہا۔ مگر رفتہ رفتہ بیوی میں کوئی کشش باقی نہ رہی۔ جب کبھی بیوی آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی تو بس ہاتھ بڑھانے کی دیر تھی۔ وہاں انکار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اپنی بیوی بے رس معلوم ہونے لگی۔ تب اس نے بازار کا رخ کیا۔ وہاں دلال یہی کہتا کہ بس صاحب ہفتے بھر ہی سے بازار میں بیٹھنے لگی ہے۔ پہلے پہل تو یہ خیال ہی کچھ کم رومان انگیز نہیں تھا لیکن جب دلالوں کے ہتھکنڈوں کا علم ہوا تو طبیعت بجھ گئی۔ دنیا کا دھندہ تو چلتا رہا لیکن محبت کی پیاس کے مارے اندر ہی اندر کانٹا سا کھٹکنے لگا۔

گزشتہ دنوں اتوار کے روز وہ اپنے مکان کے سامنے چبوترے پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا کہ اس نے بیج ناتھ کو کامنی کے ہمراہ اپنے مکان کی طرف آتے دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہونے پر بیج ناتھ نے کہا۔ "ہم اجنبی ہیں۔ مکان کی تلاش کر رہے ہیں۔ کیا آپ ہماری مدد کر سکیں گے؟"

یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ اس نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اسے مکان دلوا دیا۔ اگرچہ ان کے مکانوں کے درمیان تین چار میل سے کم فاصلہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود دونوں گھرانوں کے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا، شرکت کرنا، کبھی کبھار تفریح کی غرض سے شہر سے باہر چلے جانا ان کے معمول میں داخل ہو گیا تھا۔

ایسے موقعوں پر کامنی اس کی طرف نگاہ غلط انداز سے دیکھ لیتی۔ پہلی مرتبہ تو اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سمجھا اس کی نگاہوں نے دھوکا کھایا ہے لیکن جب دبی دبی مسکراہٹوں کا تبادلہ بھی ہونے لگا تو پہلے محسوس ہوا کہ شاید وہ ایک دوسرے سے محبت بھی کر سکیں گے۔ کبھی اس کا دل لعن

طعن بھی کرتا لیکن پھر وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر ڈھارس دے لیتا کہ کامنی ہی کی طرف سے تو آغاز ہوا ہے۔ کبھی سوچتا معمولی دل لگی ہی تو ہے۔ ذرا کی ذرا چہل ہو جاتی ہے۔ دل بہلا رہتا ہے۔ اس میں قباحت کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ لیکن یہ سب ظاہر داریاں تھیں کیونکہ دل کی گہرائیوں میں وہ اچھی طرح محسوس کرنے لگا تھا کہ اسے کامنی سے محبت ہو گئی ہے۔

راستہ چلتے چلتے وہ کامنی کی بابت سوچ رہا تھا۔ ابھی تک اس نے اسے چھوا تک نہیں تھا۔ شاید آج کوئی اہم واقعہ پیش آئے۔ ممکن ہے کہ وہ اس پہلی محبوبہ کے بہت قریب پہنچ جائے۔ اب وہ اپنی گلی میں پہنچ چکا تھا۔ جیا پنواڑی کی دُکان اس کے مکان کے قریب ہی تھی۔ دُکان کے قریب سے ہو کر گزرتے وقت سلگتی رسی دیکھ کر اسے سگریٹ سلگانے کا خیال آیا۔ اگر کوئی دوست اسے ملنے کے لیے آتا تو گھر والوں کو خبر ہو یا نہ ہو لیکن جیا ضرور اس بات کا خیال رکھتا تھا۔ چنانچہ سگریٹ سلگا کر اس نے جیا سے پوچھا۔ "کیوں بے جیے! مجھے کوئی شخص ملنے کے لیے تو نہیں آیا تھا؟"

اس وقت جیا نسوار سونگھ رہا تھا۔ چھینک آنے ہی کو تھی۔ اس لیے منہ سے جواب نہ دے سکا۔ کبھی اثبات میں سر ہلاتا کبھی نفی میں۔ آخر معلوم ہوا کہ کوئی شخص نہیں آیا تھا۔ رکھی نے سگریٹ کا کش کھینچا اور گھر کی طرف بڑھا۔ دروازے کے آگے جو کچھ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں، ان کی دوا ئینٹیں اکھڑ گئی تھیں، ہر دم ان پر سے پھسلنے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا۔ اسے کئی مرتبہ خیال آیا کہ ان کی مرمت کروا دی جائے لیکن لاپروائی میں یہ کام پورا نہ ہو سکا۔

گھر کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ شانتا بڑے آئینے کے سامنے بیٹھی بال بنا رہی ہے۔ معلوم ہوتا تھا، ابھی ابھی نہا کر آئی ہے۔ اس وقت خاصی پیاری دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے دوست کہا کرتے "یار تمہاری عورت تو بہت حسین ہے۔ پھر بازاروں میں کیوں دھکے کھاتے پھرتے ہو؟"

شانتا نے بال ایک ہاتھ سے گھما کر آگے لاتے اور ان پر کنگھی کرتے ہوئے کہا "جی میں نے آپ کا سامان تیار کر دیا۔"

"بھئی آج تو میں نہیں جاؤں گا۔"

"کیوں؟" شانتا نے تعجب سے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

"جس شخص سے ملنا تھا وہ خود کل یہاں آ رہا ہے۔ نل بند تو نہیں ہوا؟ ذرا نہالوں۔"

وہ غسل خانے میں چلا گیا اور وہاں "کا کروں تو سے الفت ہو گئی...... ہو گئی۔" گاتا رہا۔ جب کپڑے پہن چکا تو بیوی نے پوچھا۔ "اب کھانا کھا کر ہی باہر جایئے گا؟"

"نہیں بھئی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ایک شخص سے ملنا ہے۔ کھانا باہر ہی کھاؤں گا۔ انتظار میں مت بیٹھی رہنا۔"

حالانکہ اس کی بیوی کو اس پر کسی قسم کا شک نہیں تھا لیکن اس نے بیج ناتھ کے گھر کا نام جان بوجھ کر نہیں لیا۔ آخر کیا فائدہ؟ عورتیں وہمی تو ہوتی ہی ہیں۔ آئینے کے سامنے کھڑے اس نے اپنی صورت کا جائزہ لیا اور اس نے خود ہی فیصلہ کیا کہ اس کی صورت بیج ناتھ سے کہیں بہتر ہے اور اگر کامنی اسے اپنے شوہر پر ترجیح دیتی ہے تو اسے اس کی خوش ذوقی کا ثبوت سمجھنا چاہیے۔

خوب بن سنور کر اس نے اپنے آپ پر آخری نگاہ ڈالی۔ کوٹ کی اوپر والی جیب میں رنگین رومال ٹھکانے سے رکھا۔ رخساروں پر ہاتھ پھیر کر ان کی ہمواری کا جائزہ لیا۔ ٹائی کی گرہ درست کی۔ پتلون کی کریز پہلو بدل بدل کر دیکھی۔ ہیٹ پر جمی ہوئی گرد کی باریک تہ چٹکی بجا بجا کر صاف کی۔ چاندی کا سگریٹ کیس جیب میں ڈالتے ہوئے اس نے ایک نظر بیوی کی طرف دیکھا۔ آج وہ واقعی حسین دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں لڑکے نانا کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں بیوی کو پیار کرنے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ لیکن وہ جلدی میں تھا۔ اس لیے چھڑی گھماتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا کہ اگر وہ سگریٹ کیس میں "عبداللہ" کے سگریٹ رکھ لیتا تو بہتر ہوتا۔ وہ عبداللہ سگریٹوں کا بڑا مداح تھا اور انھیں خصوصاً اس وقت پیتا تھا جب وہ خوش ہو۔ اب سگریٹ لینے کے لیے واپس جانے میں اس نے بدشگونی سمجھی۔ اس لیے کوئے یار ہی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

اس کا دل مسرور تھا۔ قدم بڑے بانکپن سے اٹھ رہے تھے۔ اردگرد کی چیزیں اجلی اور نئی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ جیسے ہر چیز نے نیا جنم لیا ہو اس میں چمک تھی اور حرکات سے چلبلا پن عیاں تھا۔ اپنی بیوی اور گھر سے دور وہ اپنے آپ کو آزاد پرندے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ وہ کالج کے اس چھوکرے کی مانند دکھائی دے رہا تھا جو گھر سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہو اور

اب والدین کے روپے سے عشق لڑا رہا ہو۔ محض عورت کی حیثیت اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ تو محبت کا بھوکا تھا، دردِ عشق کا خواہاں تھا۔ اصلی چیز تو وہ جذبۂ یگانگی تھا جو وہ کمو کے لیے محسوس کر رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کامنی کو پیار سے کمو کہا کرتا تھا۔ اس کی ایک تمنا تھی کہ اگر ان کی محبت پروان چڑھے اور دونوں کے دھڑکتے ہوئے سینے کسی روز مل جائیں تو وہ اسے پیاری کمو کہہ کر بلائے۔ کبھی کبھی جب وہ تصورات کے طلسم سے نکلتا تو سوچتا کیا معلوم اس کے نصیب میں حسین کامنی کی محض مسکراہٹ ہی لکھی ہو؟

آخر شام کے دھندلکے میں جب بیج ناتھ کا بلا پلستر کی اینٹوں کا بنا ہوا مکان نظر آنے لگا تو اس کے قدم ڈگمگانے لگے۔ یہاں تک وہ ایک مبہم لیکن مسحور کن جذبے کے ماتحت چلا آیا تھا۔ لیکن اب وہ سوچنے لگا کہ اس کے گھر میں کس انداز سے داخل ہونا چاہیے؟ اس مسئلے کے کئی پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ان معاملات پر زیادہ تجویزیں سوچنے کی ضرورت نہیں۔ ہر حرکت بے تکلفانہ ہونی چاہیے۔ چنانچہ وہ بڑی بے تکلفی سے ان کے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

بڑے کمرے سے میاں بیوی کے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رکھی دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ بیج ناتھ منہ پھیرے کرسی کے بازو پر بیٹھا تھا۔ اس نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شاید وہ باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ کامنی اس کی قمیص میں بٹن ٹانک رہی تھی اور وہ گا رہا تھا۔ ”اب ذرا گانا بند کر دیجیے نا۔ سوئی چھاتی میں چبھ جائے گی تو پھر نہ کہیے گا۔“

شوہر مسخرے پن سے بولا۔ ”تم سے نہیں کہیں گے تو اور کس سے کہیں گے مائی ڈارلنگ! اور ہمارا کون ہے۔“ اور پھر وہ نہایت بھونڈے انداز میں نتھنے پھلا پھلا کر شکستہ بانس کی سی آواز میں ایک فرسودہ سا گانا گانے لگا۔

”تیرا کون ہے
کسے کرتا تو پیار پیار پیار
تیرا کون ہے...... تیرا کون ہے...... ہاں تیرا کون ہے۔“

ادھر میاں بیوی میں یہ چہلیں ہو رہی تھیں۔ ادھر چھ ماہ کا بچہ پالنے میں پڑا رو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بیج ناتھ اس وقت بڑے خوش گوار موڈ میں تھا۔ جوں جوں بیوی اس کی حرکات سے چڑتی توں توں وہ اسے اور زیادہ پریشان کرتا۔ وہ جھنجھلا کر کہتی، "اب مسکنا بند کیجیے۔ منا رو رہا ہے۔"

رکھی رام دو قدم آگے بڑھا اور اس نے کھانس کر انھیں اپنی آمد سے مطلع کر دیا۔ بیج ناتھ نے سر اٹھا کر اس کو دیکھا۔ پہلے تو حیران رہ گیا۔ پھر چلایا۔ "ہلو ہلو! یار! میرا خیال تھا اب تم گاڑی میں بیٹھے ہو گے۔"

رکھی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے جواب دیا "نہیں بھئی، دہلی جانے کا پروگرام منسوخ ہو گیا۔ کرپا رام سے ملنا تھا۔ اس کا تار آیا ہے کہ کل وہ خود لاہور پہنچ رہا ہے۔"

اتنے میں کامنی نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کر دی۔ "جی نمستے!"

اس نے بڑی معصومیت اور اخلاق سے جواب دیا۔

منا رو رہا تھا۔ کامنی اسے پیار سے پالنے سے اٹھا کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ "منا کیوں رو رہا ہے، منا کیوں رو رہا ہے؟ نا، نا...... کیوں جی آپ کی منی بھی رو رہی تھی؟"

"جی نہیں۔" رکھی نے جواب دیا۔ "ہماری منی تو سوئی پڑی تھی۔ آج کل ہمارے گھر میں بچوں کا شور بہت کم ہے۔ گوشی اور جیو دونوں نانا کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ بچے ہیں نا۔ نئی جگہ ان کا دل بہلا ہوا ہے۔ گھر میں بچاری منی چپ چاپ پڑی رہتی ہے۔"

"نا جی نا۔ ہمارا منا بھی تو نہیں روتا۔" کامنی نے بچے کو پچکارتے ہوئے کہا۔ "آج تو اس کے بابو جی نے اسے ہلکان کر دیا ہے۔ میں ان کے بٹن ٹانک رہی تھی اور یہ ہل ہل کر گائے جاتے تھے۔ منا جاگ اٹھا اور رونے لگا۔"

جب وہ باتیں کر رہی تھی تو رکھی اس کے لچکیلے جسم اور تیزی سے ہلتے ہوئے ہونٹوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اس وقت سنگھار کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا لیکن معمولی گھریلو لباس میں بھی وہ کس قدر حسین دکھائی دے رہی تھی اور پھر دفعتاً جو اسے خیال آیا تو بیج ناتھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "یار معلوم ہوتا ہے کہ تم باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں تو یوں ہی ادھر چلا آیا۔ کسی کام سے جا رہے تھے تو چلو۔"

"نہیں یار بیٹھو، باتیں کریں۔"

"نہیں بھئی، مجھ سے یہ نہ ہوگا۔"

کامنی نے بچے کو گود میں جھلاتے ہوئے کہا۔ "آج ان کی دعوت ہے کہیں۔"

"واقعی، بھئی واہ۔ اب تو میں تمہارا راستہ نہیں روکنا چاہتا۔ ضرور جاؤ، تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"نہیں، اب میں نہیں جاؤں گا۔ تم اتنی دور سے آئے ہو، اب تو مل کر باتیں کریں گے۔ اور ہاں، جیلانی کے یہاں کھیلنے کیوں نہ چلیں؟"

لیکن رکھی کو اپنی حرکت بہت نامناسب معلوم ہو رہی تھی، "بیج ناتھ اپنا پروگرام خراب مت کرو۔ میں تو یونہی چلا آیا تھا۔ بس اب سیر کرتے ہوئے گھر چلا جاؤں گا۔ یہ ذرا بدتمیزی کی بات ہے کہ میری وجہ سے تمہارا میزبان پریشان ہو اور پھر ہم دونوں میں تکلف بھی تو نہ ہونا چاہیے۔"

بیج ناتھ چند لمحوں تک چپ رہا۔ پھر بولا، "اتنی دور سے آئے ہو۔ ہم دونوں کا وقت خوب کٹ سکتا ہے۔ ہاں یار، ایک اور بات سوجھی ہے مجھے، تم یہیں بیٹھو اور میں ذرا کھانا کھا کر زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کے اندر واپس آجاؤں گا۔ میری واپسی تک تم کھانا بھی یہیں کھالو گے اور پھر ہم جیلانی کے ہاں چلیں گے۔ بڑے مزے کا شخص ہے۔ گپ بھی اڑے گی اور برج بھی کھلے گی۔"

رکھی کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آرہا۔ ایک گھنٹے کے لیے وہ اور کامنی تنہا رہ جائیں گے۔ گودی کا منا تو سو ہی جائے گا۔ اس سے بڑا چار سالہ لڑکا بھی سلایا جا سکے گا۔ اس نے تیزی سے اچٹتی ہوئی نگاہ کامنی پر ڈالی۔ گوناگوں جذبات کے ہجوم میں وہ کچھ نہ بول سکا۔ بیج ناتھ کہتا چلا گیا۔ "کہو یار کیسی رہی؟ بھئی کہیں جانا نہیں۔ تمہیں میرے سر کی قسم! میں بہت دور نہیں جا رہا ہوں۔ یہی اپنے ڈاکٹر شرما کے ہاں تو دعوت ہے۔ تم شاید نہیں جانتے انھیں۔ تمہارے راستے ہی میں تو مکان پڑتا ہے۔ اچھا تو وعدہ کرو، تم نہیں جاؤ گے۔ یہ نہ ہو کہ میں بھاگم بھاگ واپس پہنچوں اور تم غائب ہو جاؤ۔ بس آج شاندار پروگرام رہے گا۔"

رکھی چپ کھڑا رہا۔ بھلا وہ کہاں جا سکتا تھا؟ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ تقدیر بھی اس قدر اچھی ہو سکتی ہے۔ وہ ایک موہوم سی امید پر یہاں آیا تھا۔ ادھر بھگوان نے بھگت کی پرارتھنا قبول کر کے

خود اپنے ہاتھ سے اس کے راستے کا کانٹا صاف کر دیا تھا۔

"تو یہ رہے سگریٹ اور یہ رہا ویکلی۔ کمو! انھیں روٹی کھلا دینا۔ ذرا خیال رکھنا بھاگ نہ جائیں کہیں۔ میں چٹکی بجاتے میں آیا۔"

یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی پتلون کے بٹن لگانے لگا۔ برش سے بال ہموار کیے، ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر کے اگلا پلو اوپر نیچے کیا۔ پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر والے دروازے کی طرف بڑھا۔ کامنی پکار کر بولی۔ "ہائے کیسے بھاگے جا رہے ہیں۔ گھر سے باہر جانا ہو تو پاؤں زمین پر لگتے ہی نہیں۔ اب جلدی لوٹ آیئے گا۔"

"ہاں بھئی، لوٹ آؤں گا۔ لوگ ہمارا یندھن اٹھا اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس کی فکر کیا کرو۔ ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر لو۔ اچھا یار میں چلا۔"

ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے کامنی بیٹھک کی کھڑکی کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر شوہر سے آنکھیں چار ہوئیں۔ شوہر نے ہوا میں ہاتھ بلند کر کے ہلا دیا۔ وہ وہاں چپ کھڑی اسے گلی کے نکڑ سے غائب ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس اثناء میں رکھی بھی چپکے سے دیوار سے لگ کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا تھا۔ کچھ دیر تک کامنی سنسان گلی کی جانب دیکھتی رہی۔ پھر اس کا ہاتھ اوپر اٹھ کر بجلی کے بٹن کی طرف بڑھا اور دوسرے لمحے میں بجلی کا بلب بجھ گیا اور فرش پر بچھی ہوئی دری پر کھڑکی میں سے آتی ہوئی چاندنی پھیل گئی۔

رکھی نے بازو بڑھایا جو کامنی کی پیٹھ سے ہوتا ہوا اس کے گوشت سے بھرپور کولھے پر جا کر ٹک گیا۔ کامنی کی کمر ہلی، لمحے بھر لرزش کے بعد ساکن ہو گئی۔ وہ اور قریب ہو کر اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ ان دونوں کی آنکھیں چار نہیں ہوئیں۔ لیکن کامنی کی کمر نے ذرا سی لرزش کے بعد سکون اختیار کر کے گویا اس کے سوال کا جواب اثبات میں دے دیا تھا۔

وہ خاموش کھڑی تھی۔ دو ایک مرتبہ رکھی کے لبوں سے نکلتی ہوئی دردِ محبت میں ڈوبی ہوئی نہایت مدھم سی آواز سنائی دی۔ "کمو کمو!"

"بی بی جی! بی بی جی!" بڑے لڑکے کی پکار سنائی دی۔

وہ بند آواز میں بولی۔ "آئی بیٹا! آئی، بیٹھے رہو وہیں۔" رکھی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ

دروازے پر سرک گئی۔ ”سنو کمو سنو۔“ اس کی آواز بری طرح لرز رہی تھی۔

کامنی دو قدم پرے دیوار سے پیٹھ لگائے ہتھیلیاں دیوار پر ٹکائے سر نیہوڑائے کھڑی تھی۔ کمرے کی فضا خواب ناک تھی، ہر طرف سرمئی غبار سا چھایا ہوا تھا۔ کامنی کی مدھم شبیہہ حسین مجسمے کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ صرف اس کی چھاتیوں کے زیر و بم سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بے جان مورت نہیں ہے۔ ”کمو! سنو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“

”میں تم سے محبت کرتا ہوں!“ کیسے فرسودہ الفاظ تھے؟ جنھیں اس نے بیسیوں مرتبہ کتابوں میں پڑھا تھا، فلم کے پردے پر سنا تھا لیکن آج وہ یہ فقرہ اس طرح ادا کر رہا تھا جیسے یہ اسی کی اختراع ہو۔

جواب میں کامنی نے پلکیں اوپر اٹھائیں اور ایک مرتبہ بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر سپردگی کے انداز میں پلکیں جھکا کر رہ گئی۔ وہ بجلی کے کوندے کی طرح آگے بڑھا۔ اس کی کمر کو بازوؤں میں لے کر اسے اپنی طرف کھینچا تو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے پھولوں کی نازک ڈالی پکڑ کر جھنجھنا دی ہو۔ اس کا جسم سر سے پاؤں تک کامنی کے نرم نرم لچکیلے جسم کے لمس سے محظوظ ہونے لگا۔ ایک اور شدید اور فوری جذبے کے تحت اس نے نہ معلوم کس کس طرح اسے بھینچا، چوما اور پھر لڑکے کی پکار کی آوازیں ہتھوڑوں کے دھمکوں کی طرح سنائی دینے لگیں اور پھر کامنی اڑتی ہوئی خوشبو کی طرح اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

وہ کمرے میں تن تنہا کھڑا رہ گیا۔ کھڑکیوں میں داخل ہونے والی چاند کی روشنی میں کرسیاں، تپائیاں، تصویریں، پردے اور کتابیں، غرض ہر شے خواب ناک اور ساکن دکھائی دے رہی تھی۔ صرف اس کی ٹانگیں اور بازو لرزاں تھے۔ سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے چند غیر مبہم سی آوازیں نکل گئیں۔ کچھ دیر تک وہ خلا میں گھور کر دیکھتا رہا۔ ایک مرتبہ احساس گناہ کی شدت سے کانپ بھی اٹھا لیکن صرف ایک لمحے کے لیے۔ پھر اس نے رومال سے منہ اور پیشانی صاف کی، کپڑوں کی سلوٹیں اور کوٹ کی جھول کھائی ہوئی آستینیں کھینچ کر ہموار کیں۔ پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا صحن میں باورچی خانے کی جانب بڑھا۔ کامنی چولھے کے قریب بیٹھی

دیگچی میں چمچ چلا رہی تھی۔ اس کا بڑا لڑکا اس کے گھٹنے کے ساتھ لگا ہوا اونگھ رہا تھا۔ وہ چولھے میں لپلپاتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں اس کے دمکتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ باہمی کش مکش میں کامنی کے بال پریشان ہو گئے تھے، گال سرخ ہو گئے تھے۔ قمیص دو تین مقامات سے مسک گئی تھی۔

یہ سب اسی کی دست درازیوں کے نتائج تھے۔ اس خیال سے وہ ایک فتح کے احساس میں گم ہو گیا۔

بظاہر کامنی اس کی آمد سے بے خبر دکھائی دیتی تھی۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہی۔ بچے کو اونگھتا ہوا دیکھ کر اس نے کہا۔ ''چلو تمہیں سلا دوں۔'' اور اسے سلانے کے لیے اندر چلی گئی۔

رکھی چولھے کے قریب ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وہ دل ہی دل میں حالات کا جائزہ لینے لگا۔ کامنی پھر قریب آ بیٹھی۔ اس کی حرکات سے کسی غیر معمولی واقعے کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ دیگچی چولھے سے اتار کر اس نے توا رکھ دیا اور آٹا توڑ کر پیڑا بنانے لگی اور اس سے آنکھیں ملائے بغیر بولی۔

''آپ کو سردی لگ رہی ہو گی۔ چولھے کے قریب آ جایئے نا۔''

''واقعی سردی بہت سخت پڑ رہی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اسٹول کھسکایا اور چولھے کے قریب آ گیا۔

رکھی کی نظریں، آنکھوں اور تیزی سے جنبش کرتے ہوئے ہونٹوں اور ہاتھوں کی حرکات پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دل میں بے چین تشنگی بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ جو پیاسے ہونٹوں سے شربت کا گلاس پرے ہٹ جانے میں ہونے لگتی ہے۔ کامنی نے روٹی الٹتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو بھوک تو لگ رہی ہو گی۔''

اس نے اٹھ کر کامنی کے رخسار پر ہونٹ رکھ دیے۔ ''نہیں کمو! مجھے بھوک نہیں لگ رہی۔'' یہ کہہ کر وہ اسے اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔ کامنی نے اپنے آپ کو اس کی مرضی پر چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''مجھے روٹی تو پکا لینے دیجیے۔''

''نہیں جان سے پیاری کمو! روٹی پھر پکا لینا۔'' یہ کہہ کر اس نے ہاتھ مار کر توا چولھے سے گرا دیا۔

وہ خوش تھا اور سر تا پا نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ بیٹھک میں دری پر لیٹا ہوا تھا۔ ٹانگیں اٹھا کر قریب بچھی ہوئی کرسی پر ٹکا رکھی تھیں اور بجلی کی جگمگاتی ہوئی روشنی میں ویکلی کا پرچہ پیٹ پر دھرے

اس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

ایک مرتبہ پھر کامنی چولھے کے آگے بیٹھی اس کے لیے پراٹھے پکا رہی تھی۔ اس روز سے پہلے زندگی کے جو دن گزر چکے تھے وہ بالکل بے کیف نظر آنے لگے تھے۔ یہ لذت اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ دل مطمئن تھا۔ جسم ہلکا پھلکا اور تر و تازہ محسوس ہو رہا تھا۔ روح پر ناقابل بیان کیف طاری تھا۔ آج کامنی اور وہ ایک ہو گئے تھے۔

کھانا تیار ہو گیا تو انھوں نے ایک ساتھ مل کر کھایا۔ ایک دوسرے کے منہ سے منہ ملا کر نوالے چھینتے رہے۔ ہنسی مذاق ہی میں وقت گزر گیا اور آخر دروازے پر دستک سنائی دی۔

کامنی نے دروازہ کھولا۔ بیج ناتھ کا معصوم چہرہ دیکھ کر رکھی کے دل میں فتور پیدا ہو گیا لیکن کامنی آڑے آئی۔ ”آپ کے دوست تو اٹھ کر بھاگ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے بٹھائے رکھا میں نے۔“

بیج ناتھ نے بے تکلفانہ اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”یار کمال کرتے ہو۔ آخر گھبرانے کی کیا بات تھی؟“ دوست کی سادگی کو دیکھ کر رکھی کو شرم سی محسوس ہونے لگی اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

”کہو، کھانا کھا لیا؟“

”ہاں!“

”آؤ تو چلو جیلانی کے ہاں۔“

راستے میں بیج ناتھ دعوت کی باتیں کرتا رہا۔ کہنے لگا۔ ”ڈاکٹر شرما میرے بہت گہرے دوستوں میں سے ہیں۔ بڑے پریم سے بلایا۔ واپس نہیں آنے دیتے تھے۔ ہزار حیلوں سے جان چھڑا کر آیا ہوں۔“

جب وہ جیلانی کے ہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کے ہاں کوئی قوجی رشتے دار باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ برج نہیں کھیل سکیں گے۔ ان کا پروگرام درہم برہم ہو گیا۔ خیر، وہ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر ٹہلتے رہے۔ پھر بیج ناتھ نے کہا۔ ”آؤ گھر بیٹھیں۔“

”وقت بہت زیادہ ہے۔“

”بھئی اب اجازت دو۔ اب میں گھر واپس جاتا ہوں۔ پھر ملاقات ہو گی۔“ چنانچہ مصافحہ کر کے

وہ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

آج کے مسرت انگیز واقعے سے اس کا دل اگرچہ مسرور تھا لیکن دوست سے اس پاجی پن کے باعث ضمیر ملامت بھی کرتا اور جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اپنی نیک اور معصوم بیوی کے تصور سے اس کا دل اور بوجھل ہو گیا۔ بے چاری شانتا ٹھٹھری ہوئی آگ کے قریب بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔

جب وہ جیا کی دُکان کے قریب پہنچا تو حسبِ معمول اس سے پوچھا "کیوں بے جیے! کوئی آیا تو نہیں تھا ہم سے ملنے۔"

جیا نے سر اوپر اٹھایا۔ "اجی بابو بیج ناتھ آئے تھے۔ سیدھے بھیتر چلے گئے۔ مجھ سے تو کچھ بولے نہیں۔ جب آپ نہیں آئے تو بیچارے انتجار کر کے چلے گئے۔"

"بیج ناتھ!" اس کے حلق سے چیخ سی نکل گئی اور وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں جی! بیج ناتھ بابو۔"

دکان سے مکان تک چند قدم کا فاصلہ اس نے بہت آہستہ آہستہ طے کیا۔ جب وہ سیڑھیوں پر قدم رکھنے لگا تو اس نے دیکھا کہ اکھڑی ہوئی دو اینٹیں پھر اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہیں۔ اس نے احتیاط سے انھیں ٹکا کر رکھ دیا اور پھر ایک لمحے بھر کے تامل کے بعد اس کے منہ سے مدھم سی ہنسی نکل گئی اور جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہاں ہر چیز جانی پہچانی تھی۔ ماحول پر سکون اور آرام دہ محسوس ہو رہا تھا۔

اس کی بیوی اندر والے دروازے میں کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ وہ اس وقت نو شگفتہ پھول کے مانند تر و تازہ اور اجلی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پھول جس کا منہ شبنم نے بڑی احتیاط سے دھو ڈالا ہو۔ جس پر جمی ہوئی گرد کی نامعلوم تہہ کسی نے چوم لی ہو۔

وہ بڑے کوچ پر بیٹھ گیا۔ شانتا شاخِ گل کی طرح لچکتی ہوئی نزدیک آئی اور اس کے قریب کوچ میں دھنس گئی۔ اس نے سر سے پاؤں تک بیوی کا جائزہ لیا اور مسکرا کر بولا "شنو! آج تم بہت خوش دکھائی دیتی ہو۔"

اپنے مخصوص انداز میں بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ لجا کر مسکرا دی۔ اس کے تر و تازہ ہونٹوں سے سپید سپید دانت کس طرح نمایاں ہوئے اور اس نے بلا کچھ کہے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے کندھے پر رخسار ٹکا دیا۔

شنو کی نیند کی ماتی پلکیں بوجھل ہو کر جھکنے لگیں۔ وہ چند لمحوں تک شنو کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کی پیٹھ پر ہلکی ہلکی تھپکی دے کر بولا۔ ”میں بھی بہت خوش ہوں شنو! ذرا ادھر لاؤ تو عبداللہ سگریٹوں کا ڈبا۔“

# بلونت سنگھ کا فن

## سائیکی، ثقافت اور شکست رومان

گوپی چند نارنگ

بلونت سنگھ اردو کے ایک باکمال افسانہ نگار تھے، تقریباً تیس کتابوں کے خالق جن میں بیس سے زیادہ ناول ہیں۔ ان کی کتابیں اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہوئیں۔ ۱۹۸۶ء میں جب بلونت سنگھ الہ آباد میں کس میرسی کے عالم میں اس دنیا سے اٹھ گئے تو ان کی لاش کو کندھا دینے والوں میں شاید ایک بھی ادیب نہ تھا۔ ان کے انتقال کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی، اور جب خبر ہوئی بھی تو سوائے ایک آدھ تحریر کے کسی کی آنکھ سے آنسو نہ ٹپکا۔ اپیندر ناتھ اشک نے البتہ ان کے افسانوں پر تقاریر نشر کیں۔ ان کا مضمون الفاظ میں بھی شائع ہوا۔ ایک مختصر گوشہ کتاب نمانے نکالا جس میں زیادہ تر پرانی تحریریں ہیں۔ یہ ہے ایک اہم فنکار کے تئیں ہمارا اخراجِ تحسین۔ اس پر سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے: فاعتبروا یا اولی الابصار!

پانچ برس پہلے جب میں مرکزی ساہتیہ اکادمی میں اردو مشاورتی بورڈ کا کنوینر تھا تو میں نے تجویز رکھی کہ ساہتیہ اکادمی کی جانب سے اردو کے اہم افسانہ نگاروں کے انتخاب بطور جامع انتھالوجی انگریزی میں شائع کیے جائیں۔ منٹو پر کتاب شائع ہو چکی تھی، خیال تھا کہ راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور بلونت سنگھ یعنی پانچ کتابوں کا سیٹ شائع کیا جائے، ترجمے کے لیے میں نے اپنے دوست جے رتن کا تعاون حاصل کیا، لیکن اس دوران عصمت چغتائی پر کتاب 'کالی برائے خواتین' کی جانب سے شائع ہو گئی، البتہ راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر پر ہماری کتابیں ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئیں۔ قرۃ العین حیدر کا انتخاب خود ان کا کیا ہوا شائع ہو رہا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اس سلسلے کی چوتھی کڑی ہے جو بلونت سنگھ کے فن اور ان کے بہترین افسانوں کے لیے مختص ہے۔ یہ انگریزی، اردو اور ہندی میں ساہتیہ اکادمی سے شائع ہو رہی ہے اور بلونت سنگھ کے

کمالِ فن کے اعتراف کی ایک حقیر کوشش ہے۔ اس بات کی خوشی ہے کہ 'آجکل' اور 'سوغات' کے گوشے راقم الحروف کے توجہ دلانے پر حال ہی میں شائع ہوئے۔

بلونت سنگھ کو ان کی زندگی میں ایک رومان نگار سمجھا گیا، حالاں کہ یہ بات جتنی صحیح ہے اتنی غلط بھی ہے۔ بلونت سنگھ کی زندگی کے خاکے سے جو الگ شائع کیا جا رہا ہے، اندازہ ہوگا کہ بلونت سنگھ انتہائی خوددار اور اپنی کھال میں مست رہنے والا شخص تھا، لاہور کا زمانہ بلونت کے کھلنڈرے پن کا زمانہ تھا...... کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور مولانا صلاح الدین احمد سے ان کی ملاقات تھی، لیکن ان کا اُٹھنا بیٹھنا شاید کسی کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ اس گون کے آدمی ہی نہ تھے۔ دوست احباب انھوں نے بنائے ہی نہیں۔ دہلی میں 'آجکل' کی ملازمت کے دوران بھی وہ الگ تھلگ ہی رہے، انھیں اس کا شدید احساس رہا کہ عرش ملسیانی اور جگن ناتھ آزاد کے مقابلے میں وہ زیادہ ذہین اور باصلاحیت تھے لیکن ان کا حق انھیں نہیں دیا گیا۔ چنانچہ سازشوں کا شکار ہو کر انھیں ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ وہ الہ آباد منتقل ہو گئے، لیکن بقول اپیندر ناتھ اشک یہاں بھی انھوں نے کسی سے ملنا پسند نہ کیا اور الگ تھلگ رہے۔ وہ نہایت وجیہ، شکیل، خوبرو اور تنومند انسان تھے۔ ٹھسے سے رکشا پر نکلتے تو اسٹیشن کتا ان کے قدموں میں لیٹا ہوتا۔ شاید انھیں خود پر اور اپنے فن پر ناز رہا ہوگا۔ انھوں نے دوسروں سے خط و کتابت بھی زیادہ نہیں کی، اور اگر کی تو وہ ابھی منظر عام پر نہیں آئی۔ شروع میں ان کی کتابیں لاہور سے شائع ہوتی رہیں، بعد میں الہ آباد ان کی زندگی کا مرکز بن گیا۔ ۱۹۷۵ء میں انھیں انتڑیوں کی تکلیف شروع ہوئی تو انھوں نے چوک کا آبائی ہوٹل جو آمدنی کا واحد ذریعہ تھا فروخت کر دیا، پھر بینائی بھی جاتی رہی۔ ۱۹۸۶ء میں جب انتقال ہوا تو اب تک کی معلومات کے مطابق گیارہ کتابیں اردو میں جن میں سات افسانوں کے مجموعے اور چار ناول ہیں، اور تیس کتابیں ہندی میں شائع ہو چکی تھیں۔ تفصیل کتابیات میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ ان میں سے بعض کتابیں بار بار شائع ہوتی رہی ہیں۔

مولانا صلاح الدین احمد نے اپنے رسالے 'ادبی دنیا' میں بلونت سنگھ کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا تھا: "بلونت سنگھ اردو کے بہت ہی نوجوان لکھنے والے ہیں یعنی اگر وہ داڑھی منڈوائے ہوتے تو یہ مشکل سے باور آتا کہ یہ صاحبزادے گیند بلا کھیلنے کے بجائے صفحۂ قرطاس پر اشہبِ قلم دوڑاتے ہیں اور اس خوبی سے دوڑاتے ہیں کہ بعض اچھے اچھے شاہسواروں کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔" اس زمانے

میں کرشن چندر نے ان کے بارے میں لکھا: "بلونت سنگھ ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جو صرف ایک افسانہ لکھ کر بقائے دوام حاصل کر لیتے ہیں...... ان کا افسانہ 'سزا' ان کی پہلی کوشش ہے لیکن اس قدر کامیاب، اس قدر خوبصورت، اس قدر جامع کہ حرف اول حرف آخر معلوم ہوتا ہے۔" راجندر سنگھ بیدی نے بھی ان کے تنوع اور شگفتگی کی داد دی۔ لیکن خود بلونت سنگھ کے خیالات اپنے معاصرین کے بارے میں کچھ اور ہی تھے۔ ان کا پہلا مجموعہ 'جگا' ۱۹۴۴ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس کے دیباچہ میں بلونت سنگھ نے ایک مزے کا لطیفہ لکھا ہے:

"ہمارے ہاں پنجاب میں چند شریف عورتوں کی ایک کہانی مشہور ہے۔ وہ سفر کر رہی تھیں۔ گرمیوں کے دن، دوپہر کا وقت، دھوپ کی تمازت...... رواں رواں کرتے ہوئے ایک رہٹ کے قریب بڑ کی گھنی چھاؤں دیکھ کر انھوں نے آرام کرنے کی ٹھانی، کھانا نکالا۔ جس میں لچیاں اور حلوہ بھی شامل تھا۔ لچی کو میدے سے بنی ہوئی لجلجی سی سفید سفید پوری یا چپاتی سمجھ لیجئے۔ بڑی لذیذ ہوتی ہے۔ پرے ایک تھکا ماندہ ان گھڑ جاٹ بھی سستانے کے لیے آ بیٹھا۔ اس نے بھی تنور کی پکی ہوئی بھاری بھرکم روٹیاں نکالیں اور ایک بڑی سی پیاز توڑنے ہی کو تھا کہ اس نے سنا۔ "آؤ بہنو! پہلے لچیاں کھائیں۔" اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے اپنی روٹیوں کی طرف دیکھا جو اس کی نیت کے فتور کو بھانپ کر اس کو یوں گھور رہی تھیں جیسے اسے کھا ہی جائیں گی مگر اس نے پروا نہ کی۔ اور روٹیوں کو لچیوں میں پھینکتے ہوئے بولا "لو بہنو! یہ دو لچ (بصیغۂ تذکیر) میرے بھی شامل کر لو"۔ کہتے ہیں اس پر عورتوں کی لچیاں بھرشٹ ہو گئیں اور انھوں نے سب کچھ جاٹ کے حوالے کر دیا...... یہ کہانی راجندر سنگھ بیدی کو سنانے کے بعد میں کہتا ہوں۔ "سو میاں! ہم نے تمھاری ادبی لچیوں میں اپنے بے ادب لچے زبردستی ٹھونس دیے ہیں۔" یہ سن کر بیدی اپنی داڑھی کو کھجانے لگتا ہے "ارے بھئی یہ بات نہیں تو لکھا کر (کچھ پس و پیش کے بعد) واللہ! خوب لکھتا ہے تو...... اس وقت میں تہمد باندھے چماروں کے پیر طریقت کی طرح چارپائی پر بیٹھا ہوتا ہوں اور بڑی آسانی سے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیتا ہوں۔"

انہوں نے مزید لکھا ہے کہ جب چودھری نذیر احمد (مکتبۂ اردو لاہور) نے میری کتاب کے لیے مجھ ہی سے کہا کہ کسی سے مضمون لکھوا دو تو میں دم بخود کہ کیا کروں۔ "بیچارہ بیدی قریب تھا۔ پھانس لیا میں نے...... وہ اصیل مرغ کی طرح ڈٹا رہا یعنی میدان چھوڑ کر بھاگا نہیں۔" لگتا ہے کرشن چندر سے بھی بلونت سنگھ کے تعلقات کچھ ایسے ہی تھے۔ وہ شوخی و شرارت سے باز نہ آتے ہوں گے اور اپنے سینیئر معاصرین سے بھی چھیڑ چھاڑ کر دیا کرتے ہوں گے۔ لکھتے ہیں:

"چند دن ہوئے کرشن چندر کی چٹھی موصول ہوئی...... فرماتے ہیں!! "آپ سے ملے ہوئے ایک مدت ہو گئی ہے، لیکن آپ کی مجرمانہ ذہنیت اب بھی یاد آتی ہے۔ لاہور نے آپ کو 'متمدن' تو نہیں بنا دیا......" یہ ہے میری عظمت۔ یعنی اگر کرشن چندر میرے پاس بیٹھے ہوں تو ایک ادیب کی قربت کا احساس کرنے کی بجائے ان کا سارا وقت اپنی جیبوں کی خبر گیری میں ہی گزر جائے۔ ایسے زبردست ادیب کی شہادت کے بعد اگر ایک بات اور سنا دوں تو امید ہے اسے دروغ گوئی نہ سمجھا جائے گا۔ میرے ایک پڑوسی رازدارانہ لہجہ میں مجھ سے کہنے لگے۔ "بھئی دیکھو برا نہ ماننا معاف کرنا...... تم صورت سے جرائم پیشہ معلوم ہوتے ہو......"

بلونت سنگھ لکھتے ہیں کہ جب صورتِ حال یہ ہو تو بھلا میں کیا لکھوں، اور اگر لکھوں بھی تو اعتبار کون کرے گا۔ یہ پروپیگنڈہ کا زمانہ ہے۔ اس وقت میں کچھ بھی نہیں، البتہ کچھ بن جانے کی جانب بڑھ رہا ہوں۔

"ضرورت اس بات کی ہے کہ میں کچھ لکھوں اور میرا وقت کچھ نہ لکھنے میں گزرا جا رہا ہے کیونکہ میں لکھ ہی نہیں سکتا۔"

یہ آخری جملہ بلونت سنگھ کے ذہن کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہے، یعنی غیر یقینی صورتِ حال میں اپنی صلاحیت پر بھروسا بھی اور معاصرین کے مقابلے میں عدم تحفظ اور عدم تکمیلیت کا احساس بھی۔ یہ کلید ہے بلونت سنگھ کے فن کی تفہیم کی جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اور حالات نے انھیں لاہور سے نکال کر دہلی اور پھر دہلی سے نکال کر الہ آباد میں پھینک دیا، اور جتنا وہ اپنے آپ میں سکڑتے گئے، اتنا ہی ان کے لکھنے کی رفتار بڑھتی گئی اور وہ اپنے تخیل کی خلق کی ہوئی دنیا میں مگن ہو گئے۔

(۱)

بلونت سنگھ کے تخیل کی خلق کی ہوئی یہ دنیا کیا تھی، اس کا رنگ و آہنگ کیا تھا، جس بیانیہ سے یہ خیالی حقیقت خلق ہوئی تھی، اس میں اشیا اور انسان کا تصور کیا تھا، یعنی کیا کوئی نقطۂ نظر یا افتادِ طبع ایسی تھی جس سے بلونت سنگھ کے اظہاری رویے کو تعبیر کیا جاسکے۔ بلونت سنگھ کی ذہنی فضا کی تشکیل میں اوپر جن اثرات و عوامل کا اشارہ کیا گیا، اس سے ظاہر ہے کہ کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی جن کی شہرت کا آفتاب طلوع ہو چکا تھا، بلونت سنگھ ان دونوں کے قریب گئے، لیکن لگتا ہے کہ جتنا وہ ان کی طرف کھنچے، اتنا خود کو ان سے کھینچتے بھی گئے، ورنہ وہ ان کو "شریف زادیوں" اور خود کو "لچے" (بدمعاش) کی تمثیل سے ظاہر ہی کیوں کرتے۔ بیدی کا رنگ اگرچہ 'دانہ و دام' سے قائم ہو گیا تھا، لیکن تینتالیس چوالیس کے لگ بھگ ابھی اتنا نمایاں بھی نہیں ہوا تھا، بلونت سنگھ بہر حال کسی شمار میں نہیں تھے۔ خود بیدی نے ہنوز بیدی کو نہیں پایا تھا، کرشن چندر البتہ شفاف تھے، ان کو آر پار دیکھا جاسکتا تھا۔ ان کی ساحرانہ نثر کا جادو بھی سریع الاثر تھا اور ترقی پسندی کی لہر بھی اٹھ چکی تھی۔ لیکن ہنوز تخلیقی رویوں پر رومانیت کا غلبہ تھا۔ نوجوان بلونت سنگھ کی ذہنی کیفیت اس وقت ایسی کشتی کی تھی جو لہروں پر ہچکولے لے رہی ہو...... ۱۹۴۴ء کے دیباچے میں انھوں نے واضع طور پر لکھا کہ میرے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ "زندگی کے کسی خاص شعبے یا مسئلے پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کردوں۔ کیا برا ہے کیا بھلا یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ میری ذہنی آوارگی (تخلیقی حسن) مجھ کو ہر جگہ لے جاتی ہے...... ممکن ہے بالآخر کوئی خاص رنگ پیدا ہو جائے۔"

یہ تو اچھا ہوا کہ اپنے فن کی نمو پر بلونت سنگھ نے کوئی پابندی عائد نہ کی۔ تبھی تو بلونت سنگھ بلونت سنگھ بن سکا۔ وہ بلونت سنگھ بھی جو بالعموم بطور بلونت سنگھ جانا جاتا ہے، اور وہ بلونت سنگھ بھی جو اُس بلونت سنگھ سے مختلف ہے اور جسے ہم اس کی کہانیوں میں تلاش کریں گے۔ رومان نگار بلونت سنگھ کے لیے البتہ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے وہ تو نظروں کے سامنے ہے۔ بلونت کی پہچان جن افسانوں سے ہے یا جو کہانیاں خود بلونت سنگھ کو محبوب تھیں، مثلاً 'جگا'، کالی تیتری، دیدار سنگھ، گرنتھی، بابا مہنگا سنگھ، سزا، ہندوستان ہمارا، 'تین باتیں'، راستہ چلتی عورت وغیرہ۔ یہ سب کی سب رومانی کہانیاں ہیں اور بالعموم معلوم بھی یہی ہوتا ہے کہ ان کی فضا اور تخلیقی رویہ سر تا سر رومانی ہے۔ 'جگا' بلونت سنگھ کی سب سے مشہور کہانی ہے۔ پوری کہانی جگا ڈاکو کے گرد بنی گئی ہے۔ اس سے

رومان کو الگ کرلیں تو باقی کچھ بھی نہیں رہتا ہے۔ لیکن یہ رومان خالص تخیلی نہیں، زندگی کی جڑوں سے پھوٹتا ہے اور حقیقت کی سطح رکھتا ہے۔ جگا ایک سانڈنی سوار ڈاکو ہے، رات کو ایک گاؤں سے گزرتے ہوئے رہٹ پر پیاس بجھانے کے لیے رکتا ہے تو ایک دوشیزہ کو دیکھ کر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ گرنام ایک معصوم الھڑ لڑکی ہے خود اپنی اداؤں سے بے خبر۔ اس کے بر عکس بلونت سنگھ نے جگا ڈاکو کی جو تصویر بنائی ہے وہ نہایت ہیبت ناک ہے، آس پاس کے علاقے کے لوگ جگا کے نام سے لرزتے ہیں، وہ اجڈ پن سے قہقہہ لگاتا ہے تو اس کی بھیانک آواز سے چمگادڑ تک اڑ جاتے ہیں۔ گرنام سے بات چیت کرتا ہوا وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ یہاں وہ بلا ہچکچاہٹ کے کہتا ہے کہ میں دور سے آرہا ہوں آج رات یہیں ٹھہروں گا۔ وہ گرنام کو باتوں باتوں میں بہت سے زیور اور موتیوں کے ہار دکھاتا اور گرنام اپنے طفلانہ بھولپن سے چہکتی رہتی ہے۔ صبح کو جب باپو اجنبی کو رخصت کرتے ہوئے اس کا نام پوچھتا ہے تو اجنبی کہتا ہے خبردار کسی کو مت بتانا آج رات جگا ڈاکو تمہارا مہمان تھا۔ باپو خوف سے لرز جاتا ہے۔ جگا کا نام سن کر بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ اس واقعے کے بعد وہ کبھی کبھی رات کی تاریکی میں گرنام سے ملنے آتا اور صبح سے پہلے رخصت ہو جاتا۔ پھر لوگوں نے حیرت سے سنا کہ اس نے ڈاکہ زنی ترک کردی۔ وہ خود کو گرنام کے قابل بنانا چاہتا ہے۔ لیکن گرنام سے اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ جب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ گرنام تو دلیپ سنگھ کو پسند کرتی ہے تو وہ ایک رات دلیپ سنگھ پر حملہ کر دیتا ہے۔ سب سمجھتے ہیں کہ دلیپ سنگھ مارا گیا، لیکن رفتہ رفتہ جب جگا کو احساس ہوتا ہے کہ گرنام کا جذبہ صادق ہے تو وہ بدلنے لگتا ہے۔ دلیپ سنگھ زخمی ہوا تھا مرا نہیں تھا۔ بالآخر خود جگا اسے لاکر باپو اور گرنام کے سامنے شادی کے لیے پیش کر دیتا ہے اور جگا ایک بار پھر جگت سنگھ ڈرک بن جاتا ہے، ایک خونخوار ڈاکو!

کہانی کے سارے عناصر کی تشکیل رومانی اجزا سے ہوئی ہے۔ مردانگی، بہادری، دلیری، تشدد، ڈاکہ زنی، بے لوث محبت، گرنام کا ملکوتی حسن، معصومیت، الھڑپن، سانڈنی سوار کی پر اسرار، بدوضع، بھیانک اجڈ شخصیت، لیکن نیک دلی، قول پر جان قربان کر دینے اور محبت کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کا جذبہ، غرضیکہ پلاٹ، کردار، منظر نگاری، مکالمے سب رومان میں رنگے ہوئے ہیں۔ کہانی بے شک کرداری ہے، لیکن کردار فقط جگا اور گرنام ہی نہیں، بھیکن کا وہ دور افتادہ رہٹ، کھیت کھلیان بھی کردار ہیں۔ بھیکن کے کچے پکے گھر، پیڑ پودے، مویشی، اپلے تھاپنے والی عورتیں، نہر، خونی پل

یہ سب مل کر ایک تشخص قائم کرتے ہیں۔ اس رومانی تشکیل میں جیتا جاگتا ٹھیکن بھی عمل آرا ہے، جس سے دوسرے عناصر کی فضا سازی ہوتی ہے۔ عقیدے، تصورات، ترجیحات، رویے، افراد ہی کے نہیں، معاشروں کے بھی ہوتے ہیں۔ یہاں ڈاکہ زنی، بہادری، مردانگی اور ایثار بھی ایک قدر ہے، مہمان نوازی، وعدہ ایفائی، آن پر جان دینے کے جذبے کی طرح، جو بطور ایک متھ کے سامنے آتی ہے اور حیرت زدہ کر دیتی ہے۔ اس کہانی کی مرکزی کشش کیا ہے، مردانگی اور قوت کی Glorification تجلیل اور متھ سازی، دیکھئے بلونت سنگھ اس کو کس طرح قائم کرتے ہیں:

"اتنے میں سانڈنی سوار ایک سکھ مرد پیپل کے نیچے آکر رُکا۔ اس نے سانڈنی کو نیچے بٹھانا چاہا۔ سانڈنی بلبلا کر مچلی اور پھر دھپ سے بیٹھ گئی۔ پنجاب کے دیہاتوں میں چھ فٹ اونچا نوجوان کوئی خلاف معمول بات نہیں مگر اس مرد کے کاندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ ہاتھوں اور چہرہ کی رگیں ابھری ہوئی، آنکھیں سرخ انگارہ، ناک جیسے عقاب کی چونچ، رنگ سیاہ، چوڑے اور مضبوط جبڑے، سر ایسے دکھائی پڑتا تھا جیسے گردن میں سے تراش کر بنایا گیا ہو، جوڑے پر رنگ برنگ کی جالی، جس میں سے تین بڑے بڑے پھندنے نکل کر اس کی سیاہ ڈاڑھی کے پاس لٹک رہے تھے۔ کانوں میں بڑے بڑے مندرے، کالے رنگ کی چھوٹی سی پگڑی کے دو تین بل سر پر، گریبان کا تسمہ کھلا ہوا، سینے پر کے گھنے بال نمایاں، ہاتھ میں تیز اور چمکدار چھوئی۔"

یہ کیفیت مکالموں سے بھی جھانکتی ہے:

"مرد نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دے کر بولا "تیرا نام کیا ہے؟"

دوشیزہ کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ بولی "گرنام۔"

"تو وہاں کس کے ساتھ رہتی ہے؟"

"میری ماں ہے، بے بے، ویر، چاچا، باپو ہی رہتے ہیں۔"

"مجھے اپنے گھر لے چل" مرد نے اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تجھ سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

مرد کی پیشانی پر بہت سی تیوریاں پڑ گئیں۔ اس نے اپنی دلہن کی طرح آراستہ

سانڈنی کی مہار پکڑ کر اپنی دانست میں ذرا نرم لہجہ میں پوچھا۔ "کیوں؟ کیا تم لوگ سکھ نہیں ہو کیا؟"

"لڑکی کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔"

لیکن اس تصور کا تضاد نازک اندام، معصوم اور الھڑ گرنام سے ہے جس کی پاکیزگی سانڈنی سوار کے تناظر میں کچھ اور پاکیزہ، اور سانڈنی سوار کی ہیبت ناکی گرنام کے جلو میں کچھ اور ہیبت ناک ہو گئی ہے:

"گرنام ایک گڑیا کی مانند تھی، چلتی تو اس سبک رفتاری کے ساتھ کہ نقش قدم معدوم، سرمگیں اور بدمست آنکھیں ایسے گناہ کی دعوت دیتی تھیں کہ جس سے بہتر ثواب کا تصور ذہن میں نہ آتا تھا، لیکن ابھی وہ معصوم تھی، شباب کی آمد آمد تھی جیسے خاموش اور پُر سکون سے میں کہیں دور سے شہنائی کی اڑتی ہوئی آواز سنائی دے جائے، ابھی وہ مردوں کے اشاروں اور کنایوں کا مطلب نہ سمجھتی تھی۔ ابھی اس میں پندارِ حسن پیدا نہ ہوا تھا، اس لیے جو بھی شخص اس سے بات کر لیتا یہی سمجھتا کہ گرنام اس سے محبت کرتی ہے۔"

عشق کے راز و نیاز سے بے خبر اس ملکۂ جمال کے حضور قتل و غارت گری کرنے والے جگا کی گھبراہٹ اور بے بسی اس متھ کو کچھ اور گہرا کر دیتی ہے۔

ہر چند کہ گرنام جگا کی نگاہوں کا مرکز ہے، لیکن اس کی صفات، مثلاً سادگی، بھولپن، طہارت، لطافت وغیرہ دراصل جگا کی ہیبت ناکی اور درندگی کے نقوش کو زیادہ تیکھا، زیادہ نمایاں کرنے کے لیے ہیں۔ گویا یہ صفات قائم اسی لیے کی جا رہی ہیں تاکہ جگا کی مردانگی کا تاثر مزید روشن ہو۔ غور سے دیکھا جائے تو جگا کردار بھی ہے اور ٹائپ بھی۔ اور یہ ٹائپ داخلی ساخت میں اس آرکی ٹائپ پر تعمیر ہوا ہے جو صدیوں سے لوک روایتوں اور قصے کہانیوں میں بطور مردانگی اور بہادری کے مظہر کے بحیثیت ہیرو طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتا رہا ہے۔ کیا یہ آرکی ٹائپ بلونت سنگھ کے فکشن کا مرکزی معنیہ نہیں، اور کیا بلونت سنگھ کی رومانی جہت اکثر و بیشتر اس سے عبارت نہیں؟ ورنہ کیا وجہ ہے کہ زراعت اور کاشتکاری پر انحصار رکھنے والی چھوٹی چھوٹی آبادیوں، دور دور پھیلے اور کم آباد کھیت کھلیانوں، چھوٹے چھوٹے گاؤں، دیہات اور قصبات میں ڈاکہ ڈالنے والے ہیبت ناک جری مرد کا

تصور بلونت سنگھ کے یہاں بار بار ابھرتا ہے۔ معاشرتی تناظر کے اعتبار سے اس کی شکلیں اور چہرے بدلتے رہتے ہیں۔ بنیادی متھ وہی ہے...... اور چہرے اس لیے بدلتے رہتے ہیں کہ بلونت سنگھ ہر بار اسے اپنے بیانیہ سے نئی تجسیم عطا کرتے ہیں اور اپنے فن سے ہر جگہ اس کو الگ پہچان دے دیتے ہیں، بہ ایں ہمہ بظاہر یا پنہاں یہ اسی متھ کی شکل ہے۔

بلونت سنگھ کے ناول 'دواکال گڑھ' کا پہلا باب دیدار سنگھ ہے۔ یہ دیدار سنگھ "پنجاب کا البیلا" کے سانڈنی سوار جسا سنگھ یا جگا کا بدلا ہوا روپ ہے۔ 'پنجاب کا البیلا' یادداشت کی ہیئت میں لکھوائی گئی کہانی ہے۔ فقط 'دواکال گڑھ' ہی نہیں، دوسرے ناولوں مثلاً 'کالے کوس' اور 'چک پیراں کا جسا' کا مرکزی کردار بھی یہی بہادر اور جری مرد ہے۔ بلونت سنگھ کی ایک اور شاہکار کہانی 'کالی تتری' بھی بہادر کپورا سنگھ ٹھٹھہ والا اور تاڑ کی طرح لمبے بگا سنگھ کے گرد بنی گئی ہے (جس کا ذکر آگے آئے گا)۔ 'گرنتھی' ایک بالکل دوسرے انداز کی کہانی ہے، لیکن اس میں بھی نجات کی سچویشن ایک ایسے شخص کے ذریعے پیدا ہوتی ہے جو قید بامشقت کے بعد رہا ہو کر آرہا ہے۔ کہانی کے آخر میں جب منتظمہ کی طرف سے گرنتھی کو گوردوارے سے چلے جانے کا حکم سنایا جا چکا ہے اور وہ بے یار و مددگار، مایوس و دل شکستہ باڑے کے قریب دونوں گھٹنوں پر کہنیاں ٹیک کر بیٹھا ہے، عین اس وقت بنتا سنگھ کندھے پر پھاوڑا رکھے آنکلتا ہے۔ بنتا سنگھ کسی عورت کو اغوا کرنے کے جرم میں ڈیڑھ برس قید بامشقت کاٹ کر لوٹا ہے۔ جیل کی سختیوں کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوا، وہ بدستور ہٹا کٹا ہے۔ پورے علاقے میں اس کا دبدبہ ہے اور لوگ اس کے نام سے لرزتے ہیں۔ جب گرنتھی بتاتا ہے کہ اس کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے تو بنتا سنگھ جھلا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ "کس کی مجال ہے تم کو یہاں سے نکالے، گرنتھی جی، تم اسی جگہ پر رہو گے اور ڈنکے کی چوٹ پر رہو گے۔ میں دیکھوں گا کون مائی کا لال تم کو یہاں سے نکالنے کے لیے آتا ہے!" بنتا سنگھ کی اس للکار کے بعد پوری حقیقت بدل جاتی ہے۔

'راستہ چلتی عورت' اور 'تین باتیں' کے مرکزی کرداروں کی تہ میں بھی اسی نوع کے جری مرد کا تصور کارفرما ہے۔ 'راستہ چلتی عورت' میں بوٹا سنگھ اپنی نئی نویلی بیر بہوٹی جیسی دلہن کو پہلی بار میکے سے اپنے گاؤں لے جا رہا ہے کہ کوٹ گوراں نام کے گاؤں کے قریب جب پیڑوں کے ایک جھنڈ کے پاس کھڑے کچھ نوجوان کی نگاہیں بے اختیار دلہن کی طرف اٹھ جاتی ہیں اور ان میں سے ایک جب خاص انداز سے کھنکارتا ہے تو بوٹا سنگھ بپھر جاتا ہے:

"بوٹا سنگھ نے اپنی لاٹھی دلہن کے حوالے کی اور پھر اس نے آگے سے تہمد کو سمیٹ کر پورے پلو کو دونوں رانوں میں گھما کر اسے پیچھے کی طرف سے نیچے پہنے ہوئے کچھے کے نیفے تک اچھی طرح ٹھونس لیا۔ سب لوگ ایک ٹک اس کی ہر حرکت غور سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے لاٹھی کو پہلے اپنی انگلی پر ٹکا کر ہوا میں اٹھایا۔ لمحہ بھر رکنے کے بعد اس نے لاٹھی کو ہوا میں خوب اوپر تک اچھالا۔ جب لاٹھی اوپر سے نیچے کی طرف گری تو اس نے اسے دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر دسوں انگلیوں پر نچانا شروع کر دیا۔ عجب تماشا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے لاٹھی کسی قسم کا ساز ہے، جس کے تاروں پر بوٹا سنگھ کی تیزی سے چلتی ہوئی انگلیاں رقصاں تھیں۔ کیا مجال جو لاٹھی اُس کی انگلیوں کی گرفت سے نکل کر گر جائے۔"

اس کے بعد بوٹا سنگھ للکارتا ہے کہ ہے کوئی مائی کا لال جو سامنے آئے:

"لاٹھی پر اپنی گرفت کے کمال کا مظاہرہ کرنے کے بعد بوٹا سنگھ نے اسے دونوں ہاتھوں میں تھام کر چاروں طرف گھمانا شروع کر دیا...... وہ پینترے پر پینترا بدلنے لگا۔ سرک لگاتا ہوا کبھی اِدھر، کبھی اُدھر نکل جاتا۔ اس کی ٹانگوں میں گویا بجلی بھری تھی۔ پاؤں کے نیچے سے دھول کے ہلکے ہلکے بادل بلبلا کر ہوا میں اٹھنے لگے۔ کچھ لمحے تو ایسے آئے جب دیکھنے والوں کو لاٹھی نہیں محض اس کا کوندتا ہوا سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ لاٹھی تھی کہ بپھرا ہوا ناگ ایسا لگتا تھا کہ نہ جانے کتنے ناگ فضا میں پھنکار رہے ہیں۔ اگر بوٹا سنگھ حملہ آوروں سے گھرا ہوتا تو اس وقت تک اس کی لاٹھی نہ معلوم کتنوں کا خون چاٹ چکی ہوتی اور نہ جانے کتنی لاشیں زمین پر بکھر چکی ہوتیں۔
آخر بوٹا سنگھ نے لاٹھی روک دی اور اس کی برنجی موٹھ پر ٹھوڑی ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ ہر شخص دم بخود بیٹھا یا کھڑا تھا۔"

'تین باتیں' کا رویل سنگھ جو ملازمت کی تلاش میں ہے، ڈاکہ ڈالنے سے توبہ کر چکا ہے کیونکہ اس کی محبوبہ امر کور نے کہہ دیا ہے کہ اگر تم جیل گئے تو میں کچھ کھا کر مر رہوں گی۔ اس دوران اس کی ملاقات ایک پرانے ساتھی ہر ساسنگھ سے ہوتی ہے جو اسے ترغیب دیتا ہے، لیکن امر کور کا سوچ کر رویل سنگھ باز رہتا ہے۔

'ویسلے ۳۸' کے آخر میں جب اجڑ بسا کھا سنگھ ظلم و بے انصافی کے خلاف ریاکار بدھ سنگھ کے سامنے تن کر کھڑا ہو جاتا ہے تو جگایا بوٹا سنگھ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:

"سامنے لمبا تڑنگا بسا کھا سنگھ کھڑا تھا، اس کے چوڑے شانے، مضبوط ٹانگیں، مچھلیوں والے بھرپور بازو، تنی ہوئی گردن، چوڑے چکلے ہاتھ ...... یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بدن میں نسوں کے بجائے فولاد کی تاریں کھینچ دی گئی ہیں...... مضبوط، مغرور، اٹل......"

کہانی 'بابا مہنگا سنگھ' میں مہنگا سنگھ بھی بہادر مرد ہے۔ زمین کی جڑوں سے اُگنے والی طاقت کی اس متھ کی تشکیل نو میں بلونت سنگھ کے قلم کی روانی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے:

"مہنگا سنگھ بہ حیثیت انسان بہت دلچسپ تھا۔ اس کا راکششوں کے مانند ڈیل ڈول، گینڈے کی طرح کھال، مربے والی پھولی ہوئی ہرڑ کی سی آنکھیں، گھنے بالوں سے ڈھکا ہوا سینہ، چھاج کے مانند کان، قدیمی بابلی بادشاہوں کی طرح بٹی ہوئی لمبی داڑھی اور مونچھیں...... اس وقت اس کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ گھونسہ مار کر اینٹ توڑ ڈالتا تھا۔ کئی معرکے کے ڈاکے ڈال چکا تھا......"

بابا مہنگا سنگھ اپنے Grotesque اضحوکہ عنصر کی وجہ سے بے حد دلچسپ کہانی ہے، جس میں تین کم اسی برس کا بابا مہنگا سنگھ جو اس عمر میں بھی دو چار سیر دودھ ایک ہی سانس میں پی جاتا ہے، اور جو پہلے ڈاکے ڈالتا تھا اب بھگتی کرتا ہے، اپنی جوانی کا قصہ سناتا ہے کہ کیلاں گاؤں کے اردگرد کا علاقہ نہایت خطرناک سمجھا جاتا تھا، بڑے بڑے درختوں کے جھنڈ اور جھاڑیاں کوسوں تک چلی گئی تھیں۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ مہنگا سنگھ کے ہاتھ میں ایک لمبا لٹھ اور کمر سے ایک ڈیڑھ فٹ کی کرپان لٹکی ہوئی تھی۔ دفعتہً دور سے ایک عجیب منظر دکھائی دیتا ہے کہ قبرستان میں تیز روشنی ہو رہی ہے یا جیسے پاس کے شمشان میں کوئی مردہ جلایا جا رہا ہو۔ گھنی جھاڑیوں میں آگ کے قریب کوئی چیز ہلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ درختوں کی اوٹ سے ہوتا ہوا مہنگا سنگھ کچھ قریب پہنچتا ہے تو ایک گائے دکھائی دیتی ہے، بالکل سیاہ:

"وہ سیاہ گائے ویرانے میں تنہا کھڑی چڑیل کا روپ معلوم ہوتی تھی۔ میں واہگورو کا نام لے کر آگے بڑھا۔ پھر ٹھٹھک گیا۔ کچھ اس قسم کا شبہ ہو رہا تھا کہ وہاں کوئی اور

ہستی بھی ہے۔ رات مکمل طور پر تاریک تھی۔ درختوں کے وہ حصے جہاں آگ کی روشنی نہیں پہنچ رہی تھی۔ بڑے خوفناک دکھائی دے رہے تھے...... میں نے زندگی، بڑے بڑے ویرانے میں بسر کی ہے۔ کئی عجائبات دیکھنے میں آئے، لیکن جو منظر وہاں دیکھا وہ مرتے دم تک نہ بھولوں گا...... گائے کے قریب ایک قبر کے پاس بڑا سا چولھا بنا ہوا تھا۔ اس میں آگ جل رہی تھی۔ کچھ برتن پڑے تھے، پانی کا ایک کورا مٹکا...... ان سب چیزوں کے درمیان ایک عورت...... بیس اکیس برس کی ایک عورت، اس قدر حسین اور پر شباب کہ زبان بیان نہیں کر سکتی، میں تو اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ سوچا نہ معلوم یہ پری ہے سچ مچ کی، یا کسی چڑیل نے پری کا روپ دھارا ہے۔

اس نے میرے دیکھتے دیکھتے چولھے میں لکڑیاں ڈال دیں، آگ بھبک اٹھی، پھر اس نے سر سے دوپٹہ اتار دیا، اس کے سیاہ بال دکھائی دینے لگے، اس نے مینڈھوں کو کھولا اور پھر ساری چوٹی کھول کر بال بکھرا دیے اور روئی کی صدری کے بٹن کھولنے لگی، صدری کے نیچے ایک مخملی واسکٹ پہن رکھی تھی اس کے بٹن کھول کر اسے بھی اتار دیا، اور جب اس نے قمیص کے بٹن بھی کھولنے شروع کیے تو میرا دل دھڑکنے لگا...... باگورو!...... باگورو!!......"

مہنگا سنگھ پہلے تو گائے کو چھو کر دیکھتا ہے کہ کہیں بھوت پریت کا معاملہ تو نہیں، پھر ہمت کر کے عورت کو پکڑ لیتا ہے۔ وہ وحشیوں کی طرح کاٹتی ہے، مقابلہ کرتی ہے۔ بالآخر ہانپنے لگتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ کئی برس پہلے اس کی شادی ایک بڑے ساہوکار سے ہوئی تھی لیکن اب تک اولاد کے لیے ترس رہی تھی۔ کسی بوڑھی عورت نے جنگل میں جا کر یہ سب کچھ کرنے کو کہا۔ مہنگا سنگھ کہتا ہے کہ اولاد حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں......اور اسے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

یہاں رات کی پر اسرار تاریکی میں بلونت سنگھ نے جنگل اور قبرستان کا ہیبت ناک منظر خلق کر کے ایسی واردات وضع کی ہے جو Grotesque کے جمالیاتی تقاضوں کی انگیز کرتی ہے اور ذہن پر گہرا نقش چھوڑتی ہے، لیکن مہنگا سنگھ فقط قصہ گو مہنگا سنگھ نہیں، بلکہ آدم کا ازلی امیج بن کر ابھرتا ہے، زمین کا آدمی جس کی سب 'حسیں' مٹی کی جڑوں سے پھوٹتی ہیں، لمبا چوڑا، کڑیل، طاقتور، مردانگی کا استعارہ، اپنی جبلی اشتہا سے جڑا ہوا...... عورت بھی جب صدری اتار کر سیاہ بال کھول دیتی ہے تو

رات کے اندھیرے اور جنگل کی آگ میں عنصری حسن و جمال کا حیرت زدہ کر دینے والا کرشمہ نظر آتی ہے۔ جنسی آسودگی کے بعد جب دونوں جدا ہونے لگتے ہیں تو مہنگا سنگھ اس کا کنٹھا پکڑ لیتا ہے۔ وہ حیران ہو کر پوچھتی ہے:

"تمھارا مطلب۔" مہنگا سنگھ کہتا ہے "اس سے پہلے تو میرا کوئی مطلب نہیں تھا، میرا اصل مطلب یہی ہے۔"

"اکیلی جان کر میرے زیوروں پر ہاتھ ڈال رہے ہو۔"

"چلو، گاؤں کے جتنے آدمیوں کے سامنے کہو، تمہارا زیور اتار لوں۔" عورت سارے زیور اتار کر مہنگا سنگھ کے حوالے کر دیتی ہے۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ایک کی ضرورت اولاد یعنی جنس ہے، دوسرے کی کسبِ زر، دونوں معاشرتی تہذیب و تمدن کے تصنع سے مادر پدر آزاد اپنے اپنے عناصر کی سچائی کے زائیدہ ہیں اور اس کی تکمیل کا مرقع۔

صاف ظاہر ہے کہ اس نوع کے جری اور مضبوط کرداروں سے جو مردانگی کا مرقع ہیں، اور بلونت سنگھ کے فکشن میں بار بار ابھرتے ہیں، بلونت سنگھ کی کسی باطنی یا ذہنی ضرورت کا خاص رشتہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں بلونت سنگھ کے شعوری انتخاب کو بہت کم دخل ہو، اور ان کی ذہنی تخلیقی ساخت میں کچھ محرک یا محرکات ایسے ہوں جو بلا ارادہ یا بالارادہ ان کو اس طرح کے آدم نما، جری اور بہادر عنصری کرداروں کی طرف لے جاتے ہوں۔ بلونت سنگھ کو انسانی تہذیب و معاشرے کی نجات ایسے کرداروں کے ہاتھوں دکھائی دیتی ہو یا نہیں، لیکن اتنا تو نظر آتا ہے کہ اس نوع کے کردار بلونت سنگھ کے پسندیدہ کردار ہیں اور وہ خود ان سے تطبیق پیدا کر کے کسی مضمر تشخص کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ تشخص کیا ہے یا یہ نفسیاتی گرہ کیا ہے؟ اس پر ہم شق دو میں گفتگو کریں گے۔ یہ مثالیت یا عینیت کے بڑے مسئلے کا حصہ بھی ہے۔ تاہم واضح رہے کہ سامنے کی یہ حقیقت پوری حقیقت نہیں۔ اس کا دوسرا رُخ بھی ہے جو پہلے رُخ کی مثالیت یا رومان سے ہٹ کر بھی ہو سکتا ہے۔

یہ بحث بہر حال شق دو کے بعد شق تین میں آئے گی۔

جیسے کہ ہم دیکھ آئے ہیں کہ 'جگا' یا 'مہنگا سنگھ، یاد واکال گڑھ' کے دیدار سنگھ 'پنجاب کا البیلا' کے

جسا سنگھ، 'راستہ چلتی عورت' کے بوٹا سنگھ، 'تین باتیں' کے رویل سنگھ، یا اس نوع کے بیسیوں دوسرے کرداروں کا بلونت سنگھ کے افسانوی ادب پر حاوی ہونا کوئی اتفاقی امر نہیں۔ یہ سب افسانوی تشکیلات ہیں جنھیں بلونت سنگھ کی فنکاری نے خلق کیا۔ خود بلونت سنگھ کا قیام لاہور میں رہا ہو، دہلی میں یا الہ آباد میں، ان کے ذہن و شعور میں ایک الگ ہی دنیا آباد تھی۔ خود وہ ایک متوسط طبقے کے شہری کے طور پر پلے بڑھے، لیکن اپنے افسانوی ادب میں وہ بار بار اپنی شہری شخصیت سے گریز کرتے ہیں۔ اور طاقت کی اس اجتماعی متھ سے بہادری کی وہ خوفناک لیکن نیک خو شکلیں تراشتے ہیں جو ان کی سائیکی میں آباد تھیں۔ یہ ان کے معاشرتی خلقیے کا وہ نقش ہے جو حال کا خون بن کر رگوں میں دوڑتا ہے اور پورے ثقافتی ڈسکورس کو وہ معانی دیتا ہے جو معانی اجتماعی سائیکی میں بسے آر کی ٹائپ اس کو دینا چاہتے ہیں۔ یہ اشخاص کردار محض نہیں ہیں، یہ ٹائپ بھی نہیں ہیں۔ بلونت سنگھ پر لکھنے والوں نے اکثر ان کو مردِ محض کے طور پر لیا ہے۔ یہ نظر کا دھوکا ہے۔ ان کے پیچھے ثقافتی معانی کی پوری کائنات تہ در تہ موجود ہے۔ وہ شخص جو کہیں کہیں سانڈنی سوار ہے، کہیں چک پیراں کا محافظ جسا ہے، کہیں پھاوڑا ٹیک کر للکارنے والا بنتا سنگھ ہے، کہیں قبرستان میں عورت کا ہاتھ پکڑنے والا مہنگا سنگھ، یا لاٹھی کو ستاروں کی طرح نچانے والا بوٹا سنگھ، دراصل ایک (Psychic Imprint) 'نفسی نقش' ہے جس سے خود بلونت سنگھ کا ذہن عبارت ہے اور بلونت سنگھ کی فنکاری جس کے بغیر مکمل نہیں۔ یہ آر کی نقش گویا بلونت سنگھ کے ذہن و شعور میں کھدا ہوا ہے، یا بلونت سنگھ کی سوچ اس رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ نیز زبان جو اجتماعی لاشعور اور تحت الشعور میں گندھی ہوتی ہے اور جو اسی تانے بانے سے معانی کے اندھیرے اجالے بنتی ہے، بلونت سنگھ جب جب قلم اٹھاتے ہیں اور اپنے تخلیقی باطن کی زبان بولتے ہیں، یعنی بلونت سنگھ جب بھی اپنے فن کی "مادری زبان" میں بات کرتے ہیں، تو یہ نقش گویا خود بخود روشن ہو جاتا ہے، اور پوری افسانوی فضا کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ مردانگی، طاقت، بہادری، خونخواری، ہیبت ناکی، بھیانک پن، نیک دلی، نجات دہندگی، مشکل کشائی، بخشش، بے نیازی اور فیاضی سب اسی کی جہات ہیں، جو گویا زمین و زماں کے بے نام قبل تاریخی رشتوں سے آنے والی روشنی کے نشان ہیں جو افسانوی ڈسکورس میں مسرت اور بہجت کا نور بھرتے ہیں اور پوری معنیاتی فضا کو طاقت اور طاقت سے جڑے ہوئے انسانی شرف کے اُجالے سے منور کر دیتے ہیں۔

اس گفتگو کے بعد اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ سائیکی کی یہ طلب ایک جمالیاتی قدر ہے (یعنی افسانوی قدر) جو فن پارے کی تاثر پذیری کو سروسامان فراہم کرتی ہے۔ بیشک یہ قدر ایک عین ہے، ایک آدرش۔ اس کے رومانی ہونے میں کلام نہیں، لیکن ٹھوس تجسیمی اور تمثیلی اظہار کی وجہ سے یہ گھنے زمینی اور معاشرتی رشتوں میں گندھی ہوئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں نسلی سائیکی کا یہ اظہار زمینی رشتوں میں رچا بسا ہے حالانکہ "پنجابیت" کا کسی نوع کا تصور بلونت سنگھ کے زمانے میں نہیں تھا۔ یہ اردو کو بلونت سنگھ کی عطا ہے۔ یہ کوئی مجرد تصور نہیں، بلکہ یہ ذہنی اور جذباتی رویے، تصور، آدرش، امنگیں، آرزوئیں، ارمان، سعی و جستجو، سوز و ساز، عشق و محبت اور مردانگی و بہادری کے موضوع و معیار بامعنی تبھی بنتے ہیں جب صدیوں سے چلی آرہی بستیوں، گھروندوں، زاد بوم، اور آبادیوں (Habitat) ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ ان بستیوں (Habitats) کی بھی دو ساختیں ہیں، ایک زمینی اور دوسرے ماحولیاتی (Ecology) یعنی گاؤں، دیہات، قصبات کے کچے پکے گھر، گلیاں، پگڈنڈیاں، حویلیاں، رہٹ، بیلوں کی جوڑیاں، گیلی منڈیریں، لہلہاتی فصلیں، محنت کش کاشتکار، سرکنڈوں کی جھونپڑیاں، اپلے تھاپتی اور چولہے جلاتی عورتیں، جگالی کرتی گائیں بھینسیں، ڈکراتے مویشی، مرغیاں، چوزے، پلے، گھوڑے گھوڑیاں، سینہ پھلا کر مستانہ وار چلتی سانڈنیاں، اُجلا افق، پھیلی دھرتی، جُھکا آکاش، نکھرتی صبحیں، سنولائی شامیں، اندھیری راتیں اور وہ سب کچھ جو بلونت سنگھ کے یہاں سانس لیتا ہے۔ اس کو گاؤں، دیہات، قصبہ کہنا اس کو محدود کرنا ہے، صرف آبادی یا آبادی کا جیتا جاگتا مرقع ہی نہیں، پورا زمینی اور آسمانی جغرافیہ ٹیلے میدان، کھیت کھلیان، جھاڑ جنگل، سنسنان بیابان، دھول اُڑاتے راستے، اور ندی نالے اور دریا اور پل اور اونچے گھنے درخت، اور پیڑ پودے لیکن فقط یہ بھی بلونت سنگھ کا پنجاب نہیں، بلکہ زمینی اور آسمانی جغرافیے کے ساتھ ساتھ انسانی جغرافیہ بھی جو بستی (Habitat) کو قرار واقعی بستی (Habitat) بناتا ہے یعنی مرد عورتیں، بچے بوڑھے، الھڑ دوشیزائیں، کلف لگائے طرہ جمائے صافے، پگڑیاں، دھاری دار تہمد، شوخ اور رنگارنگ لباس اور اوڑھنیاں، دوپٹے اور لہنگے، گوٹے اور کناریاں، میلے ٹھیلے، تیج تیوہار، سوانگ، گدے، بھنگڑے، ہیر کی تانیں، مرزا صاحباں، شبد اور کافیاں، ڈھولک، گیتوں کے بول، رشتہ داریاں، رسم رواج، طور طریقے، پہناوے، سرسوں کا ساگ، لسی اور مکے اور باجرے کی روٹیاں، قصے کہانیاں، کتھائیں، گاتھائیں، جو سب مل کر اس (Mosaic) رنگارنگ منظر بناتے ہیں جو سائیکی کا

قالب بھی ہیں اور اس کا جغرافیائی روپ اور معاشرتی رنگ و آہنگ بھی، اور جس سب کا مجموعہ اور کیفیاتی اشاریہ بلونت سنگھ کا خلقیہ ہے۔ واضح رہے کہ جس طرح آر کی نقش ایک عین یا قدر ہے، اس طرح یہ (Ecology) 'ماحولیات' اور (Habitat) 'انسانی بستی' اور اس کا معاشرتی رنگ روپ بھی بلونت سنگھ کی فنکاری میں ایک جمالیاتی قدر ہے جو اس کو نہ صرف مخصوص معنویت عطا کرتی ہے، بلکہ اس کی اپیل کو بڑھاتی بھی ہے اور تاثیر کو گہرا کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں بلونت سنگھ کے کردار 'نفسی نقش' تو ہیں ہی، اس کے ساتھ فطرت کا یہ منظر نامہ، یہ کھیت کھلیان، کنوئیں رہٹ اور فضا بھی بلونت سنگھ کی فنکاری کے تانے بانے میں بجائے خود ایک کردار ہے، اور آبادی اور معاشرت کا درجہ بھی کردار و تعامل کا ہے، جو برابر سانس لیتا ہے اور عمل میں شریک بھی ہے۔ یہ مکالمہ بھی کرتا ہے اور کہانی کو اس کی خاص معنویت بھی عطا کرتا ہے۔ یہ قدر یا آدرش یا عین جتنا تخیلی ہے اور خون میں رواں دواں ہے، اتنا ٹھوس اور زمینی اور واقعاتی اور خارجی بھی ہے۔ بلونت سنگھ کا اظہاری پیرایہ اس حد تک اس میں ڈوبا ہوا ہے کہ تانے کو بانے سے الگ کرنا تقریباً ناممکن ہے، ایسا لگتا ہے جیسے کسی ٹکڑے کو ایک جیتے جاگتے زندہ بدن سے کاٹ کر الگ کیا گیا ہے:

> "چھوٹا سا گاؤں تھا۔ دو ایک حویلیوں کو چھوڑ کر باقی تمام مکانات گارے کے بنے ہوئے تھے۔ وہی جوہڑ، وہی ببول، شرینہہ اور بیریوں کے درخت، وہی گھنے پیپل کے تلے روں روں کرتے ہوئے رہٹ، وہی صبح کے وقت کنوؤں پر کنواریوں کے جمگھٹ، دوپہر کو بڑے بوڑھوں کی شطرنج اور چوپڑ، شام کو نوجوانوں کی کبڈی اور پر سکوت راتوں میں وارث علی شاہ کی ہیر، ہیر اور قاضی کے سوال جواب، وہی مضبوط، نٹ کھٹ اور چنچل چھوکریاں اور وہی سیدھے سادے بلند قامت اور وجیہہ نوجوان......"

بلونت سنگھ کے یہاں یہ پس منظر پس منظر نہیں رہتا، کہانی میں گھ کر اس نے افسانوی وجود کا ایسا حصہ بن جاتا ہے جس نے بغیر بیانیہ کی معنویت قائم ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ گھربار اور آبادی 'جیتو' کے بغیر، اور خود 'جیتو' اس گھربار اور آبادی کے بھرے پُرے پن کے بغیر بطور کردار وضع ہی نہیں ہو سکتی:

> "شام ہو چکی تھی۔ گھر میں پکانے کے لیے کوئی چیز نہ تھی۔ اس لیے جیت کور

پیسہ آنچل میں باندھ کر دال لینے کے لیے گھر سے باہر نکلی لیکن چار قدم چل کر رک گئی، سامنے پیپل کے نیچے مگدر کے قریب چھمن سنگھ چارپائی پر بیٹھا مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔

جیت کور چھوٹی چھوٹی کانٹے دار جھاڑیوں سے شلوار بچاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ جامن کے قریب بیروں کی جھاڑیاں تھیں، اس نے تھوڑے سے بیر چکھنے کے لیے توڑ لیے، پھر آگے بڑھی۔ اس کے چہرے سے افسردگی اور غصہ کے آثار ہویدا تھے۔ آخر چھمن سنگھ اسے کیوں دِق کرتا ہے۔ اگر اور نہیں تو سمتری اس سے کم حسین تو نہ تھی۔ وہ اسے کیوں نہیں چھیڑتا؟ لیکن سمتری کے تین جوان بھائی تھے۔ اگر کوئی اس کی طرف انگلی بھی اٹھائے تو وہ اس کا خون پی جائیں۔ یہ خیال آتے ہی اسے اپنا بھائی یاد آگیا۔ اس کا بھائی گاؤں بھر میں سب سے زیادہ دراز قد تھا۔ اس کا سینہ ایسا تھا جیسے کسی بڑی چکی کا پاٹ۔ ایک بالشت اونچی اور موٹی گردن۔ چوڑے چکلے مضبوط ہاتھ۔ کلائی پکڑنے اور کبڈی کھیلنے میں دور دور تک کوئی اس کی برابری کا دعویدار نہ تھا۔ یہ باتیں یاد کر کر کے جیت کور کی آنکھوں میں آنسو آگئے، بھلا آج اس کا بھائی زندہ ہوتا تو کیا چھمن سنگھ کی ہمت پڑ سکتی تھی کہ اس سے چھیڑ خانی کرے۔"

اب اس کھیت ہی کو دیکھیے جس سے جیت کور کا معاشرتی وجود وضع ہو رہا ہے:

"چلتے چلتے وہ رک گئی۔ سامنے گنے کے کھیتوں کے پاس ہی ہرا بھرا ساگ کا کھیت تھا۔ لیکن وہ کھیت تھا تارا سنگھ کا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مویشی باندھنے کا مکان خالی معلوم ہوتا تھا۔ رہٹ چل رہا تھا اور پاس ہی بیل بندھا ہوا تھا۔

اس نے جب اچھی طرح سے دیکھ لیا کہ نزدیک کوئی نہیں ہے تو جلدی جلدی ساگ توڑنے لگی۔ معاً ایک آواز سن کر اس نے سہم کر سر اوپر اٹھایا۔ دیکھا کہ دور گنے کے کھیتوں سے تارو ہاتھ میں پھاوڑا لیے بلند آواز سے گالیاں دیتا چلا آتا ہے۔ اس کے جسم میں سنسنی سی پیدا ہوئی اور وہ ساگ وہیں پھینک کر جلدی جلدی دوسری طرف کو چل دی۔ اتنے میں تارو وہاں پہنچا۔ اس نے توڑا ہوا ساگ ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا اور پھر اس کی طرف لپکا۔ اِدھر اس کے چھوٹے چھوٹے پھٹے ہوئے سلیپر ہری

گھاس پر بار بار پھسلتے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ تارو اس کو پکڑا ہی چاہتا ہے وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ تارو بھی دوڑا۔ مختصر سی دوڑ کے بعد تارو نے اسے جا دبوچا۔ اور اس کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ کر بولا۔ کیوں ری جیتو! ہم سے یہ چالا کیاں؟ ہر روز تو ہی ساگ چرا کر لے جاتی تھی نا؟ آج میں بھی اسی تاک میں بیٹھا تھا۔"

"ہندوستان ہمارا" میں جگجیت سنگھ جو فوج میں ہے اور برما کے محاذ پر جانے والا ہے، دو چار دن کی رخصت لے کر گھر آیا ہے تاکہ محاذ پر جانے سے پہلے اپنی چلبلی بیوی سے مل لے۔ لیکن بیوی گھر پر نہیں ہے، وہ میلے میں گئی ہوئی ہے۔ اب دیکھئے میلے کا بیان کس طرح جگجیت سنگھ اور اس کی بیوی کو ایک خاص وضع میں لے آتا ہے:

"سکھوں کا جوڑ میلہ ایک برس میں ایک ہی مرتبہ لگتا تھا۔ گرو ارجن دیو جی مہاراج کی یاد میں بڑے بڑے دیوان لگتے۔ پنجاب کے دور افتادہ مقامات سے پریمی سکھ جوق در جوق آتے۔ دو دن تو اس جگہ تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سبھی جمع ہوتے تھے۔ اتنی بھیڑ میں بھلا جگجیت سنگھ کی بیوی کا کیا پتہ چل سکتا تھا۔

بڑے گوردوارے کے ارد گرد دور تک علیحدہ علیحدہ شامیانوں کے نیچے دیوان لگے ہوئے تھے۔ ان دیوانوں میں مرد بھی شامل تھے عورتیں بھی۔ اس نے سوچا ممکن ہے وہ کسی دیوان ہی میں بیٹھی ہو۔ وہ بھاگا بھاگا ایک ایک دیوان میں گھس گیا۔ اسٹیج پر نئی روشنی کا ایک سکھ جنٹل مین کھڑا ہوا تھا۔ وہ سکھ قوم کے کسی مسئلے پر جدید روشنی میں بحث کر رہا تھا۔

ایک اور بڑے مجمع میں بہت عورتیں بیٹھی دکھائی دیں۔ وہ خود لمبے قد کا شخص تھا۔ لیکن اس کے آگے کھڑے ہوئے طرہ باز سکھ نوجوانوں کی پگڑیوں کے پھیلے ہوئے کلغے اس کے راستے میں حائل ہو جاتے تھے۔ وہ بھی مجمع میں گھس کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں ڈھڈ سارنگی والوں نے سماں باندھ رکھا تھا۔ ڈھڈ چھوٹی ڈھولک سی ہوتی ہے جسے ایک ہاتھ میں پکڑ کر دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے اسے بجایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ستار بجتا ہے۔ یہ دونوں ساز رزمیہ اور جوشیلے گانوں کے لیے مخصوص

ہیں۔ سب سے زیادہ بھیڑ اسی جگہ تھی۔ عورتوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ جگجیت سنگھ کو پورا یقین تھا کہ اس کی بیوی اس جگہ ضرور مل جائے گی۔

وہ تعداد میں تین تھے۔ تینوں شخص خوب پلے ہوئے بھینسوں کی طرح موٹے تازے تھے۔ رنگ تانبے کی مانند سرخ۔ گردن کی رگیں پھولی ہوئیں۔ جوش میں بھرے ہوئے شیروں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ اس وقت وہ مشہور شاعر شاہ محمد کی لکھی ہوئی رزمیہ نظم سنا رہے تھے۔ اس نظم میں شاہ محمد نے بڑے پرجوش انداز میں سکھوں اور انگریزوں کی لڑائی کا حال بیان کیا ہے۔ ڈھڈ والوں میں ایک شخص کبھی نثر میں جنگ کا نقشہ کھینچتا اور پھر کوئی بول وہ تینوں ہم آواز ہو کر ایک ساتھ پرجوش انداز انداز میں گانے لگتے۔

چٹھی لکھی فرنگیاں خالصے نوں
تُسی کاس نوں جنگ مچانودیں او
(انگریزوں نے سکھوں کو چٹھی لکھی کہ آپ جنگ کیوں چھیڑ رہے ہیں)
کئی لکھ روپیہ لے جاؤ ساتھیوں
ہور دیے جو نُس فرماندے او

(ہم سے لاکھوں روپیہ لے جاؤ اور اس کے علاوہ جو کچھ آپ طلب کریں ہم دینے کو تیار ہیں)۔"

اس اقتباس میں مزاح اور ہلکے سے طنز کی جو زیریں لہر ہے، بلونت سنگھ کی خوش دلی کی غماز ہے کہ وہ جس ثقافتی خلقیے کی تشکیل کر رہا ہے، وہاں وہ اپنی گھات میں بھی بیٹھ سکتا ہے۔ ڈھڈ سارنگی والوں کی رزمیہ نظم میں انگریزوں سے جنگ کی جو پرچھائیں ہے، اس کی پوری معنویت کہانی کے آخر میں کھلتی ہے جب جگجیت سنگھ کو ٹرین میں سوار ہوتے وقت انگریز ڈبے میں نہیں گھسنے دیتا اور جگجیت سنگھ گاڑی چلتے وقت اسے گھسیٹ کر پلیٹ فورم پر کھڑا کر دیتا ہے اور خود دوڑ کر گاڑی میں سوار ہو جاتا ہے۔

گوردوارے، شبد کیرتن، دھرم شالائیں اور روزمرہ کے معمولات بھی بلونت سنگھ کے بیانیہ کو مخصوص رنگ و آہنگ دیتے ہیں:

"رویل سنگھ گوردوارہ ڈیرہ صاحب کے صحن میں سویا ہوتا تو اسے منہ اندھیرے

ہی جاگنا پڑتا۔ چونکہ گوردوارے میں صبح ہی صبح شبد کیرتن شروع ہو جاتا تھا، اور صحن کی صفائی کے لیے مسافروں کو جگانا پڑتا تھا۔ اس لیے چھت پر دیر تک سویا رہا۔ یہاں تک کہ سورج نکل آیا اور تیز دھوپ میں شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ کا کلس جگمگا اٹھا۔

کیرتن شروع ہو چکا تھا اور گرو پریم کے متوالے نر وناری جمع ہو رہے تھے۔ رویل سنگھ کو اپنی غفلت پر بڑی شرم محسوس ہوئی۔ جب وہ گاؤں میں تھا تو کبھی اتنی دیر سے نہیں اٹھا تھا، لیکن جب سے وہ لاہور میں آیا تھا، دن بھر آوارہ گردی کرنے کے بعد اس قدر تھک جاتا تھا کہ طلوع آفتاب تک غٹ رہتا تھا۔"

ان حصوں کو اگر ان کہانیوں کے تسلسل میں پڑھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ ثقافتی نقوش ان کرداروں کی تشکیل اور ان کی شناخت کا ناگزیر حصہ ہیں۔ یوں یہ کیفیت بلونت سنگھ کے بیانیہ کا نشانِ امتیاز ہے۔ یہ کہانیاں اگر بلونت سنگھ کی نہایت کامیاب کہانیاں ہیں، یا اگر ان کا شمار بلونت سنگھ کی بہترین کہانیوں میں کیا جا سکتا ہے تو اس کی بڑی وجہ ان کی ثقافتی تشکیل ہے جو تھیم کا درجہ حاصل کر گئی ہے۔ 'گرنتھی' میں گرنتھی کی ساری معنویت گوردوارے کی زمینی اور روحانی فضا، اور گوردوارے کے ثقافتی معمولات سے ہے۔ اس کہانی میں زندگی اسی سے سانس لیتی ہے:

"ست نام۔ یہ الفاظ حسبِ معمول گرنتھی جی کے منہ سے نکلے اور ان کے قدم رک گئے، لیکن ان کے کچھہرے کا لٹکتا ہوا ازار بند گھٹنوں کے قریب جھولتا رہا۔"

گرنتھی پر الزام ہے کہ اس نے گوردوارے میں کسی عورت کا ہاتھ پکڑا ہے اور اس سے چھیڑ چھاڑ کی ہے چنانچہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ کل شنکرانت کا کام نمٹا کر پرسوں گرنتھی کو چلتا کر دیا جائے۔ گرنتھی اور اس کی بیوی کو معلوم ہے کہ جو الزام لگایا گیا ہے وہ بے بنیاد ہے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے۔ اسی فکر میں گرنتھی کی آنکھ لگ جاتی ہے:

"جب جاگا تو تارے جھلملا رہے تھے۔ ہوا میں خنکی تھی۔ باڑے میں بوڑھا بیل سینگ ہلا رہا تھا اور اس کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ گوردوارے کے اندر اس کے چھوٹے سے مکان کے صحن میں اس کی بیوی دہی بلو رہی تھی۔ دہی بلونے کی آواز اس بات کا یقینی ثبوت تھی کہ اب صبح ہونے والی تھی۔ ایک جھاڑن

کاندھے پر ڈالے، وہ کھیتوں میں سے ہوتا ہوا باڑے میں واپس آیا اور بیل کی رسی کھول کر رہٹ کی طرف بڑھا۔

پرانی طرز کا یہ رہٹ سطح زمین سے بہت اونچا تھا۔ ایک اونچا گول چبوترا جہاں سے گوبر ملی مٹی نیچے گرتی رہتی تھی۔ چبوترے کے دونوں طرف گارے کی بے ڈول سی ٹیڑھی میڑھی دو دیواریں کھڑی تھیں۔ ان پر درخت کاٹ کر ایک طویل لٹھ ٹکا دیا گیا تھا۔ اس کے بیچوں بیچ چر کھڑی کی لکڑی گھسی ہوئی تھی پاس ہی دوسری چر کھڑی اس میں دانت جمائے کھڑی تھی۔ نچلی چر کھڑی کے پاس لکڑی کا کتا جو اس کو پیچھے کی جانب گھومنے سے روکتا تھا۔ جب بیل کو جوت دیا گیا اور چر کھڑیاں گھومنے لگیں تو کنواں عجیب سروں میں روں روں کی آواز نکالنے لگا۔"

اس عرصے تک ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ اس گوردوارے میں گرنتھی مقرر ہوا تھا۔ یہاں اس کو فراغت حاصل تھی۔ کہانی کا محور گرنتھی کی ذات اور مستقبل کی تشویش ہے۔ ساری کہانی اسی فکر مندی اور پریشانی کے گرد گھومتی ہے کہ اب اس کا کیا ہوگا۔ ایک کے بعد ایک کئی واقعات ہیں، روزمرہ کے، گوردوارے کے معمولات کے، ان مقامات اور مناظر اور جانوروں اور پیڑ پودوں اور پرندوں کے جو گرنتھی کی زندگی کا حصہ ہیں، بیانیہ انھیں کے سہارے آگے بڑھتا جاتا ہے اور ہر ہر قدم پر گرنتھی کا کردار اپنی گوناگونی کے ساتھ اس ساری ثقافتی فضا کا حصہ بن کر ابھرتا رہتا ہے، اس کو اپنی بے گناہی کا احساس تو ہے ہی، ہر ہر واقعے کے بعد اس کا روحانی یقین بھی بڑھتا رہتا ہے کہ شاید کوئی صورت پیدا ہو:

"آج شنکرانت تھی۔

صفائی اور چھڑکاؤ کے بعد ٹاٹ فرش پر بچھایا گیا۔ گرنتھ صاحب پر سلک کے رومال ڈال دیے گئے۔ چوری بھی صاف کر کے قریب رکھ دی گئی۔ پھر وہ اندر سے ہارمونیم، ڈھولکی چمٹا، چھینے وغیرہ گانے بجانے کے ساز اٹھا لایا۔ اس کی بیوی پاس کھڑی داتون کر رہی تھی۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کو اس بات کا احساس تھا کہ جب ان کو وہاں رہنا ہی نہیں تو ان کی بلا سے وہ کام بھی کیوں کریں۔ لیکن یہ گورو گھر کا کام تھا۔ یہ تو گوردوارے کی سیوا تھی۔ کسی پر کیا احسان تھا۔

اپنی ہی آخرت کا سوال تھا...... اور دونوں کے دلوں میں ایک مبہم سا احساس بھی تھا کہ ممکن ہے کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ ان کا جانا منسوخ ہو جائے۔"

ہاتھ میں سنکھ لیے وہ گوردوارے کی ٹوٹی پھوٹی چار دیواری سے باہر نکل آیا:

"دروازے کے قریب درخت کا ایک بھاری بھر کم تنہ پانی کے گڑھے میں دھنسا پڑا تھا۔ ارد گرد گوردوارے کے وہ کھیت تھے جن میں اس نے خود ہل چلایا تھا، بیج بویا تھا۔ چاندنی اور اندھیری راتوں میں پانی سے سینچا تھا۔ نلائی کی تھی۔ ان کھیتوں سے اس کا کتنا گہرا تعلق تھا۔ اس کا پسینہ ان کھیتوں کی بھربھری مٹی میں جذب ہو چکا تھا۔ اب وہ اپنی امانت کسی صورت میں بھی واپس لینے کا حقدار نہ تھا۔ قریب ہی بڑ کا ایک بوڑھا درخت تھا۔ جس کی بابت ایک روایت مشہور تھی۔ گوروؤں کے زمانے میں ایک نہایت پاکباز شخص اس گوردوارے میں سیوا کرتا تھا۔ اس نے اپنی عمر اسی جگہ گورو کے چرنوں میں بتادی۔ یہاں تک کہ وہ بوڑھا ہو گیا......"

سنکھ بجانے کے بعد وہ باغ میں جاتا ہے، انگور کی آڑی ترچھی بیلوں کو لکڑیوں کے ساتھ لگا لگا کر باندھتا ہے۔ ہرے دھنیے اور مرچوں کی کیاری کو ٹھیک کرتا ہے۔ انار کے پیڑ خاموش سمادھی لگائے درویشوں کی مانند نظر آتے ہیں، باغ کا کتنا حصہ بیکار پڑا تھا، سوچتا ہے جھاڑیوں اور مدار کے خودرو پیڑوں کو صاف کر کے سبزیاں لگائے گا وغیرہ۔

"بھٹی کے قریب اس نے کڑاہ پرشاد کا کل سامان اکٹھا کر دیا۔ لکڑیاں اور موٹے موٹے اپلے بھی ایک طرف ڈھیر کر دیے اور سنکھ لے کر پھر درخت کے تنے پر جا کھڑا ہوا۔ تیسری مرتبہ سنکھ پور کر وہ دیر تک اسی جگہ کھڑا رہا۔ دھوپ چلچلا رہی تھی۔ آنکھیں دھوپ میں تپی ہوئی ہوا کی گرمی کو برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر گاؤں پر نظر جما دی۔ شاید کوئی صورت نظر آجائے۔"

بالآخر لوگ آنا شروع ہوتے ہیں۔ وہ ہاتھ پاؤں دھو کر پگڑی کو درست کرتا ہے۔ گلے میں زرد رنگ کا کپڑا اڑا لے واہگورو واہگورو کہتا ہوا گرنتھ صاحب کے پاس جا بیٹھتا ہے:

"گرنتھ صاحب سے رومال ہٹا کر ان کو احتیاط سے لپیٹ جلد کے نیچے دباتے ہوئے متبرک کتاب کو کھولا اور آنکھیں موند کر چوری ہلانے لگا۔

لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے عورتیں چار دیواری کے اندر داخل ہوئیں۔ ان میں سے بعض نئی نویلی دلہنیں تھیں۔ جنھوں نے کہنیوں تک چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ سرخ رنگ کی قمیص اور شلوار میں گٹھڑی سی بنی ہوئی وہ بیر بہوٹیوں کی مانند دکھائی دیتی تھیں۔ گورو گرنتھ صاحب کے سامنے پیسے، بتاشے، پھول، تھالیوں میں دالیں، چاول آٹا وغیرہ رکھ وہ ماتھا ٹیکتیں اور ایک طرف بیٹھ جاتیں۔ لڑکیوں میں بعض نے ہارمونیم پکڑ لیا۔ ایک لڑکا پچھلے تختے کو ہلا ہلا کر ہوا دینے لگا۔ دوسرا اپنی انگلیوں سے لکڑیوں کے سیاہ سپید سروں کو بے تحاشہ دبانے لگا۔ ایک نے ڈھولکی بجانی شروع کی۔ دو لڑکے بڑے چمٹے کو بجانے لگے۔ چھینے بھی چھنا چھن بولنے لگے۔ ادھر عورتیں آپس میں تبادلۂ خیال کرنے لگیں۔"

"اب مردوں کی آمد شروع ہوئی۔ موٹے کھدر کے تہبند باندھے، گھٹنوں تک لمبے کرتے پہنے، سروں پر آٹھ آٹھ دس دس گز کلف لگی پگڑیاں لپیٹے، ہاتھوں میں لوہے اور پیتل کی شاموں والی مضبوط لاٹھیاں تھامے اور اپنی داڑھیوں کو خوب چکنا کیے ہوئے آئے اور ماتھا ٹیک کر وہ اِدھر اُدھر بیٹھنے لگے۔ ان میں سرو قد مضبوط نوجوان بھی تھے جن کے تہبند رنگ دار تھے۔ تہبند کے پچھلے حصے ایڑیوں میں گھسٹتے آتے تھے۔ بعض جو شلواریں پہنے ہوئے تھے ان کے رنگین ریشمی ازار بند خاص طور پر گھٹنوں تک لٹک رہے تھے۔ پگڑیوں کے شملے اکڑے ہوئے۔ ایسے چھیل چھبیلے بھی تھے جنھوں نے پگڑی کا آخری سرا گھما پھرا کر پگڑی کے اگلے سرے پر آن ٹھونسا تھا جیسے کسی پلے ہوئے مرغ کے سر پر اس کی شاندار کلغی۔

مردوں کے پہنچ جانے پر کارروائی شروع ہوئی۔ چند نوجوانوں نے بڑھ کر ساز سنبھالے، ایک ایک الائچی اور لونگ منہ میں ڈال کر ساز بجانے شروع کیے، ہارمونیم کے ساتھ تال پر ڈھولکی بجنے لگی۔ چمٹے والے نے جھوم جھوم کر چمٹا بجانا شروع کیا۔ اِدھر چھینے بھی ٹکرائے، ہارمونیم والے نے منہ کھول کر ایک طویل "ہو" کی آواز نکالنے کے بعد گایا۔

ایتھے بیٹھ کسے نہیں رہنا میلہ دو دن دا

اتنا کہہ کر وہ مسلسل منہ ہلانے لگا۔ ڈھولکی والے کی گردن ہلتی تھی تو چمٹے والے کا دھڑ۔

جب ایک مرتبہ کارروائی شروع ہو گئی تو سر کردہ اصحاب نے آپس میں کانا پھوسی شروع کر دی۔ کئی مسائل زیر بحث تھے۔

شبد کیرتن کے بعد سری گورو گرنتھ صاحب کی پوتر بانی پڑھ کر حاضرین کو سنائی گئی۔ اس کے بعد گرنتھی چوکی پر سے اترا اور ارداس (دعا) کے لیے گورو گرنتھ صاحب کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ حاضرین نے بھی اس کی پیروی کی۔ سب لوگ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ گرنتھی نے آنکھیں بند کر لیں اور ارداس شروع کر دی۔

"پرتھم بھگوتی سمر کے گورونانک لئی دھیائے
پھر انگد گور تے امرداس رامداسے ہو سہائے"

ارداس کے بعد گرنتھی دل ہی دل میں کہتا ہے "سچے پادشاہ سے دلوں کا حال چھپا نہیں۔" پھر 'جو بولے سو نہال ست سری اکال' کڑاہ پرشاد بٹتا ہے۔ لوگوں کے رخصت ہونے کے بعد چند بڑے لوگ بیٹھے رہ جاتے ہیں۔ جو پرشاد باقی تھا وہ ان کو بانٹ دیا جاتا ہے۔ حساب کتاب ہوتا ہے اور گرنتھی سے کہا جاتا ہے کہ رخصت ہونے سے پہلے چابیاں بگا سنگھ نمبردار کو دے دے۔ گرنتھی کی سب امیدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ بیوی سامان باندھنا شروع کرتی ہے۔ اور گرنتھی اضطراب زدہ ادھر اُدھر ٹہلنے لگتا ہے۔

"اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے وہ تالاب کے قریب کھڑا ہو کر اس کے سبزی مائل پانی کو دیکھنے لگا۔ اس کے کنارے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ ایک دو جگہ سے سیڑھیوں کی اینٹیں بھی اکھڑ گئی تھیں۔ کائی جمی ہوئی تھی۔

اس کے قریب پرانی سمادھی تھی جس کی دیواروں پر سے جا بجا چونا اکھڑا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں پر پرانے زمانے کی رنگ دار تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ درخت کی چھاؤں تلے بابا نانک بیٹھے تھے۔ ایک جانب بھائی بالا اور دوسری طرف بھائی مردانہ۔ درخت کی شاخ سے پنجرا لٹک رہا تھا۔ جس میں ایک سرخ چونچ والا طوطا صاف دکھائی دے

رہا تھا اسی حجرے میں ساتویں گورو صاحب پرماتما کی یاد میں مصروف رہتے تھے۔ تین چار برس پہلے کی بات تھی کہ ایک سکھ اسی حجرے میں بیٹھ کر بلاناغہ بھگتی کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ رات کے وقت یکایک حجرہ منور ہو گیا، ذرہ ذرہ دکھائی دینے لگا۔ اتنے میں ایک نورانی صورت نظر آئی...... لیکن وہ سکھ جلوے کی تاب نہ لا سکا۔ وہ بھاگ کر باہر نکل آیا اور فی الفور گونگا ہو گیا۔ اس کے بعد کسی نے اس کو بولتے نہیں سنا...... گرنتھی نے حجرے کا دروازہ کھول کر اس کے نمدار فرش پر اپنا ننگا پاؤں رکھا اور چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں اس کی بیوی وہاں آئی اور اس کی متغیر صورت دیکھ کر کچھ پریشان سی ہو گئی۔ وہ اس کو اپنے ساتھ لے گئی۔"

بالآخر سورج ڈوب جاتا ہے۔ تاریکی بڑھنے لگتی ہے۔ گرنتھی باڑے کے قریب چارپائی پر بیٹھا کہنیاں ٹیکے اداس بیٹھا ہے کہ بنتا سنگھ کندھے پر پھاوڑا رکھے نمودار ہوتا ہے جو کسی جرم کی پاداش میں قید بامشقت کاٹ کر آیا ہے۔ اس کے بعد وہ ہوتا ہے جس کے لیے یہ ساری کردار سازی اور فضا سازی کی گئی تھی یعنی گرنتھی کی پٹائی سننے کے بعد وہ گوردوارے کے خود ساختہ چودھریوں کو للکارتا ہے اور گرنتھی سے کہتا ہے، تم ڈنکے کی چوٹ یہیں رہو گے۔ میں دیکھوں گا کون مائی کا لال تم کو نکالتا ہے۔ غرضیکہ طاقت کے بل پر جرم کی تعبیر بدل جاتی ہے۔ اگلے دن صبح ہوتے ہی مشہور ہو جاتا ہے کہ گرنتھی بیچارہ تو معصوم ہے ساری شرارت لاجو نے خود کی تھی۔ دیکھا جائے تو سارا بیانیہ خلقیہ ہے اور سارا خلقیہ بیانیہ۔ اب آخر میں اس وضاحت کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ جس طرح آرکی نقش بلونت سنگھ کے بیانیہ کی پہچان ہے، اس طرح یہ خلقیہ اور ثقافتی جغرافیہ بھی بلونت سنگھ کے بیانیہ میں گندھا ہوا ہے، اور رومان سازی کا حصہ ہے۔

(۳)

جن خصائص کا اب تک ہم ذکر کر آئے ہیں یعنی مردانگی کا آرکی نقش، یا فطرت جو ہنوز آلودہ نہیں ہوئی اور اپنی اصل سے قریب تر ہے۔ یا انسانیت جو عمل آوری کے لیے اپنے باطن ہی سے رجوع کرتی ہے یا جذبہ وجدان سے جو خود انسانیت کا شرف اور اس کا جوہر (Essence) ہے، اصلاً یہ سب رومان ہی ہے، یا اس کے متنوع اجزا جن کو سمیٹنا ان کو محدود کرنا ہے۔ یہ تصور جو کہیں آرکی

ہے، کہیں عنصری، کہیں زمینی، بطور قدر اسی شرف سے عبارت ہے۔ اس کے اوصاف اور امتیازات رومانیت ہی کے اجزا ہیں، نیز فطرت کی دوشیزگی، اس کا چھوتا پن، یا معاشرت کا آلائشوں سے پاک ہونا بھی اسی رومان کی پرتیں ہیں جہاں پیچیدگیاں سلجھ جاتی ہیں اور انسانی شرف اور جوہری نیکی بالآخر غالب آتے ہیں اور زندگی کے حسن، حق اور خیر کی توثیق کرتے ہیں۔ مگر واضح رہے کہ یہ بلونت سنگھ کی فنکاری کا صرف ایک رُخ ہے، اور زیادہ تر یہی رُخ سامنے رہتا ہے۔ زیادہ تر لکھنے والوں نے اسی رخ سے سروکار رکھا ہے۔ عین ممکن ہے خود بلونت سنگھ کو یہی رُخ مرغوب ہو اور خود انہوں نے بھی اسی سے سروکار رکھا ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بلونت سنگھ کے یہاں جس طرح رومان اور رومان کے اعیان واقدار معنویت رکھتے ہیں، اس کی شکست یعنی شکستِ رومان کی کارفرمائی اور ان اقدار کا تہس نہس ہونا بھی اتنی ہی معنویت رکھتا ہے۔ البتہ یہ کیفیت بھی سائیکی کے گہرے نقوش سے ابھرتی ہے، اور اس کا ثقافتی قالب بھی جڑوں کا پیرایہ رکھتا ہے، لیکن شق ایک اور شق دو کی کہانیوں میں نیکی جس قدر حسین 'روح پرور' اور مُشکل کشا تھی، یہاں اس کا لبادہ اتنا ہی تار تار ہے، حقیقت اتنی ہی تلخ ہے، توقعات بکھرتی ہیں، انسان خود اپنے ہاتھوں اپنے آدرشوں کا گلا گھونٹتا ہے۔ اس مضمون کے باقی حصے میں زیادہ تر بحث بلونت سنگھ کے بیانیہ کے اسی رُخ سے کی جائے گی۔

تعجب نہ ہونا چاہیے کہ بلونت سنگھ کی بعض بہترین کہانیاں اس زمرے میں بھی آتی ہیں، یہ کہانیاں فنی چابکدستی اور جمالیاتی اثر پذیری میں پہلی شق کی کہانیوں سے کسی طرح کم نہیں، بلکہ حقائق کی سفاک ترجمانی میں کچھ زیادہ ہی کارگر ہیں، بالخصوص 'پہلا پتھر' 'وسیلے' 'دیش بھگت' اور 'کالی تتری'۔ ویسے تو میں 'کٹھن ڈگریا' 'دیمک' 'سمجھوتہ' اور 'پیپرویٹ' کو بھی اسی میں شامل کروں گا، لیکن بوجوہ ان کی بحث شق چار میں شہری کہانیوں کے ساتھ اٹھائی جائے گی۔ 'پہلا پتھر' 'وسیلے' اور 'دیش بھگت' گاؤں کی فضا سے شہروں کی طرف آنے کی کہانیاں ہیں اور آسان سا نتیجہ یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شکست رومان کی فنکاری شہری آلودگی سے مہمیز ہوئی ہے، لیکن یہ توقع کالی تتری اور اسی قبیل کی دوسری کہانیوں کی موجودگی سے شکست ہو جاتی ہے، جو رومانی توقعات کو اتنا ہی شکست کرتی ہیں جتنا جگایا جسا یا دیدار سنگھ ان توقعات کو اُبھارتے اور ان کی تکمیل کرتے ہیں۔

'وسیلے ۴۸' شرنارتھیوں کے مغربی پنجاب سے نکل کر جالندھر شہر کے ایک غیر آباد علاقے میں آبسنے والوں کی کہانی ہے، جہاں ایک طرف ہجرت کر جانے والوں کے مکانوں کے کھنڈر

تباہی اور بربادی کی داستان کہتے ہیں تو دوسری طرف سکھوں اور ہندوؤں کے کچھ مکان صحیح و سالم بھی موجود ہیں۔ انھیں میں سردار بدھ سنگھ کا مکان بھی ہے۔ سردار بدھ سنگھ صبح شام پاٹھ کرتے، مالا جپتے، اور سکھ منی صاحب پڑھتے تھے اور دوسروں کو بھی پڑھنے کی تلقین کرتے تھے۔ فسادات کے بعد جب پانسہ پلٹا تو انھوں نے دہشت زدہ بھاگنے والوں کی جائدادیں کوڑیوں کے مول خریدیں، اور پھر شرنارتھیوں کے ہاتھوں زیادہ سے زیادہ داموں پر بیچ کر خوب منافع کمایا۔ اسی کے ساتھ پاٹھ میں بھی شدت آئی اور سردار بدھ سنگھ کا چہرہ نورِ معرفت سے دمکنے لگا۔ یہاں آکر بسے والوں میں ایک غریب خاندان بساکھا سنگھ کا بھی تھا۔ دو لڑکے، تین لڑکیاں اور جوان ہوتی ہوئی چھوٹی بہنیں، مار دھاڑ سے بچتے بچاتے یہ لوگ سردار بدھ سنگھ کے پڑوس میں ایک بوسیدہ مکان میں بس گئے تھے۔ بساکھا سنگھ دن رات محنت مزدوری کرتا لیکن کنبہ کا پیٹ بھرنا مشکل تھا۔ سردار بدھ سنگھ کے پوجا پاٹھ سے وہ بہت متاثر تھا۔ بساکھا سنگھ کی خواہش تھی کہ کہیں سے دو چار سو روپیہ مل جائے تو چھوٹی موٹی دکان ہی کھول لے، لیکن مدد مانگنے پر بدھ سنگھ کہتے: ”بساکھا سنگھ جی! گوردوارے جایا کرو، پاٹھ کیا کرو، شردھا رکھو...... گورو کے گھر میں کیا نہیں ہے جو مانگو گے ملے گا۔“ بساکھا سنگھ کے گھر میں کئی بار آٹا تک نہ ہوتا اور بچے بلکتے، لیکن وہ بلاناغہ بدھ سنگھ جی کے درشن کرتا، بڑی عقیدت سے ان سے گیان دھیان کی باتیں سنتا اور اس پر وجد طاری ہو جاتا۔ لیکن رفتہ رفتہ اسے یہ باتیں عجیب معلوم ہونے لگیں۔ ایک شام:

”دو کمروں میں سے ایک میں گورو گرنتھ صاحب کا پرکاش کیا گیا تھا۔ اس کمرے میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ گورو گرنتھ صاحب اونچے چبوترے پر رنگین رومالوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ ان کے آگے دری پر بچھے ہوئے رومال کے دامن میں چند رنگین پھول دکھائی دے رہے تھے۔ مکھیاں جھلنے کی چوری کے سفید بال گھوڑے کی ایال کی طرح ایک جانب کو لٹکے ہوئے تھے۔ دائیں بائیں چھوٹے چھوٹے گلدان اور ان میں باسی گھاس میں چند پھول اڑے دکھائی دے رہے تھے۔ چونکہ بجلی ابھی وہاں نہیں آئی تھی، اس لیے ایک چھوٹا سا خوبصورت لیمپ چوکی پر دھرا تھا۔ بساکھا سنگھ کے لیے وہی جانا پہچانا ماحول تھا، ایک طرف دیوار پر گورو نانک صاحب کی بڑی سی تصویر تھی جس میں وہ نام جپتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ آنکھیں بھگتی رس میں ڈوبی

ہوئیں، ہاتھ میں مالا 'نام خماری نانکا چڑھی رہے دن رین' ۔ انھوں نے لوگوں کا گاڑھی کمائی کا روپیہ نہیں کھایا تھا بلکہ انھوں نے سچا سودا کیا تھا جس پر باپ نے انھیں بری طرح پٹیا تھا......

سردار جی نے گاؤ تکیہ بغل میں دبایا اور قریب کی الماری میں سے سبز رنگ کی جلد والی ایک موٹی سی کتاب نکالی۔ اس میں مختلف بھگتوں کا کلام مع تشریح کے درج تھا۔

سردار جی نے بڑے انہماک سے کلام سنانا شروع کیا......"

پروگرام ختم ہونے کے بعد سردار بدھ سنگھ نے بساکھا سنگھ کو بتایا کہ "آج انھوں نے پستول خریدا ہے، ویبلے اڑتیس بور...... آٹومیٹک...... زمانہ خراب ہے......" بساکھا سنگھ کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے وہ پستول کو ہاتھ میں لے کر حیرت زدہ دیکھتا ہے کہ ایک طرف تو ایک یا دو سو روپے کا نہیں، چودہ سو کا پستول، اس پر بھی سردار بدھ سنگھ کے لیے سستا اور دوسری طرف روٹیوں کے لالے۔ وہ دستے کو مضبوطی سے تھام کر انگلی لبلبی پر رکھ دیتا ہے "کیسا گیان دھیان اور کیسی باتیں...... اب مذہب صرف دو رہ گئے ہیں۔ ایک دوسروں کا خون چوسنے اور انھیں لوٹنے والوں کا مذہب اور دوسرا لٹنے والوں یا زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لئے ترسنے والوں کا مذہب......" سردار بدھ سنگھ ہڑبڑا کر چارپائی سے اٹھتا ہے تو تپائی کو دھکا لگنے سے لیمپ گر جاتا ہے اور غالیچے میں آگ لگ جاتی ہے۔ سیڑھیوں کا راستہ بند ہے، سامنے بساکھا سنگھ کھڑا ہے، تنی ہوئی گردن، چوڑے شانے...... دیکھتے ہی دیکھتے آگ پھیل جاتی ہے۔

ایک تعبیر یہ ہو سکتی ہے کہ بساکھا سنگھ اسی آرکی ٹائپ ہی کا ایک روپ ہے، جس کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا، اور نیکی کا ضامن ہے، لیکن یہاں معاملہ اول تو جوہری نیکی یا شرف کا نہیں، ریاکاری اور اس کے خلاف حق و انصاف کی طلب کا ہے، دوسرے یہاں مذہب کا وہ روپ ہے جو ناجائز دولت اور ہوس کے ساتھ غیر مقدس سمجھوتے میں ہے یعنی مذہب کا استحصالی پہلو جس کو مقتدر طبقہ دھوکا دہی اور ریاکاری کی ڈھال کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ بلونت سنگھ نے اس پہلو کی سنگینی کو جس ہنرمندی سے بے نقاب کیا ہے، اس سے بساکھا سنگھ مذہبی استحصال اور منافقت کے خلاف احتجاج کی للکار بن جاتا ہے۔ غرضیکہ بنیادی مسئلہ شرف نہیں بلکہ خود غرضی اور کمینگی ہے جو شرف کا رد ہے، لیکن یہ کمینگی بھی شرف ہی کی طرح انسانی سرشت کا حصہ ہے۔

اسی طرح 'پہلا پتھر' بھی انسانی فطرت کے گھناؤ اور پست پہلوؤں کو سامنے لانے کے اعتبار سے بے مثال کہانی ہے۔ بلونت سنگھ کے پورے افسانوی سرمایے میں اس نوع کی دوسری کہانی نہیں ہے۔ 'ویسلے ۳۸' کی اپنی اہمیت ہے، لیکن اس میں شاید ہی دو رائے ہو کہ 'پہلا پتھر' 'ویسلے ۳۸' سے بڑی کہانی ہے۔ تناظر یہاں بھی فسادات اور مذہب کا ہے، لیکن مسئلہ یہاں ہوس زر کا نہیں، جنسی ہوس کا ہے جو فطرتاً مردانگی کا حصہ ہے۔ اس سے یہ بھی کھلتا ہے کہ جبر فقط طبقاتی نوعیت نہیں رکھتا۔ جبر کے کئی چہرے ہیں۔ ان میں سے ایک چہرہ مردانگی کا بھی ہے جو معاشرتی طور پر عورت کے خلاف جبر کو ہمیشہ روا رکھا ہے۔ مذہب فقط آلہ کار ہے، وہی مذہب جس کو دوسرے فرقے کی عورتوں کی عصمت دری اور آبروریزی کا جواز بنایا جاتا ہے، لیکن خود اپنے فرقے میں مسئلہ ہوس کا ہو تو وہی مذہب بالکل بے معنی ہو جاتا ہے، اور استحصال کی نوعیت جوں کی توں رہتی ہے۔ ویسلے ۳۸ میں کردار صرف دو ہیں، جب کہ پہلا پتھر میں سردار ودھاوا سنگھ کی پرانی کشادہ حویلی میں پوری ایک دنیا آباد ہے۔ اس میں عظیم الجثہ سردار ودھاوا سنگھ کے علاوہ ان کی دو بھاری بھر کم سردارنیاں ہیں، فرنیچر ٹھوکنے اور لکڑی چھیلنے والے دل پھینک کاریگر ہیں، لیبل پرنٹنگ پریس کے کارکن ہیں، مغربی پنجاب سے اُجڑ کر آنے والے کچھ خاندان، اور ان کی جوان ہوتی ہوئی لڑکیاں ہیں، اور ان کے گرد منڈلانے والے دل پھینک نوجوان ہیں۔ مشاہدے کی باریکی، گھریلو فضا کی بازیافت، سکھ معمولات، اور مکالموں کی برجستگی یہاں بھی کمال پر ہے، علاوہ ازیں سکھ کاریگروں کی گفتگو میں جو ٹھکڑپن اور زندگی سے معمور شوخی اور شرارت ہے، اس سے پوری کہانی زندگی کے لمس سے تھرتھراتی رہتی ہے۔ کہانی میں تہ نشیں الم ناکی پیش نظر شوخی اور خوش وقتی کا یہ تناظر انجام کے قریب ایک گہری Irony کو راہ دیتا ہے جس سے کہانی کی معنویت گہری ہو جاتی ہے اور درد کی فضا میں وہ جبر آشکارا ہوتا ہے جو مرد کی کمینگی اور ہوس کا زائیدہ ہے اور جو مذہبوں فرقوں، اور اپنوں بیگانوں سب کے آر پار کارگر ہے۔

'پہلا پتھر' کے شروع میں انجیل کی اس روایت کا تناظر ہے جس میں ایک عورت بدکاری کرتی ہوئی پکڑی گئی ہے اور اس کا سنگسار کرنا مطلوب ہے۔ چنانچہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو، وہ اس کو پہلا پتھر مارے۔ سردار ودھاوا سنگھ کی پرانی حویلی میں جسے مذاق سے شاہی اصطبل کہا جاتا تھا، اور جس کے ایک حصے میں فرنیچر کا کارخانہ اور دوسری طرف لیبل چھاپنے کا پریس تھا، اس

میں آ کر بسنے والے رفوجیوں میں گھکی کا باپ دیوی داس بھی تھا۔ سردار جی نے حویلی کے بغل والی دکان اور مکان ترس کھا کر اس کو کرایے پر دے دیا تھا اور وہ پنساری کی دکان کرنے لگا تھا۔ اس کی تین بیٹیاں تھیں، گھکی سب سے خوبصورت اور بانکی تھی۔ موقعہ پا کر سب سے پہلے رندہ چلانے والے باج سنگھ نے اس کی چمی لی تھی، اس کے بعد دوسروں کے لیے بھی راستہ صاف ہو گیا تھا۔ سردار جی کے بیٹے، ان کے بیٹوں کے دوست اور کارندے وغیرہ سب ایک آدھ چمی کی تاک میں رہتے تھے۔ گھکی سے چھوٹی نکی تھی اور سب سے چھوٹی سانولی جو اندھی تھی۔ باج سنگھ جس کو اس کے چیلے چانٹے 'باج' کے نام سے پکارتے تھے، گھسر دم گھساڑ قسم کا آدمی تھا، "صورت گھناؤنی، ہونٹ موٹے، ایک آنکھ میں پھولا، نتھنوں سے بال نکلتے ہوئے۔" دس برس پہلے اس کی بیوی مر گئی تھی۔ گھکی نوک پلک اور خدوخال میں غضب تھی تو نکی اعضا کی متناسب بناوٹ، تناؤ اور تڑپ سے قیامت تھی۔ سانولی دونوں بہنوں سے کم گوری تھی، خدوخال گوارا لیکن عمر کے ساتھ ساتھ اس کے اعضا کی کشش بڑھ رہی تھی۔ ویسے تو کاریگر چھوٹی اور اور بڑی سردارنی سے مذاق کرنے میں بھی نہ چوکتے، لیکن تاک میں گھکی اور نکی کی رہتے۔ حویلی کی فضا چھیڑ چھاڑ اور دل لگی سے معمور رہتی:

"کنستر نلکے کے نیچے رکھ کر باج نے دستی کے دو چار ہاتھ ہی چلائے ہوں گے کہ سامنے سے نکی جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی اس کی جانب آئی اور آتے ہی بولی: "کنستر اٹھاؤ تو......"

باج کی خوشی کا بھلا کیا ٹھکانہ تھا۔ داتن چباتے چباتے اس کا منہ رک گیا۔ آنکھوں کے گوشے شرارت اور حرامزدگی کے باعث سمٹ گئے۔ "نی کڑیے کی گل اے۔"

"اے دیکھ گل ول کچھ نہیں۔ کنستر ہٹا جھٹ پٹ۔"

باج نے دانت پیس کر ہاتھ پھینکا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نکی پہلے ہی سے تیار تھی۔ جھپ سے پیچھے ہٹ کر بدن چرا گئی اور نیم معشوقانہ انداز سے چلا کر بولی۔ "ہم کیا کہہ رہے ہیں کنستر ہٹانا۔"

باج نے کنستر ہٹا دیا۔ "لو جانی پیو اور جیو۔ جیو اور پیو۔"

نکی نے نل کے نیچے ہاتھ رکھ دیا اور قدرے انتظار کے بعد انجن کی سیٹی کی سی آواز میں چلائی۔ "اے ہے...... دستی ہلاؤ۔"

باج نے صوفیانہ رمز کے ساتھ جواب دیا۔ "تم ہی ہلاؤ نا دستی......"

"دیکھو تنگ مت کرو۔"

"اری نام نکی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تو سچ مچ نکی (چھوٹی) ہے۔"

"چھوٹی نہیں تو کیا بڑی ہوں۔" نکی نے نچلا ہونٹ ڈھیلا چھوڑ کر شکایت آمیز نگاہ اس پر ڈالی۔

اب باج نے بڑی فراخ دلانہ ہنسی ہنس کر دستی ہلانا شروع کی۔

پانی پی کر نکی بھاگنے لگی تو باج نے فوراً اس کی کلائی دبوچ کر ہلکا سا مروڑ دے دیا۔

"اوئی"

"کیا ہے؟"

"میری کلائی ٹوٹ جائے گی۔"

"یہاں دل جو ٹوٹا پڑا ہے۔"

"چھوڑ نا! کوئی دیکھ لے گا۔"

سردار جی کے یہاں ان کے ایک ہندو دوست اپنے بال بچوں سمیت آکر ٹھہرے۔ ان کا ایک نوجوان لڑکا تھا چمن، گھکی اور وہ ایک دوسرے پر مرنے لگے۔ راز و نیاز اس حد تک بڑھا کہ گھکی حاملہ ہو گئی۔ گھکی نے جب شادی پر زور دیا تو وہ فوج میں بھرتی ہونے کے بہانے غائب ہو گیا، اور گھکی اس کو چٹھیاں لکھتی رہ گئی۔ راز کھلا تو بڑے سردار جی نے دیوی داس کو پھٹکارا، تمہاری بیٹی کی یہ ہمت، فوراً شادی کر دو ورنہ مکان دکان دونوں سے خارج۔ غرض گھکی کو گھن لگ گیا۔ وہ جو نازک اور شگفتہ پھول کی مانند تھی، ہڈیوں کا ڈھانچ رہ گئی۔ نکی اب حویلی کی جان تھی۔ اس کا سلسلہ پریس میں لیبل چھاپنے والے جل ککڑ سے تھا جو شادی شدہ تھا۔ پھر دفعتاً نکی غائب ہو گئی۔ بڑی بہن کا انجام وہ دیکھ چکی تھی، شاید اس نے کوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ سب سے چھوٹی سانولی پر جو اندھی تھی، کلدیپ فریفتہ ہوا جو امتحان دینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ ایک رات اچانک سانولی کارخانے میں اکیلی داخل ہوئی۔ بلونت سنگھ نے اس منظر کو جیسے بیان کیا ہے دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے:

چراغ کی تھرتھراتی ہوئی لو کی مدھم روشنی میں ایک لڑکی اندر داخل ہوئی سانولی!!

باج دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

حاضرین میں سے سب کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ سانولی کو دیکھ کر قریب تھا کہ ان کے منہ سے بے اختیار مختلف آوازیں نکل جائیں۔ لیکن باج کے اشارے پر وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔

سانولی اور آگے بڑھی۔ اس کا گول گول چہرہ نوخیز جوانی کی حدت سے تمتمائے ہوئے چہرے کی جلد، قدرے موٹے اور بھرپور ہونٹ، چکنے گال...... ان سب چیزوں کے حسن کو پہلے کبھی کسی نے قابلِ توجہ نہیں سمجھا تھا۔ ان سب دِل لیوا خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر شیر خوار بچے کا سا بھولپن ہویدا تھا۔

لیکن اتنی گئی رات کو وہ وہاں کیا کرنے آئی تھی؟

سانولی نے ہاتھ پھیلا کر اس اونچی اور بھاری بھرکم میز کا سہارا لیا جس پر باج فرنیچر بناتے وقت مختلف حصوں پر رندہ کیا کرتا تھا۔ لڑکی نے منہ کھولا اور سرگوشی میں بولی: "باج چاچا!"

"ہاں۔" باج نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

سانولی نے گردن اِدھر اُدھر گھما کر کوئی اور آواز سننے کی ناکام کوشش کی۔ پھر اس نے رازدارانہ لہجے میں دریافت کیا "تم اکیلے ہو؟"۔

یہ سن کر سب نے گردنیں آگے کو بڑھائیں۔ ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ باج نے آواز کا لہجہ بدلے بغیر جواب دیا۔

"ہاں سانولی! میں اکیلا ہوں۔"

"کہاں ہو؟" یہ کہہ کر وہ بازو پھیلا کر ہاتھ ہلاتی ہوئی آگے بڑھی۔ پھر اس نے اسے چھو لیا۔

"سانولی! تم اس بخت یہاں کیوں آئی ہو؟"

"کیوں اس وخت کیا ہے؟"

"اس بخت رات ہے تم...... تم جوان ہو...... کریب کریب۔"

"میرے لیے رات اور دن ایک برابر ہیں۔"

"لیکن اس بخت رات سے گیارہ بج چکے ہیں......اور پھر تم اکیلی ہو۔"

یہ سن کر سانولی کے صاف ستھرے چہرے پر اذیت کے آثار پیدا ہوئے وہ حیران ہو کر بولی۔

"پر باج چاچا! بھلا تمہارے پاس آنے میں کیا برائی ہو سکتی ہے۔ تم تو دیوتا ہو......"

باج ٹھٹک کر پیچھے ہٹا۔

"تم نہیں جانتے چاچا۔" سانولی نے پھر کہنا شروع کیا۔ "جب کبھی لالہ (باپ) مجھے گسے ہوتا ہے تو میں سوچتی ہوں کہ کوئی بات نہیں میرا باج چاچا جو ہے۔ وہ مجھے لالہ سے کم پیار تو نہیں کرتا...... ٹھیک ہے نا۔"

باج بولا۔ "ہاں سانولی! یہ سچ ہے...... لیکن......اس بخت تم جاؤ۔"

"نہیں، نہیں چاچا میں تم سے باتیں کرنے آئی ہوں۔"

سب دم بخود۔

"کیا باتیں کرنا چاہتی ہو؟"

"باج چاچا!" اب سانولی کی آواز بدل گئی۔ اس نے توقف کیا اور پھر بولی۔ "باج چاچا!...... کلدیپ بابو بہت اچھے ہیں...... وہ کہتے تھے کہ میری آنکھیں ٹھیک ہو سکتی ہیں۔ میں جنم کی اندھی نہیں ہوں نا! اس لیے......اور......وہ...... کہتے تھے کہ تم سے بیاہ......بیاہ کروں گا۔"

اس پر باج نے اپنی داڑھی کو مضبوطی سے مٹھی میں پکڑ لیا۔ "کون کلدیپ؟"

"وہ جو نئے آئے تھے، وہی ناں!"

"کیا کہتا تھا وہ......"

"وہ کہتے تھے۔ سانولی! تم مجھے بڑی پیاری لگتی ہو۔ میں کہتی میں اندھی ہوں، بھلا اندھی لڑکیاں بھی کسی کو پیاری لگتی ہیں۔ وہ کہتے باؤلی! پیار کیا نہیں جاتا، ہو جاتا ہے...... پر چاچا! ان کو گئے پندرہ دن ہو چکے ہیں۔ لوٹ کے نہیں آئے...... اور......اور......"

یہ کہتے کہتے سانولی نے اپنی بے نور آنکھوں کو اور پھیلایا جیسے کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو اور پھر جھینپ کر بولی: ''......اور میرا پاؤں بھی بھاری ہے......''

باج نے دفعتہً کھل جانے والے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

''لالہ بہت دُکھی ہے۔ وہ کہتا ہے گھکی اور نکی دونوں کھراب ہیں۔ سچ باج چاچا۔ لالہ بے حد دُکھی ہے۔ وہ رات رات بھر روتا رہتا ہے...... مجھے گلے سے لگا کر کہتا ہے۔ یہ میری رانی بٹیا ہے۔ اسے پاپ چھو کر بھی نہیں گیا...... لیکن اسے نہیں ملوم کہ میرا پاؤں بھی...... میں سوچتی ہوں کہ اگر کلدیپ بابو نہ آئے تو...... لالہ کو معلوم ہو جائے گا وہ مر جائے گا۔ ایک دم مر جائے گا...... لیکن وہ جرور آئیں گے...... ہیں نا! چاچا! وہ آئیں گے نا؟''

سب لوگ دم سادھے بیٹھے رہے۔''

سب سناٹے میں آ جاتے ہیں، کئی دن گزر جاتے ہیں:

''پنجاب برباد ہو رہا تھا...... وارث شاہ کا پنجاب، گندم کے سنہرے خوشوں والا پنجاب، شہد بھرے گیتوں والا پنجاب، ہیر کا پنجاب، کونجوں اور رہٹوں والا پنجاب!! اور اس کی ایک بے نور آنکھوں والی حقیر بیٹی بھی برباد ہو رہی تھی۔'' اچانک ایک رات سانولی پھر کارخانے میں آتی ہے، روکھے بکھرے ہوئے بال، بازو پھیلے ہوئے، اعضا میں لرزش۔ ''باج چاچا! باج چاچا! وہ آ گئے وہ آ گئے...... وہ کہتے ہیں، سانولی مجھے ماپھ کر دو۔ ہم کوئی امیر نہیں ہیں، لیکن ہم تمھیں دلی لے جائیں گے...... تمھاری آنکھیں بھی ٹھیک ہو جائیں گی۔'' سب دم بخود رہ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب کاریگروں کا ٹولہ باہر نکلتا ہے تو انھیں دیوار کے ساتھ ایک مٹیالا بت سا نظر آتا ہے۔ ''سانولی! تم ابھی گھر نہیں گئیں۔'' ''باج چاچا نہ جانے میرے دل کو کیا ہو گیا ہے۔ کچھ سوجھتا ہی نہیں...... ایسی خوشی کی بات کیسے ہو سکتی ہے، تمھیں یقین نہیں آتا نا؟''

اس دلدوز منظر کے ساتھ کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ سانولی کی بے نور آنکھوں میں لرزتے ہوئے آنسو کی طرح ایک ایسا سوال چھوڑ کر جس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ سانولی کا

دماغ چل گیا یا اس نے کوئی خواب دیکھا یا کسی نے بے ماں کی اس بے سہارا لڑکی کے ساتھ کوئی بھیانک مذاق کیا۔ یہاں ایک انتہائی تلخ اور دردناک صورت حال کو بلونت سنگھ نے کمال چابکدستی کے ساتھ متشکل کیا ہے۔ اس الم ناک استفہامیہ کی شاید ہی کوئی دوسری مثال بلونت سنگھ کے پورے افسانوی ادب میں ہو۔ وہی باج جو چھیڑ چھاڑ میں سب سے آگے تھا، وہی باج بے نور آنکھوں والی سانولی کا ہمدرد اور غم گسار بن کر ابھرتا ہے جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ اپنا دکھ رو سکتی ہے۔ لکڑی کا کام کرنے والوں کے اجڈپن کی فضا میں مرد کی ہوس ناکی اور عورت کی ظلم رسیدگی کا یہ ایسا مرقع ہے کہ بلونت سنگھ کے قلم کی معجز کاری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ 'پہلا پتھر' کے تینوں نام نہاد عاشق انسانی شرف کے نہیں بلکہ انسانی فطرت کی رذالت اور کمینگی کے مظہر ہیں۔ یہ سکہ کا دوسرا رخ ہے، جہاں انسان خود انسانی معصیت کو اپنی معصومیت سے داغدار کر دیتا ہے اور اس میں ہم مذہب یا غیر مذہب کی کوئی قید نہیں۔

ابھی اس شق میں دو اور شاہکار کہانیوں کی گفتگو مزید باقی ہے، 'دیش بھگت' اور 'کالی تتری'۔ کہانیوں کے بارے میں رائے تو دو جملوں میں بھی دی جا سکتی ہے لیکن اگر ان کی معنویت اور فنکاری یعنی جمالیاتی لطف اندوزی کا ذکر کرنا ہو تو پھر ان میں داخل ہونا ضروری ہے۔ 'دیش بھگت' بھی اپنے انداز کی واحد کہانی ہے۔ جس طرح 'پہلا پتھر' میں مزاح کی تہ نشیں لہر تھی، 'دیش بھگت' میں سارا ادبی پیرایہ طنز کا ہے جس کا پورا راز انجام میں جا کر کھلتا ہے۔ بلونت سنگھ سیاسی افسانہ نگار نہیں تھے، لیکن سوچ اور نقطہ نظر ضرور رکھتے تھے، 'ویسیلے ۳۸' اور 'پہلا پتھر' دونوں ہی سے ان کے نقطہ نظر کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ اظہار 'دیش بھگت' میں اور بھی تیکھا ہے جو اسے کسی حد تک سیاسی کہانی کا رنگ دے دیتا ہے۔ آئیڈیولوجی جو کتابوں میں لکھی ہوئی ہے، وہ آئیڈیولوجی محض ہے، آئیڈیولوجی تو ہمارے بولنے اور سوچنے اور عمل کی ترجیحات میں بھی لکھی ہوئی ہے۔ چنانچہ فکشن میں آئیڈیولوجی کی جگہ وعظ و تلقین یا بھاشن یا بیانات میں نہیں، یہ کرداروں اور سچویشن اور کرداروں کے برتاؤ میں در آتی ہے۔ ایسا ہی 'دیش بھگت' میں ہوا ہے۔ بلونت سنگھ نے براہ راست کچھ بھی نہیں کہا۔ ایک بھرپور بیانیہ جو گندی بستیوں میں رہنے والوں کی سماجی نفسیات پر بھی ہے اور تحریک آزادی پر بھی۔ یعنی ایک طرف گرے پڑے لوگوں پر جو سماج کے Outcast یا حاشیائی کردار ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ ان کھدر پوش اور ٹوپی بردار نام نہاد سیاست والوں پر استحصال جن کا شیوہ ہے۔ یہ ساری

سچویشن گہرے مشاہدے اور جزئیات سے وضع کیے ہوئے نہایت موثر بیانیہ میں طنز کی تہ نشیں لہر کے ساتھ جاری رہتی ہے حتیٰ کہ انجام تک پہنچتے پہنچتے راز بے نقاب ہو جاتا ہے اور کرداروں کی ریا کارانہ اصلیت اور پست ذہنیت سامنے آجاتی ہے...... ٹیکنیک میں ایک خوبی یہ ہے کہ بیانیہ مسلسل نہیں ہے۔ آخری منظر میں گویا برش کی دو تین ہلکی گہری لکیریں سی ہیں، جن سے تاثیر بڑھ گئی ہے اور طنز کٹیلا ہو گیا ہے۔

بلونت سنگھ کا افسانوی فن غائب راوی کا فن ہے، لیکن 'دیش بھگت' حاضر راوی کی کہانی ہے۔ افسانہ نگار نے اس کا خیال رکھا ہے کہ راوی فقط سچویشن بیان کرتا ہے تبصرہ نہیں کرتا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ حاضر راوی خود افسانہ نگار ہو لیکن یہاں بلونت سنگھ نے تطبیق خود سے کی ہے، مرکزی کردار ایک ادھیڑ عمر کے سردار جی ہیں، جن کو 'چچا' کہا ہے "میری ان سے کوئی رشتہ داری نہ تھی۔ بس ہمارے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ والد سے بھی کچھ دعا سلام تھی۔ مجھ پر مہربان تھے اور قدرے بے تکلف بھی۔ میانہ قد، گندمی رنگ، کھچڑی داڑھی، دبلے پتلے مگر سخت ہڈی کے تقریباً ۴۵ سالہ بزرگ۔ اپنا تعارف یوں کرایا ہے "میری عمر تقریباً بائیس برس کی تھی، قد ذرا نکلتا ہوا، چوڑا سینہ، سڈول بازو، مضبوط ہاتھ پاؤں، باوجود چار مرتبہ کوشش کرنے کے ایف اے پاس نہ کر پایا تھا۔" "ایک شام چچا اچانک آئے اور بغیر تمہید کے بولے "آج ذرا خاص کام ہے، تم کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" "خاص کام" کے لفظ سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے سرہانے سے صفاجنگ (سکھوں کا ایک کلہاڑی نما ہتھیار) اٹھائی اور اسے فرش پر ٹیک اٹھ کھڑا ہوا۔" "مسلمانوں کا محلّہ ہے...... میاں لوگوں کا......اور پھر روپے کا معاملہ......" یہ چچا کا ایک فرسودہ اور پرانا حیلہ تھا۔ راوی بتانا چاہتا ہے کہ اس طرح کی مہم پر چچا اکثر جایا کرتے تھے۔

یہاں بلونت سنگھ نے جو منظر کاری اور فضا سازی کی ہے، اس سے آزادی سے پہلے کا الہ آباد جیتا جاگتا اور سانس لیتا معلوم ہوتا ہے۔

"غبار اور دھندے کے گہرے کفن نے شہر کو ڈھانپ رکھا تھا، بازاروں میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یکہ والوں کے آوازے ان کی گالیاں اور قوالیاں...... دور دھندلکے میں مسجد کے قریب، کسی گھر کی چھت پر سفید سفید کبوتروں کی ٹکڑیاں ہوا میں پرواز کرتی دکھائی دے رہی تھیں۔

نکڑ پر بادشاہ خاں پٹھان کی چائے کی دکان تھی، اس جگہ سود خوار پٹھانوں کا اجتماع ہوتا تھا، بیٹھے چائے پیتے یا قہوہ اڑاتے۔

کچھ دور جانے کے بعد چچا مہکی پنواڑن کا دکان کے آگے جاکر رک گئے۔ مہکی کی عمر بتیس برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ بدن کی بھاری، گورا رنگ، ناز و ادا کی کمی نہ تھی، بڑی بڑی آنکھوں میں بے تحاشہ کاجل، ہونٹوں پر مسی کی دھڑی۔

مہکی سر پر آنچل کھینچ سنبھل کر بیٹھی اور پان لگاتے ہوئے کہنے لگی۔ "اور وہ ہمرے لیے چندری لان کو کہت رہے۔"

چچا سنی ان سنی کر کے اس کے لال لال گالوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے تاکتے ہوئے بولے "اب لاوٴ۔ دیو گی بھی نہیں!"

مہکی کچھ لجا گئی اور ملامت آمیز نظروں سے چچا کی طرف دیکھنے لگی۔"

بیانیہ اسی طرح جاری رہتا ہے جس سے کہانی کی معنیاتی فضا اور موڈ قائم ہو جاتا ہے۔ کئی گلیوں محلوں سے گزرنے کے بعد آخر کار چچا ایک ٹوٹے پھوٹے گھر کے آگے رکے۔ باوجود سردی کے مجید ایک میلا کچیلا تہمد کمر سے لپیٹے تھا اور جسم پر صرف ایک چادر تھی۔ "آیئے آیئے آکا! اندر چلے آیئے۔" ٹاٹ کا گلا سڑا پردہ اٹھا کر دونوں اندر داخل ہو گئے۔

مجیدے اور چچا میں کانا پھوسی ہوتی ہے، مجیدا کہتا ہے۔ "کسم اللہ پاک کی پنجابی بابو جدھر حکم ہو لے آوٴں۔" تھوڑی دیر میں مجیدا لڑکی کو لے کر آتا ہے عمر بمشکل تیرہ چودہ برس کی، گندمی رنگ، بڑی بڑی زرد آنکھیں، بال خشک، ہاتھوں اور کلائیوں پر میل، دبلی پتلی سہمی ہوئی ایک میلی سی چادر اوڑھے کھڑی تھی۔ مجید اوضاحت کرتا ہے "روج پوجا کرن جات رہی...... میں نے سمجھایا پگلی پوجا سے کا ملی؟ چل پنجابی سنگ سادی کرا دوں گا۔ گہنا کپڑا پہن مجا اڑانا...... لونڈیا کا ہے، ہیرا سمجھو۔" لڑکی نے زرد زرد آنکھوں سے مجیدے کی طرف دیکھا اور لمبی سسکی بھر کر خاموش ہو گئی۔ "ابھی جھینپتی ہے۔"

چچا ایک بھوجنالیہ میں اوپر کی منزل پر ایک کمرے میں رہتے تھے۔ تین چار دن کے بعد راوی کا ادھر سے گزر ہوتا ہے۔ اندر سے باتوں کی بھنک سنائی دے رہی تھی۔ دراز میں سے جھانکتا ہے تو وہی لڑکی دکھائی دیتی ہے۔ چچا اس کے منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ مجیدا آگے جھک کر کہہ رہا تھا "دیکھو بوت حرمجدگی کرے گی تو کاٹ پھینک دوں گا"۔ لڑکی انتہائی کرب کے عالم میں تھی...... پھر

پلنگ پر پٹخنے کی آواز آتی ہے......

اس کے بعد

"مجیدا نہایت اطمینان کے ساتھ گورونانک صاحب کی تصویر کے پاس کھڑا بیڑی پی رہا تھا اور تصویر کو احترام کی نظروں سے دیکھنے میں مگن تھا۔" ایک دو دنوں کے بعد آخری منظر ہے جہاں کہانی معراج کو پہنچتی ہے۔ اتوار کی چھٹی ہے، راوی اسٹیشن کے بک اسٹال سے رسالہ وغیرہ خریدنے کو نکلتا ہے جو گھر کے پاس ہے۔ اسٹیشن پر اس قدر بھیڑ ہے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں، لوگ نعرے لگا رہے ہیں۔ "جواہر لال کی جے...... مہاتما گاندھی کی جے...... بھارت ماتا کی جے!!!" جب جواہر لال جی بگھی پر آکر بیٹھ جاتے ہیں اور عقیدت مند ہاتھ جوڑے آگے بڑھتے ہیں تو معاً 'چچا' ہاتھ میں گیندے کا ہار لیے بھیڑ سے نمودار ہوتا ہے، اور متعدد بار پرنام کرنے کے بعد ہار پنڈت جی کے گلے میں ڈال دیتا ہے۔ مجید خان بھی کھدر کا کرتا پہنے کانگرسی رضاکار کی حیثیت سے ادھر سے ادھر دوڑتا پھر رہا ہے۔ لوگ حب قومی کے جوش میں زور زور سے گا رہے ہیں: "جھنڈا اونچا رہے ہمارا......" 'چچا' کی آواز سب سے بلند ہے۔ جب جلوس مجیدے کے محلے کے پاس سے گزرتا ہے تو سڑک کے کنارے بھیڑ میں وہی میلی کچیلی لڑکی دکھائی دیتی ہے، وہی گرد آلود بال اور سہمی ہوئی زرد صورت! وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جھنڈا اونچا رکھنے والوں کو دیکھ رہی ہے!

گویا شرف انسانی کی شکست کا جو منظر 'ویسلے ۴۸' میں ایک بیج ہے، اور 'پہلا پتھر' میں پیڑ بن کے ابھرتا ہے، 'دیش بھگت' میں سیاسی ابعاد کے ساتھ کھل کر سامنے آتا ہے۔ مذہبی ریاکاری یہاں بھی ہے یعنی استحصال جو معاشی بھی ہے اور جنسی بھی، مذہبوں، فرقوں اور طبقوں کے آرپار چلتا ہے۔ اس کا گھناؤنا گٹھ جوڑ مذہب سے بھی ہے اور سیاست سے بھی۔ مذہب ہو کہ سیاست دونوں سماج کے طاقتور مقتدرے ہیں اور چونکہ طاقت کو تقدس حاصل ہے، ان کی آڑ میں کمزور اور بے سہارا انسان کے شکار کا کھیل جاری رہتا ہے۔ میلی کچیلی لڑکی اور مجیدا دونوں معاشرے کے حاشیائی کردار ہیں جو پنجابی بابو کے ہاتھ میں کٹھ پتلیوں کی طرح ہیں...... "سرکار گلام حاجر ہے۔ کھدا قسم جسن کرادوں گا جسن۔" یہ کہانی آزادی سے کچھ ہی پہلے کی ہے۔ بعد کو کیا کچھ نہیں ہوا۔ فنکار کی پہچان اسی سے ہوتی ہے کہ کبھی کبھی اس کی آنکھیں آنے والے واقعات کی جھلک برسوں پہلے دیکھ لیتی ہیں۔

'کالی تتری' کے ساتھ ہم ایک بار پھر پنجاب میں داخل ہوتے ہیں، وہی گاؤں، قصبات اور کھلے کھیت کھلیان، وہی گلیاں محلے کچے پکے مکان شریہنہ کی چھاؤں اور بہادر سکھ سردار۔ بلونت سنگھ کی سائیکی میں یہ سارا امیج اور مردانگی کا آرکی نقش جس طرح پیوست تھا، عین ممکن ہے کہ 'کالی تتری' بھی رومان کے اسی قالب میں لکھی گئی ہو، لیکن جیسے کہ ہم دیکھیں گے اس سے معنویت دوسری بر آمد ہوتی ہے۔ بگا سنگھ بھنبھوڑی اور کپورا سنگھ ٹھٹھے والا دونوں نہایت سرکش اور جری جوان ہیں، مضبوط گھوڑیوں پر سوار، جگا ڈاکو کے رومانی ہیرو۔ لیکن کہانی کا متن کچھ اور چغلی کھاتا ہے۔ ہر چند کہ یہ مردانگی اور بہادری کے پیکر ہیں، لیکن یہاں مردانگی کو کسی خیر، نیکی، محبت، یا ارفع جذبے سے کچھ لینا دینا نہیں۔ یہ مردانگی، مردانگی محض ہے، اور خود اپنی تیغ اصیل کی شکار! دوسرے لفظوں میں رومان کی فضا رکھتے ہوئے بھی یہ کہانی شکستِ رومان کی معنویت کو راہ دیتی ہے۔ اس کا جمالیاتی اثر اس کی فضا سازی میں تو ہے ہی، اس المیے میں بھی ہے جس پر یہ منتج ہوتی ہے۔

'کالی تتری' پیراں دا ٹھٹھہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ڈاکہ اور ڈاکے کی منصوبہ بندی کی کہانی ہے۔ ڈاکے سے پہلے ایک واقعہ ہے جو اتنا ہی بہیمانہ اور پر تشدد ہے۔ پیراں دا ٹھٹھہ میں ایک ہی بندوق ہے جو یہاں کے کھاتے پیتے گھرانے "ماہنہ" والوں کے پاس ہے۔ ایک سازش کے تحت ڈاکو بگا سنگھ بھنبھوڑی کے آدمی ٹھٹھہ کے مولا سے مل کر رات کے اندھیرے میں ماہنہ کے کھیتوں میں مولا کے بیل کو ہنکا کر اس کو گالی مار کر ہلاک کر دیتے ہیں۔ اگلے دن جھوٹی رپٹ درج کرادی جاتی ہے کہ ماہنہ والوں نے غریب مولا کا بیل مار ڈالا ہے۔ پولیس گاؤں آکر رام لال ماہنہ اور اس کے بیٹے ہیرا لال کو طلب کرتی ہے۔ جب نوجوان بیٹا جو پڑھا لکھا بھی ہے، اس جھوٹے الزام پر اعتراض کرتا ہے تو الٹے اس کی پٹائی کی جاتی ہے۔ مقصد ماہنہ والوں کی بندوق ضبط کروانا تھا، سو بندوق تو ضبط کر ہی لی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ پولیس ماہنہ کے لڑکے کو بھی ساتھ لے جاتی ہے۔ لڑکے کو بچانے کی خاطر ماہنہ اقبالِ جرم کر لیتا ہے کہ بیل کو گولی اس نے ماری ہے، لیکن پولیس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مولا اور اس کے ساتھی خوش ہیں کہ دعائیں کرنے والی چڑیا پنجرے میں بند ہو گئی ہے اور اب ڈاکہ زنی کے لیے فضا صاف ہے۔

کپورا سنگھ ٹھٹھے والا خونخوار ڈاکو تھا۔ جو اپنی کالی گھوڑی کی وجہ سے گرد و نواح میں کالا تتر کے نام سے مشہور تھا۔ ہفتہ بھر پہلے وہ چوری چھپے اپنی بہن سے ملنے کے لیے آیا اور یہ معلوم کر کے کہ

سسرال سے لائے ہوئے زیورات وہ کہاں پر رکھتی ہے، راتوں رات لوٹ گیا تھا، کالی گھوڑی پر کالا بھجنگ کپورا چٹان کی طرح لگتا تھا۔ بگا سنگھ بھنبھوڑی، کپورا سنگھ ٹھٹھہ اور ان کے ساتھیوں نے مولا اور اس کے آدمیوں کی مدد سے ڈاکہ ڈالنے کا منصوبہ بنایا۔ اتفاق سے اُس رات سخت آندھی آئی اور پیر کے ٹھٹھے پر گہری تاریکی چھا گئی۔ بگا تاڑ کی طرح لمبا تھا، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں وحشی جانور کی سی چمک اور تجسس! ماہنہ والوں کا مکان گاؤں کے بیچوں بیچ تھا، منصوبہ زیوروں پر ہاتھ صاف کرنے، اور ماہنہ والوں کو اور پاس پڑوس کے دو تین گھروں کو لوٹ کر سلامت نکل آنے کا تھا۔ ہرنا کے پر ساتھیوں کو تعینات کر دیا گیا، جیالے چھتوں پر کود گئے اور کارروائی شروع ہو گئی۔ آندھی بھی زوروں پر تھی۔ کپورے نے ایک جوان کو دونالی سمیت گھر کے پچھواڑے پیڑوں کے جھنڈ کے پاس ناک میں رہنے کے لیے کھڑا کیا۔ باقی لوگ اندر سامان سمیٹ رہے تھے کہ باہر سے دھائیں دھائیں گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ اچانک بھگدڑ مچ گئی۔ مکان کے پچھواڑے جس نوجوان کی ڈیوٹی تھی، پیڑوں میں کھڑ کھڑاہٹ ہونے کی وجہ سے گھبرا کر اس نے پے در پے گولیاں داغ دیں۔ پورا گاؤں جاگ اٹھا۔ ڈاکو بھاگ کھڑے ہوئے۔ کنوئیں تک پہنچے تو اندھا دھند لاٹھیاں برسنے لگیں۔ عین اس وقت بجلی چمکی، اور کپورے کی کالی گھوڑی کو پہچان کر کسی نے زور سے کہا 'کالا تتر' اور گھوڑی کی لگام پر جھپٹا مارا۔ گھوڑی ہنہنا کر پچھلے پاؤں پر اچھلی۔ سوار نے اپنی لمبی دستے والی کلہاڑی اوپر اٹھائی ہی تھی کہ ایک چھوئی چمکی اور کپورے کی آنتیں ادھیڑتی ہوئی نکل گئی۔ کپورا بل کھا کر اوندھے منہ زمین پر گرا۔ پیٹ سے خون کا فوارا چھوٹا اور گاڑھا سرخ خون زمین پر بہنے لگا۔

اس کی ایک توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ کارخانہ قدرت نیکی کے قانون پر قائم ہے۔ بالادستی نیکی اور خیر ہی کو حاصل ہے۔ چنانچہ کپورا کیفر کردار کو پہنچتا ہے، اور یہ منطق رومان کی ہے۔ لیکن کہانی کے متن کے تجزیے سے یہ منطق شکست ہو جاتی ہے، کہانی میں ڈاکہ زنی کی جو جزئیات ہیں، کپورا سنگھ، بگا سنگھ، سوداگرا اور دوسرے ڈاکوؤں کی مردانگی اور بہادری کا جو بیان ہے اس سے ڈاکے کے ارتکاب کی نفسیات گویا تقدس کے ہالے میں آ جاتی ہے اور نیک و بد کی تفریق معدوم ہو جاتی ہے۔ یہ مردانگی، مردانگی محض ہے جو شرف سے نہیں بہیمیت سے عبارت ہے، جو خود اپنے آپ کو نگل جاتی ہے اور بالآخر اپنے ہی ہاتھوں اپنی شکست کو پہنچتی ہے۔

جیسے کہ ہم نے دیکھا اس شق کی کہانیوں میں رومان نہیں شکست رومان کا منظر ہے۔ ان میں

آدرشوں کا تصادم اور کشاکش ہے، اور ان آدرشوں کو پامال کیا جاتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کی کجی، کمینگی، پستی اور بہیمیت کی کہانیاں ہیں جن میں الم ناکی اور درد و تباہی و استحصال کا پہلو نمایاں ہے۔ 'وہ پہلے ۳۸' میں سردار بدھ سنگھ مذہبی ریاکاری کی آڑ میں کسبِ زر کرتا ہے۔ 'پہلا پتھر' میں چمن، جل ککڑ، کلدیپ سب منفی کردار ہیں اور جنسی استحصال کے عامل ہیں۔ 'دیش بھگت' میں چچا، مرکب ریاکار ہے، مذہبی ریاکار بھی، جنسی ریاکار بھی اور سیاسی ریاکار بھی۔ 'کالی تتری' میں بگا سنگھ، کیورا سنگھ، سوداگرا اور ان کے تمام ساتھی انسانی شرف کے نہیں، اس کے دوسرے رُخ کے مظہر ہیں۔ غرضیکہ بلونت سنگھ کی اس نوع کی کہانیوں میں انسانی فطرت کا گھناؤنا پہلو زیادہ ابھرتا ہے اور درد اور دکھ کی ٹیس ہے۔ ماہرانہ کردار تراشی، فضا سازی اور مکالموں کی برجستگی سے جو مضبوط بیانیہ متشکل ہوا ہے، اس میں گہری دردناکی، اور اثر پذیری ہے جس کے جمالیاتی ترفع سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

(۴)

اس آخری یعنی چوتھی شق میں ان کہانیوں کو شامل کیا گیا ہے جو شہری زندگی سے متعلق ہیں۔ یہ عام چھوٹے موٹے انسانوں کی کہانیاں ہیں جو بلونت سنگھ کی فنکاری کی ایک جہت ہونے کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں آر کی نقش یا دیو قامت انسانوں والی کوئی بات نہیں، نہ ہی اعیان و اقدار کی عظمت یا ان کی شکست کا منظر ہے۔ البتہ سیدھے سادے انسانوں میں کچھ خصائص یا کوئی پہلو ایسا دکھایا گیا ہے کہ ان کی عمومیت خصوصیت میں بدل گئی ہے۔ شق چار کی بحث کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے حصے میں ان کہانیوں کا ذکر ہے جن میں شہری زندگی کے سامنے کے کردار ہیں جن میں کوئی نہ کوئی خاص نکتہ ہے۔ دوسرے حصے میں ان کہانیوں کو لیا گیا ہے جن کا موضوع خواہ کچھ ہو، ان کے بین السطور سے کھلتا ہے کہ ان کا حاوی محرک جنسی جذبہ ہے۔ واضح رہے کہ بظاہر یہ عام انسانوں کی کہانیاں ہیں لیکن عام کہانیاں نہیں۔ ان میں سے بعض کا شمار بلونت سنگھ کی بہترین کہانیوں کے ساتھ کیا جاسکتا ہے، اور وجہ ان کا ہنر مندانہ بیانیہ ہے، جس نے روزمرہ کے کرداروں اور واقعات میں زندہ رہنے والی کوئی نہ کوئی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

'گمراہ' بارہ تیرہ برس کے لڑکے کی کہانی ہے جو اکثر کلاس سے غائب ہو جاتا ہے۔ اس کا ٹیچر باپ سے شکایت کرتا ہے کہ تمہارا بیٹا "گم راہ" ہو رہا ہے۔ فکر مند باپ اگلے دن چپکے چپکے بیٹے کا

تعاقب کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ بیٹا بازی گروں اور نٹوں کا تماشا دیکھنے کے بعد سپیروں کا کھیل دیکھتا ہے، پھر پہاڑی ندی پار کر کے کیکڑوں کے شکار کا مزہ لیتے ہوئے چائے کے باغات میں جانکلتا ہے جہاں سے آگے برف پوش چوٹیوں کا نیلگوں غبار چھایا ہوا ہے۔ باپ کو محسوس ہوتا ہے کہ دفتری معمولات اور کاروباری زندگی میں گھرے ہونے کی وجہ سے زندگی اور اس کی جس زندہ فطری رو سے وہ کٹ چکا تھا، زندگی کی وہ حرارت بیٹے کی پور پور میں تھی۔ وہ سوچتا ہے کہ فطرت سے بیگانہ ہو کر گمراہ وہ خود ہے یا بیٹا۔ اس کے اندر خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش کسی دن پھر دفتر سے بھاگ کر ساری دنیا کو ٹھینگا دکھا کر وہ بھی آوارہ گردی کرے۔ زندگی کی روٹین یا یکسانیت یا کاروباری بھاگ دوڑ میں فطرت یا زندگی کے لطف و مسرت سے ہمارا جو رشتہ ٹوٹ جاتا ہے یا ہمارے حواس اس معصومیت یا نشاط کے تئیں جس طرح سے کند ہو جاتے ہیں، یہ کہانی اس معنویت کو نہایت چابکدستی سے ابھارتی ہے۔ اس کہانی میں فطرت کے حسن کا جو بیان ہوا ہے اس سے کہانی کی معنویت قائم کرنے میں بہت مدد ملی ہے۔

'نہال چند' بھی مزے کی کہانی ہے جس میں نہال چند کی موہنی اور بے ریا شخصیت دل کو جیت لیتی ہے، اور اس کی زندہ دلی اور شوخی قاری کے دل میں کھب جاتی ہے۔ نہال چند پچاس پچپن برس کا گڈا سا خوش مزاج شخص ہے، یوگ راج بیس بائیس برس کا جوان۔ جب یوگ راج کی پرانی کتابوں کی دکان ناکام ہو جاتی ہے اور کوئی دوسرا کام جم نہیں پاتا تو وہ اپنے پرانے واقف کار نہال چند کے پاس پہنچتا ہے، جس کا فوٹوگرافی کی دکان تھی۔ نہال چند ہنسی مذاق کا دلدادہ تھا، لمبی لمبی مونچھیں، چمکتی ہوئی آنکھیں، اکہرا بدن، چھوٹا سا قد، کھانے پینے اور گپ شپ ہانکنے کا شوقین، بات بات پر لا استاد رہا تھ۔ لیکن تنخواہ پر معاملہ نہ ہو سکا، مجبوراً یوگ راج نے اپنے دوست مکھن رائے پسر بھگامل اینڈ سنز سے مدد لے کر وہیں رابن روڈ پر نہال چند کی دکان سے پچاس ساٹھ قدم پر فوٹوگرافی کی اپنی دکان کھول لی۔ دونوں میں چپقلیں ہوئیں اور بالآخر نہال چند جو پہلے چالیس دینے کو تیار نہیں تھا اب پچاس پر مان گیا۔ نہال چند عجیب بے نیاز اور مست آدمی تھا، کام بھی وقت پر نہ دیتا، البتہ گاہکوں کو چکنی چپڑی باتوں سے خوش کر دیتا، بار بار سر تسلیم خم کرتا اور 'جی بندہ پرور' ...... 'جی بندہ پرور' کی رٹ لگائے رہتا۔ نہال چند کی جیب جب گرم ہوتی تو وہ ترنگ میں ہوتا۔ دکان کے چبوترے پر بیٹھ کر گنا چوسنے میں مصروف رہتا یا سنگترے کی پھانکیں کھاتا۔ اس کا بیٹا کالج میں کئی سال سے بی اے میں تھا۔ بی اے

پاس نہ ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ فیل ہو تا رہا بلکہ اس نے کبھی امتحان ہی نہیں دیا تھا۔ نہال چند اُسے "ننھا" کہہ کر بلاتا۔ "اچھا تو ننھے، اب کے امتحان مت دے، اپریل میں تو گرمی بھی ہو جاتی ہے۔ آخر جلدی بھی کیا ہے، پھر دے دیں گے۔" نہال چند کا جب بھی موڈ ہو تا وہ دن بھر دکان سے غائب رہتا۔ ایک دن یوگ راج نے بائسکوپ کا پروگرام بنایا، لیکن نہال چند کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ معلوم ہوا کہ حضرت مکتی فوج والی میم صاحب کے ساتھ جو فوٹو بنوانے آتی تھی سارا دن گھڑ دوڑ کے میدان میں بازی لگاتے رہے۔ آخر یوگ راج نے دُکان چھوڑ دی۔ کسی نے نہال چند سے پوچھا۔ کہا میں نے اس نکال دیا ہے۔ یوگ راج نے لاہور چھوڑ بمبئی جانے کی ٹھانی۔ نہ جانے نہال چند کو کیسے معلوم ہو گیا۔ وہ الوداع کہنے کے لیے پلیٹ فارم پر آ پہنچا، اور گاڑی چلنے لگی تو جھٹ چھوٹی سی پوٹلی آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا "لو اس میں آلو کے پراٹھے ہیں، اچار بھی ہے اور پیاز بھی...... بھوک لگے گی کھا لینا۔" اور اس کے لبوں پر وہی شوخ مسکراہٹ کھیلنے لگی، اور سفید شلوار، طرے دار پگڑی میں گڈا سا نہال چند الوداعی رومال ہلانے لگا۔ بلونت سنگھ کو خوش طبعی سے فطری لگاؤ تھا، من موجی، مست مولا، کھانے پینے کا رسیا، زندگی کے گرم و سرد سے بے نیازانہ گزرنے اور معمولات کو موج مستی میں نبھانے اور خوش باش رہنے والا نہال چند، ہر چند کہ ایک معمولی آدمی ہے، لیکن اس کی خوش طبعی اس کو دلچسپ اور یادگار بنا دیتی ہے۔ یہ کہانی گویا خوش طبعی اور خوش باشی کے تئیں بلونت سنگھ کا خراجِ تحسین ہے۔

'خوددار' بھی اسی نوع کی چھوٹی سی کہانی ہے، ایک عام انسان کے کسی غیر عام پہلو کی۔ نہال چند میں جس طرح توجہ طلب خوش طبعی تھی، یہاں مسئلہ خودداری کا ہے یا اس رویے کا جو خودداری کو ڈھال بناتا ہے۔ راوی ایک انجینئر ہے جو بہار میں زلزلے کے بعد بحیثیت آفیسر کام کر رہا ہے۔ رگھوناتھ کو اس نے اس کی عمر اور ضرورت مند ہونے کی وجہ سے ملازمت دی ہے۔ وہ نہایت ایمان داری، اور ذمہ داری سے اپنا کام کرتا ہے اور راوی کو اس پر بھروسا ہے۔ رگھوناتھ ویسے ایک متمول شخص تھا۔ اس نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ لیکن زلزلے میں سب برباد ہو گیا۔ اب اس کے گھر میں نیم پاگل بیوی، بیوہ بہن اور اس کا تین سالہ پوتا رہ گئے تھے۔ بڑا لڑکا دق سے مر گیا، بچی کھچی پونجی اس پر اٹھ گئی۔ ایک دن وہ راوی سے کچھ کہنے کے لیے سارا دن فرصت کا انتظار کرتا رہا۔ آخر شام کو راوی نے جب اصرار کر کے پوچھا تو رگھوناتھ نے ہچکچاتے ہوتے راوی نے جب اصرار

کر کے پوچھا تو رگھوناتھ نے ہچکچاتے ہوئے کہا: "میں بہت شرمسار ہوں...... مجھ کو ایک روپیہ درکار ہے۔" دھیمی آواز میں اس نے وضاحت کی "شاید آپ کو یاد ہوگا۔ آپ نے ایک دفعہ مجھ سے ایک روپیہ لیا تھا، ساڑھے تین مہینے پہلے۔ امید ہے آپ بھولے نہیں ہوں گے......" راوی حیران ہوتا ہے کیونکہ اس کو یاد تھا کہ اس نے وہ روپیہ اسی شام کو لوٹا دیا تھا۔ رگھوناتھ شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا جیسے زمین میں گڑا جا رہا ہو۔ "آپ سے کیا چھپانا، کل سے گھر پر روٹی نہیں پکی...... آٹا ختم ہے کس کے آگے ہاتھ پھیلانے کی میری عادت نہیں۔ بس یہ تھی اصل بات، ورنہ ایک روپے کی حیثیت ہی کیا...... میں ہرگز یاد نہ دلاتا۔" راوی اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے اور پوچھتا ہے کہ اس کو کتنے روپوں کی ضرورت ہے، تاکہ وہ اس کی مدد کر سکے۔ لیکن رگھوناتھ مزید روپے لینے پر تیار نہیں ہوتا۔ اس نے زندگی بھر نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا تھا، نہ کبھی زندگی میں ادھار لی تھی۔ اب آخری عمر میں اپنے اصول سے گرنا نہیں چاہتا۔ راوی چپکے سے ایک روپیہ نکال کر دیتا ہے جسے رگھوناتھ مٹھی میں بھینچ لیتا ہے۔

ایسی کہانیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلونت سنگھ انسانی نفسیات کی باریکیوں میں اترنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ بیانیہ کو وضع کرتے ہوئے اور کرداروں کو تراشتے ہوئے بلونت سنگھ نے انسانی نفسیات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا، اور کہیں کہیں تو ایسا نکتہ پیدا کیا ہے کہ روز مرہ کی بے کیف اور روٹین زندگی میں کوئی ایسا پہلو سامنے آ گیا ہے، یا کوئی معنویت ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ نہ صرف کہانی دلچسپ ہو گئی ہے بلکہ کردار بھی یادگار ہو گیا ہے۔

اب آیئے ان کہانیوں کی طرف جن کا حاوی محرک جنسی جذبہ یا اس کا فقدان یا اس کی عدم تکمیل کا احساس ہے۔ ہمارے نزدیک ایسی پانچ کہانیاں قابل ذکر ہیں، یعنی 'پیپرویٹ' 'سمجھوتہ' 'دیمک' "کٹھن ڈگریا' اور 'سورما سنگھ' واضح رہے کہ اس نوع کی زیادہ تر کہانیاں شہری زندگی بلکہ متوسط یا نچلے متوسط طبقے کی شہری زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہاں کسی اخلاقی یا سماجی قدر کو آدرشانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ آدرش جو بھی ہیں، ان کہانیوں میں ان کا دوسرا رخ سامنے آتا ہے، یعنی ڈھکا چھپا رخ۔ متوسط طبقے کی مخصوص ملمع سازی کے پیش نظر آدرش برائے گفتگو تو خوب ہیں، لیکن عمل بالعموم ان سے گریز کی راہ نکالتا ہے۔ ان میں سے صرف ایک کہانی یعنی "سورما سنگھ" سکھ ثقافتی خلقیے میں رچی بسی ہے باقی کہانیاں عمومی معاشرتی نوعیت کی ہیں۔

'سورماسنگھ' بھی 'گرنتھی' کی طرح عام ڈگر سے یکسر ہٹی ہوئی ہے، اس کی واردات بھی تمام و کمال گورودواروں کی ہے، جیسے وہاں ارتکاز گرنتھی پر ہے، یہاں مرکزیت ایک گرے پڑے حاشیائی کردار سورماسنگھ کو حاصل ہے۔ البتہ نکتہ یہاں ڈھکے چھپے جذبات کا ہے، جس کی تعبیر مرد یا عورت دونوں کے نقطۂ نظر سے ہو سکتی ہے۔ اس گورودوارے میں پہاڑ پر گھومنے کے لیے آئے ہوئے لوگ جن کو کہیں اور جگہ نہیں ملتی چند روز کے لیے ٹھہر جاتے ہیں۔ لیکن سورماسنگھ کا چونکہ کوئی ٹھکانہ نہیں، وہ گورودوارے ہی میں اِدھر اُدھر بسیرا کر لیتا ہے اور کھانا اس کو لنگر سے مل جاتا ہے۔ "جس طرح مسلمانوں میں اندھے شخص کو حافظ جی کہا جاتا ہے اور ہندوؤں میں سورداس، اسی طرح سکھوں میں اسے سورماسنگھ کہتے ہیں۔" سورماسنگھ نہ سورما یعنی طاقتور تھا نہ مضبوط، بلکہ چھوٹے قد کا بے ہنگم سا شخص تھا، چہرے پر چیچک کے داغ، آنکھوں میں سفیدی، منہ تقریباً کھلا رہتا تھا اور بالوں کا بڑا سا جوڑا پگڑی میں سے گرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ جب جب سورماسنگھ موڈ میں ہوتا، زندگی کی ناپائیداری پر لیکچر جھاڑ دیتا، پھر شلوکوں، دوہوں یا بلھے شاہ کی کافیوں سے جیسا موقع ہوتا سماں باندھ دیتا۔ لیکن گورودوارے کے نہنگ سکھ جن کے ذمے گورودوارے کے لنگر کا کام تھا، ان میں اور سورماسنگھ میں نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ سورماسنگھ بھی سرِ شام بھٹی سے کچھ دور تختے پر بیٹھ جاتا اور ان کو ہدائتیں دیتا رہتا۔ نہنگ کہتے کہ عورت کے معاملے میں سورماسنگھ بڑا گھاگ ہے، عورتیں جہاں کپڑے دھونے کے لیے جمع ہوتی ہیں، سورماسنگھ کسی نہ کسی بہانے سے وہاں جا نکلتا، عورتوں کی باتیں سننے کا اسے بڑا شوق تھا، یا انجانے میں کسی پر گر پڑتا یا چھو جاتا۔ ایک دن غیر معمولی شور ہوا اور کچھ لوگوں نے سورماسنگھ کو پکڑ کر خوب پیٹا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک شادی شدہ نوجوان عورت اور اس کے ماں باپ بھائی بہن ٹھہرے ہوئے تھے۔ باقی کمرے چونکہ رکے ہوئے تھے انھوں نے سورماسنگھ کو اپنے کمرے کے ایک گوشے میں جگہ دے رکھی تھی۔ اس روز جب دوسرے لوگ اِدھر اُدھر تھے تو سورماسنگھ نے عورت سے باتوں باتوں میں دریافت کیا کہ اس کی عمر کیا ہوگی۔ اسی پر ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ سورماسنگھ کی پگڑی اس کے گلے کا ہار ہو رہی تھی، گال طمانچوں سے دہک رہے تھے، مسوڑوں سے خون نکل آیا تھا۔ عورت ایک طرف بیٹھی تھی، گندم گوں گلاب جامن سی، مدھ بھری کامنی آنکھیں۔ سورماسنگھ مار کھانے میں بہت ماہر تھا۔ جب سب مار چکے تو سورماسنگھ نے عورت کے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور پیشانی ان پر رکھ دی۔ عورت کے بھائی نے اس کو جوڑے سے پکڑ کر پرے

دھکیل دیا۔ عورت بڑے غصے سے پلنگ سے پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔ گیانی جی بھی جب ڈانٹ چکے تو سورما سنگھ نے عورت کے پاؤں پھر سے پکڑ لیے اور انھیں نرمی سے سہلاتے ہوئے اپنا گرم گرم رخسار ان پر رکھ دیا اور بلھے شاہ کی کافیوں کی آواز میں مبہم سے الفاظ کہے۔ عورت کا بھائی سورما سنگھ کو ہٹانے کے لیے جھپٹا تو عورت بولی...... "رہنے دیجیے بھائی صاحب، بیچارہ سورما سنگھ ہے۔"

کہانی کی فضا میں، کرداروں میں یا واقعات میں کہیں کوئی غیر معمولی بات نہیں، لیکن کہانی اپنا مزاج اور کیفیت رکھتی ہے۔ اس میں ایک اندھے شخص کے ڈھکے چھپے جذبات تو ہیں ہی جس کی آنکھیں اس کے ہاتھوں یا کانوں میں ہیں یا جو پوری کیفیت چھونے سے کشید کر لیتا ہے، لیکن اس میں عورت کا رویہ بھی خالی از معنویت نہیں۔ اس کا بھائی اور دیگر تمام لوگ سورما سنگھ کو زدوکوب کرتے ہیں، برا بھلا کہتے ہیں، لیکن وہ بے اعتنائی سے بیٹھی رہتی ہے گویا وہ نہ خفا ہے نہ خوش۔ اور جب روتا ہوا سورما سنگھ اس کے پاؤں پکڑ کر ان پر اپنا رخسار رکھ دیتا ہے تو وہ اپنے بھائی کو ٹوکتی ہے کہ رہنے دیجیے بیچارے کو کچھ نہ کہیے۔ یوں گویا یہ کہانی سورما سنگھ کی ہوتے ہوئے بھی سورما سنگھ کی نہیں۔ ایک ہی جملے سے بلونت سنگھ نے عورت کے جنسی رویے کے دوہرے پن کی طرف جو معنی خیز اشارہ کیا ہے، بغیر اعلیٰ درجے کی فنکاری کے ممکن نہ تھا۔

'پیپر ویٹ' 'سمجھوتہ' اور 'دیمک' روزمرہ زندگی کی دلچسپ کہانیاں ہیں۔ 'پیپر ویٹ' میں ایک نوجوان جوڑا ہے نیا نیا شادی شدہ۔ شوہر کو نوجوان بیوی کی اس بات سے چڑ ہے کہ اس کے دفتر چلے جانے کے بعد اس کی خوبصورت بیوی کھڑکی کھول کر نہ بیٹھا کرے کہ سامنے کے فلیٹ میں کالج کے لڑکے تاکتے ہیں۔ شوہر جتنا چڑتا اور بیوی کو ٹوکتا ہے، بیوی کو اتنی ہی تسکین ہوتی ہے کہ کوئی دیکھتا ہے تو دیکھا کرے، اس کا کیا جاتا ہے۔ شوہر بہانے بہانے سے جھگڑا کرتا رہتا ہے بیوی ٹال جاتی ہے، شوہر کو اپنی بے بسی پر بہت غصہ آتا ہے، چنانچہ کھسیانا ہو کر وہ طے کرتا ہے کہ بیوی سے انتقام لے اور گھر چھوڑ کر چلا جائے۔ رات کو جانے لگتا ہے تو بیوی کے نام خط لکھتا ہے کہ اس سے تنگ ہو کر گھر چھوڑ کر جا رہا ہے۔ بیوی پر الوداعی نگاہ ڈالنے کے لیے سونے کے کمرے کی طرف جاتا ہے، تو دیکھتا ہے کہ رضائی کھسک کر نیچے آ رہی تھی اور کھڑکی سے آنے والی چاندنی میں وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ اس سے رہا نہیں جاتا بوسہ لینے کے لیے جھکتا ہے تو بیوی کی مدماتی آنکھیں وا ہوتی ہیں اور وہ اسے پکڑ کر جوتوں سمیت رضائی کے اندر کھینچ لیتی ہے۔ نوکر کی آواز آتی ہے کہ سامان تانگے میں

رکھ دیا ہے۔ بیوی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہتی ہے سامان اتار کر اوپر لے آؤ۔

نئی نئی شادی کے بعد عورت مرد کے جذبات میں جو اتار چڑھاؤ آتے ہیں، مرد جس طرح عورت پر تصرف جمانا چاہتا ہے یا بات بات پر شک و شبہ کا شکار ہوتا ہے، یا خود اعتمادی کی کمی یا احساس کمتری کی بنا پر کھسیانا پن کا مظاہرہ کرتا ہے اور عورت اکثر و بیشتر ایک پُرسکون اعتماد سے اس کی جھیلتی اور سلجھاتی ہے، یہ چھوٹی سی کہانی اس کی خوبصورت تمثیل ہے۔

'سمجھوتہ' اور 'دیمک' بھی اس نوع کی دلچسپ کہانیاں ہیں۔ 'سمجھوتہ' میں ایک میاں بیوی جس فلیٹ میں منتقل ہوتے ہیں، وہیں سامنے ہی کچھ شوخ نوجوان طلبا رہتے ہیں۔ فلیٹ کی نشست اس طرح کی ہے بیوی لاکھ بچنے کی کوشش کرے، گھر کا کام کاج کرتے ہوئے وہ لڑکوں کی نگاہ میں رہتی ہے اور جب جب لڑکوں کو موقع ملتا ہے وہ چہلیں کرتے ہیں، جملے چست کرتے ہیں اور کبھی کبھی ایک آدھ گانے کا بول بھی ہو جاتا ہے۔ تنگ آکر بالآخر وہ عورت ایک دن تن کر کھڑی ہو جاتی ہے اور لڑکوں کو سخت سست سناتی ہے۔ اس دن کے بعد پڑوس میں مردنی چھا جاتی ہے، سب شوخی، خوش وقتی غائب ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ خود عورت کی طبیعت الجھنے لگتی ہے، اسے عجیب کمی سی محسوس ہوتی ہے، گویا اس کی کشش ختم ہو گئی یا وہ بوڑھی ہو گئی ہو۔ چنانچہ وہ میاں سے کہتی ہے، گھر بدل لیں، میں یہاں نہیں رہ سکتی۔

اس کہانی میں اور 'پیپر ویٹ' میں جو ربط ہے وہ ظاہر ہے۔ تاک جھانک، چھیڑ چھاڑ، غمزہ و ادا، شیوۂ حسن کے اطوار میں سے ہے۔ یہ شباب کے لوازمات میں سے ہیں۔ ادھیڑ عمر تک پہنچتے ہوئے جنسی جذبہ یکسانیت کی پٹری پر چلتا ہوا جس یک گونہ بے کیفی کا شکار ہوتا ہے اور عجیب عجیب شکلیں اختیار کرتا ہے، وہ مسائل الگ ہیں۔ بلونت سنگھ کے بیانیہ میں اس مطلبے نے بہت ہی ہنر مندانہ وضع اختیار کی ہے، اس سلسلے کی دو کہانیاں بالخصوص لائق ذکر ہیں، 'دیمک' اور 'کٹھن ڈگریا'۔ 'دیمک' کی حیثیت تمثیل کی ہے، یہی تھیم 'کٹھن ڈگریا' میں صحیح معنوں میں پوری فنکاری سے قائم ہوئی ہے۔

'دیمک' میں مسئلہ جنسی زندگی میں معمول اور یکسانیت کا ہے جو حواس کو کند اور جذبات کو تازگی سے عاری کر دیتی ہے۔ 'دیمک' دراصل روٹین اور روزمرہ کی بے کیفی کا وہ روگ ہے۔ جو زندگی کی تازگی اور حسن اور جنسی کشش کو چاٹ جاتا ہے۔ رینو ایک ایسی ہی بیوی ہے جو دن رات گھر گرہستی میں شوہر کی دلدہی اور بچوں کی خدمت میں لگی رہتی ہے، اور رفتہ رفتہ اپنے آپ سے بے نیاز ہو جاتی

ہے۔ شوہر راتوں کو دیر دیر سے آتا ہے تو وہ چپ چاپ سوچتی ہے کہ کیا وہ واقعی اس کو دودھ پیتی بچی سمجھتے ہیں؟

'دیمک' میں ادھیڑ عمر کی جس جنسی بے کیفی اور یکسانیت کا فقط سرسری بیان ہے، 'کٹھن ڈگریا' میں وہ بھرپور معنویت کے ساتھ سامنے آتی ہے اور پرت در پرت کئی گرہیں کھولتی ہے۔ یہ ایک طرح سے نسوانیت کی کہانی بھی ہے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عامل مرد ہے، لیکن عامل عورت بھی ہے۔ یکسانیت اور معمولہ زندگی کا روٹین جو مرد کے جذبات کو کند کر دیتا ہے، فقط مرد ہی کا مسئلہ نہیں، عورت کا مسئلہ بھی ہے۔ اصل معاملہ کلچر کا ہے جو 'ذکر مرکزیت' پر مبنی ہے، اس لیے جنسی زندگی کا عامل مرد کو تسلیم کر لیا گیا ہے ورنہ عورت بھی عامل ہے۔ ضروری نہیں کہ بلونت سنگھ نے اسے نسوایت کے نقطۂ نظر ہی سے لکھا ہو۔ اس نے تو اپنی فنکارانہ بصیرت کی روشنی میں ایک بیانیہ تشکیل دیا۔ لیکن چونکہ عورت کے جذبات سے بھی اس میں انصاف کیا گیا ہے یا اتفاقاً یہ انصاف ہو گیا ہے، ہماری رائے میں 'کٹھن ڈگریا' اس پایے کی کہانی ہے کہ نسوانیت کی کہانی میں بھی اسے خاص درجہ دیا جائے۔ ضمناً یہ اشارہ بھی ضروری ہے کہ بلونت سنگھ کی جنسی کہانیاں بالخصوص، 'کٹھن ڈگریا' بھی چونکہ توقعات کو رد اور آدرشوں کی پاش پاش کرتی ہیں، نوعیت کے اعتبار سے یہ بھی سنگین اور تلخ حقیقت کی یعنی شکست رومان کی کہانیاں ہیں نہ کہ آدرشی ہیرو پرستی یا رومان سازی کی۔

'کٹھن ڈگریا' بھی 'گرنتھی' یا 'سورما سنگھ' کی طرح نہایت گتھی ہوئی کہانی ہے جس میں ایک لفظ بھی فاضل نہیں اور بیانیہ میں بہاؤ بھی غضب کا ہے۔ رکھی رام ادھیڑ عمر کا بزنس مین ہے۔ شادی کو کئی برس گزر گئے۔ تین بچوں کا باپ ہے۔ بیوی شانتا خوبصورت ہے، لیکن پہلی سی کشش باقی نہیں۔ بیج ناتھ، رکھی رام کا دوست ہے جس کو مکان دلوانے میں رکھی رام نے مدد کی تھی۔ بیج ناتھ کی بیوی کامنی رفتہ رفتہ رکھی رام کے لیے کشش کا باعث بن جاتی ہے' دونوں گھرانوں میں خاصے مراسم ہیں، اور ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا بھی ہے۔ ایک دن رکھی رام کو کاروبار کے سلسلے میں سفر پر جانا ہے۔ وہ بیوی کو فون کر دیتا ہے کہ سامان تیار کر دے، رات کی گاڑی سے وہ دہلی چلا جائے گا۔ لیکن دہلی سے اطلاع ملتی ہے کہ جس شخص سے ملنا تھا وہ خود لاہور آ رہا ہے۔ رکھی رام گھر پہنچ کر بیوی کو بتاتا ہے کہ سفر تو ملتوی ہو گیا ہے لیکن رات کا کھانا وہ باہر ہی کھائے گا۔ جلدی سے نہا دھو تیار ہو کر وہ نکل جاتا ہے۔ عبداللہ سگریٹوں کا وہ بہت مداح تھا۔ جب خوش ہوتا تو عبداللہ ضرور پیتا۔

بیج ناتھ کے گھر پہنچتا ہے تو خود بیج ناتھ کہیں جانے کی تیاری میں ہے۔ رکھی رام کہتا ہے کہ میں تو یونہی ادھر چلا آیا تم کہیں جارہے ہو تو چلو، پھر سہی۔ لیکن بیج ناتھ اس کو روکتے ہوئے کہتا ہے کہ اتنی دور سے آئے ہو تو تھوڑی دیر کو رکو، میری کہیں دعوت ہے، زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔ میری واپسی تک تم کھانا بھی یہیں کھالو۔ میں بس چٹکی بجاتے میں آتا ہوں پھر تاش جمے گی۔ اس کے بعد کا منظر بلونت سنگھ کے لفظوں میں:

"ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے کامنی بیٹھک کی کھڑکی کے قریب آکھڑی ہوئی۔

وہ وہاں چپ کھڑی شوہر کو گلی کے نکڑ سے غائب ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس اثنا میں رکھی بھی چپکے سے دیوار سے لگ کے اس کے قریب کھڑا ہو گیا تھا۔ کچھ دیر کامنی سنسان گلی کی جانب دیکھتی رہی۔ پھر اس کا ہاتھ اوپر اٹھ کر بجلی کے بٹن کی طرف بڑھا اور دوسرے لمحے میں بجلی کا بلب بجھ گیا اور فرش پر بچھی ہوئی دری پر کھڑکی میں سے آتی ہوئی چاندنی پھیل گئی۔

رکھی نے بازو بڑھایا جو کامنی کی پیٹھ سے ہوتا ہوا اس کے گوشت سے بھرپور کولھے پر جا کر ٹک گیا۔ کامنی کی کمر ہلی، لمحے بھر بعد ساکن ہو گئی۔ وہ اور قریب ہو کر اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ ان دونوں کی آنکھیں چار نہیں ہوئیں لیکن کامنی کی کمر نے لرزش کے بعد سکون اختیار کر کے گویا اس کے سوال کا جواب اثبات میں دے دیا تھا۔

وہ خاموش کھڑی تھی۔ دو ایک مرتبہ رکھی کے لبوں سے نکلتی ہوئی درد محبت میں ڈوبی ہوئی مدھم سی آواز سنائی دی۔ "کمو کمو"۔

جواب میں کامنی نے پلکیں اوپر اٹھائیں اور ایک مرتبہ بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر سپردگی کے انداز میں پلکیں جھکا کر رہ گئی۔ وہ بجلی کے کوندے کی طرح آگے بڑھا۔ اس کی کمر کو بازوؤں میں لے کر اسے اپنی طرف کھینچا، یوں محسوس ہوا جیسے پھولوں کی نازک ڈالی پکڑ کے جھنجھنا دی ہو۔ اس کا جسم سر سے پاؤں تک کامنی کے نرم لچکیلے جسم کے لمس سے محظوظ ہونے لگا۔ ایک اور شدید اور فوری جذبے کے تحت اس نے نہ معلوم کس کس طرح اسے بھینچا، چوما اور پھر لڑکے کی پکار کی آواز یں ہتھوڑوں کے دھماکوں کی طرح سنائی دینے لگیں اور پھر کامنی اڑتی ہوئی خوشبو کی

طرح اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔"

کامنی چولھے کے قریب بیٹھی دیگچی میں چمچ ہلا رہی تھی۔ اس کا تین چار سال کا بیٹا گھٹنے کے ساتھ لگا اونگھ رہا تھا۔ شعلوں کی روشنی میں کامنی کا چہرہ دمک رہا تھا۔ بال کچھ پریشان ہو گئے تھے۔ بچے کو سلانے کے بعد کامنی اس کے لیے روٹی بنانے لگتی ہے:

"کامنی نے روٹی الٹتے ہوئے کہا۔ "آپ کو بھوک تو لگ رہی ہو گی۔"

اس نے اٹھ کر کامنی کے رخسار پر ہونٹ رکھ دیے۔ "نہیں کمو! مجھے بھوک نہیں لگ رہی۔" یہ کہہ کر وہ اسے اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔ کامنی نے اپنے آپ کو اس کی مرضی پر چھوڑتے ہوئے کہا "مجھے روٹی تو پکا لینے دیجیے۔"

"میری جان سے پیاری کمو! روٹی پھر پکا لینا۔" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ مار کر توا چولھے سے گرا دیا۔"

اس موقعے پر کوئی دوسرا افسانہ نگار ہوتا تو عریانی کی طرف کھنچنا معمولی بات تھی۔ لیکن بلونت سنگھ صاف دامن بچا گئے ہیں۔ انھوں نے یہ سب کچھ قاری کی چشم تصور کے لیے چھوڑ دیا اور لکھا بھی تو صرف اتنا:

"وہ خوش تھا اور سر تا پا نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اب وہ بیٹھک میں دری پر لیٹا ہوا تھا۔ ٹانگیں اٹھا کر قریب بچھی ہوئی کرسی پر رکھے وہ بجلی کی جگ مگاتی ہوئی روشنی میں ویکلی کا پرچہ پیٹ پر دھرے اس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

ایک مرتبہ پھر کامنی چولھے کے آگے بیٹھی اس کے لیے پراٹھے پکا رہی تھی۔ اس روز سے پہلے زندگی کے جو دن گزر چکے تھے بالکل بے کیف نظر آنے لگے تھے۔ یہ مسرت، یہ لذت اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ دل مطمئن تھا۔ جسم ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔ روح پر ناقابلِ بیان کیف طاری تھا۔ آج کامنی اور وہ ایک ہو گئے تھے۔"

کہانی کا آخری موڑ وہاں آتا ہے جب خوش خوش رکھی رام گھر لوٹتا ہے تو نکڑ کے پنواڑی کے پاس سگریٹ سلگانے کے لیے رک جاتا ہے، اور عادتاً پنواڑی سے پوچھتا ہے کہ مجھ سے ملنے کوئی آیا تو نہیں تھا۔ پنواڑی کہتا ہے: "بابو بیج ناتھ آئے تھے، آپ کا انتجار کر کے چلے گئے۔" "بیج ناتھ؟"

"ہاں بیج ناتھ بابو۔" وہ سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ گھر کا راستہ وہ بہت آہستہ آہستہ طے کرتا ہے۔ اندر داخل ہوتا ہے تو شانا ترو تازہ اور اجلی دکھائی دے رہی ہے۔ صوفے پر بیٹھتے ہی پوچھتا ہے۔ "شنو آج تم بہت خوش دکھائی دے رہی ہو۔ وہ بلا کچھ کہے نرمی سے اس کے کندھے پر رخسار رکھ دیتی ہے۔ شنو کی نیند کی ماتی پلکیں بوجھل ہو کر جھکنے لگتی ہیں۔ وہ کہتا ہے۔ "میں بھی بہت خوش ہوں شنو! ذرا لاؤ تو عبداللہ سگریٹوں کا ڈبا۔"

پوری کہانی میں ایک بھی کڑی ڈھیلی نہیں ہے، سارا واقعہ ایک شام کا ہے جس میں کوئی بات کوئی وقوعہ ناگہانی یا اتفاقا رونما نہیں ہوتا، انسانی فطرت کی ترجمانی اپنی جگہ، پورے بیانیے کی ایک ایک چول افسانہ نگار نے اس فنکاری سے بٹھائی ہے کہ کہیں پر کوئی جھول نہیں، ہر بات فطری طور پر واقع ہوتی چلی جاتی ہے، قاری کو کہیں دھچکا نہیں لگتا۔ پوری کہانی ایک خوش گوار خواب ناکی سے جاری رہتی ہے۔ رکھی رام کا دن بھر کے کام کے بعد کچھ سوچتے ہوئے گھر لوٹنا، نہادھو تیار ہو کر ایک موہوم امید کو دل میں لیے بیج ناتھ کے یہاں پہنچنا، یہاں خود بیج ناتھ کا دعوت کے بہانے باہر جانے کا پروگرام بنائے ہوئے ہونا، مدتوں سے جس موقع کا انتظار تھا، اس کا یوں سہج فراہم ہو جانا، چولھے کے قریب بیٹھی ہوئی کامنی کے وجود کا تمتمانا اور پگھلنا، یہ سب گویا 'رتی' اور 'کام' کی کشش اور بھوگ کی تمثیل ہے۔ آخری سچویشن میں جب پنواڑی کی بات سے خود رکھی کے چکمہ کھا جانے کا راز کھلتا ہے تو Irony کی صدمہ زا صورت سامنے آتی ہے، جس سے کہانی کی معنویت اور گہری ہو جاتی ہے۔

بظاہر افسانہ نگار نے ایک مزے کا بیانیہ بُنا ہے، جس میں دوہری چال کی تکنیک سے کام لیا گیا ہے۔ یعنی جو مات دینے چلا ہے وہ خود مات کھا جاتا ہے۔ ادھیڑ عمر کی نفسیات یا جنسی ناآسودگی یا شادی کے بندھن سے باہر کا معاشقہ سامنے کی باتیں ہیں، جن میں کوئی غیر معمولی پہلو نہیں۔ البتہ کہانی میں تجسس کا عنصر جنسی جذبے کی وجہ سے بھی ہے اور اس دوطرفہ اسرار کی وجہ سے بھی کہ ایک مرد اور عورت کے غیر سماجی عمل کی خبر دوسرے مرد اور عورت کو نہیں حالانکہ وہ خود اسی عمل کے مرتکب ہیں۔ دھوکا دہی اور فریب کاری انسانی سرشت کا حصہ ہے، لیکن چکمہ دینے والے کا خود چکمہ کھا جانا انوکھے استعجاب کا پہلو رکھتا ہے۔ لیکن یہ Law of Retribution عمل مکافات کی کہانی ہو، ایسا نہیں ہے۔ رکھی پنواڑی سے بات کر کے ششدر ضرور رہ جاتا ہے، اور تھوڑی دیر کو اس کے قدم بھی نہیں اٹھتے، لیکن مات کا یہ احساس لمحاتی ہے، گھر پہنچ کر وہ بیوی سے کہتا ہے "آج تم

بہت خوش دکھائی دے رہی ہو" تو تھوڑی دیر بعد خود ہی کہتا ہے "میں بھی بہت خوش ہوں۔ ذرا لاؤ تو عبداللہ سگریٹوں کا ڈبا" گویا مات بھی مات نہیں۔ اس کہانی کو فقط اخلاقی یا غیر اخلاقی بیانیہ کے طور پر پڑھنا اس کے ساتھ بے انصافی کرنا اور اس کے فنکارانہ حسن کا خون کرنا ہے۔

اس بیانیہ کے متنِ میں کچھ اور گنجائشیں بھی ہیں۔ پنواڑی سے بات کے بعد تصویر کا دوسرا رخ جواب تک نظروں سے پوشیدہ تھا معاً آشکار ہو جاتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ ایک ہی واقعہ شق ہو کر دو واقعے بن جاتا ہے، یا ایک مظہر دولخت ہو جاتا ہے اور دو ملتے جلتے مظہر جو ایک دوسرے کا ثنیٰ ہیں، وجود میں آ جاتے ہیں۔ کہانی کا غائب راوی رکھی رام کے ساتھ ساتھ ہے، یعنی رکھی رام اور کامنی کی واردات نظر میں رہتی ہے۔ کیونکہ حاضر عناصر یہ دو ہیں، جبکہ یہی واردات عین اسی وقت بیج ناتھ اور شانتا کے درمیان بھی واقع ہوتی ہے جو دو غائب عناصر ہیں، اور قاری اس سے بعد میں آگاہ ہوتا ہے۔ ان چاروں عناصر کی یہ دُہری وارداتیں ایک دوسرے کی ضد بھی ہیں اور رد بھی۔ دونوں کو ایک دوسرے کی خبر نہیں، اور خود قاری کو بھی دو کی خبر ہے اور دو کی خبر نہیں، حالانکہ عمل آرا چاروں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا عناصر کی بدلی ہوئی Juxtaposition یعنی متوازی نقلِ مکانی یکسانیت کی بے معنویت میں نئے رشتے سے پیدا ہونے والی نئی معنویت کی نقیب نہیں بن جاتی؟

ہیں عناصر کی یہ صورت بازیاں
شعبدے کیا کیا ہیں ان چاروں کے بیچ
(میرؔ)

یہ مختصر اور دلچسپ کہانی جو کہتی ہے سو تو کہتی ہے اور جو نہیں کہتی سو بھی کہتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ادب اور آرٹ (بشمول بیانیہ کی شعریات) کے ضمن میں اس متن کے مضمرات خالی از لطف نہیں۔ مرد اور عورت کی جنسی زندگی کئی اعتبار سے آرٹ کی تمثیل ہے۔ یا اس کا الٹ یعنی آرٹ مرد اور عورت کے اتصال کی تمثیل ہے۔ ادب اور آرٹ میں یہ داستان دب دب کر ابھرتی ہے، کیسی کیسی ہستیوں نے کیسے کیسے تجربات کی بازیافت کی ہے یا انھیں آرٹ بنادیا ہے۔ آرٹ کا سب سے بھیانک مسئلہ رسمیاتی اظہار یعنی پٹی ہوئی لیک سے گریز ہے۔ روایت سے رشتہ بنائے رکھنا جتنا ضروری ہے، اتنا ہی ضروری اس سے گریز یا اس سے بغاوت بھی ہے۔ نئی آواز، نئے لہجے، نئے اسلوب یا نئے انداز کو پانے کی تڑپ، ادب اور آرٹ کی اکتا دینے اور تھکا دینے والی یکسانیت کے دشتِ

بے اماں میں تمنا کا دوسرا قدم اٹھانے کی آرزو یا تازہ کاری کی تلاش تخلیق کا سب سے بڑا رمز ہے۔

ادب کے حوالے سے اس مسئلے پر جیسا غور و خوص روسی ہیئت پسندوں نے کیا ہے، اہل علم کی نظر میں ہے۔ شکلووسکی کا یہ اصرار غلط نہیں تھا کہ روزمرہ زندگی میں تجربے کی تازگی باقی نہیں رہتی۔ ہر چیز معمول (روٹین) بن جاتی ہے۔ ادب اور آرٹ کا کام تجربے کی تازگی کی بازیافت ہے۔ شکلووسکی کے ان الفاظ کی یاد دلانا یہاں خالی از لطف نہیں:

"HABITUALIZATION DEVOURS OBJECTS, CLOTHES, FURNITURE, EVEN ONE'S WIFE .... ALL ART EXITS TO HELP US RECOVER THE SENSATION OF LIFE; IT EXITS TO MAKE US FEEL THINGS."

معمول یا روٹین آرٹ کی دشمن ہے۔ یکسانیت اکتاہٹ پیدا کر کے حواس کو کند کر دیتی ہے اور وہ تازگی اور تھرتھراہٹوں سے عاری ہو جاتے ہیں۔ اعلیٰ فنکار روش خاص کی سعی و جستجو پر اصرار، نیز پابستگی رسم ورہ عام پر بار بار طنز کیوں کرتے ہیں یا کلیشے سے کیوں بھاگتے ہیں؟ ادب و آرٹ میں تازگی یا ندرت خواہ وہ اظہار کی ہو یا معنی کی، اس کا رشتہ لازماً انحراف و انقطاع یا بغاوت سے کیوں جڑا ہوا ہے؟ روسی ہیئت پسندوں نے تخلیق کے اس عمل کو Defamiliarisation یعنی اجنبیت سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ادب اور آرٹ کی شعبدہ کاریوں کا اصل راز اجنبیت یا تازگی کا نیرنگ نظر ہے۔

اس کہانی کے جو وضعی معنی ہیں، وہ تو ہیں ہی، لیکن اس میں ایک کلیدی نکتہ ہے۔ رکھی رام اور بیج ناتھ تو اپنا اپنا گھر چھوڑ کر دوسری سمت میں جاتے ہیں، لیکن کامنی اور شانتا کہیں نہیں جاتیں یہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ رکھی رام اور بیج ناتھ گردش میں ہیں جبکہ کامنی یا شانتا مستقل موجود ہیں، بطور (مسرت کے) مبدء و ماخذ کے۔ تخلیق یا ادب و آرٹ کی تمثیل میں عورت بطور سگنی فائر ہے کیونکہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ چنانچہ مرد جو جگہ بدل لیتا ہے اور گردش میں ہے، بطور سگنیفائڈ ہے۔ ایسا قدیم کلچر یا وادی سندھ کی نساء مرکزیت کی رو سے دور از قیاس بھی نہیں۔ نیز یہ برصغیر کے پہاڑی علاقوں کی مادری بشریات یا شکتی متھ کی رو سے بھی بامعنی ہے، جہاں اساسیت مرد کو نہیں عورت کو حاصل ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو یہ کہانی نسوانیت کے حاضرہ معانی کی پیشرو بھی ہے حالانکہ بلونت سنگھ کو متن تیار کرتے وقت اس کا گمان بھی نہ ہوگا۔ لیکن متن فقط وہ نہیں کہتا جو اس

سے مصنف کہلانا چاہتا ہے متن مصنف سے آگے بھی جاتا ہے اور نئی قراتوں کے ساتھ نئے معانی بھی دیتا ہے۔ بہر حال اتنا معلوم ہے کہ سگنی فائر اور سگنیفائڈ میں دوہرا رشتہ ہے، ایک حقیقی یعنی وضعی اور دوسرا اجازی یعنی غیر وضعی۔ کامنی / بج ناتھ میاں بیوی ہیں اور یہ رشتہ حقیقی ہے، جبکہ کامنی / رکھی رام میاں بیوی نہیں، یہ رشتہ مجازی یعنی غیر وضعی ہے۔ معنی حقیقی کی حکم جس طرح لغت ہے، شوہر بیوی میں رشتہ حقیقی کا حکم سماجی ضابطہ اخلاق ہے۔ لیکن حقیقی یا وضعی معانی فقط متعینہ معانی ہیں، یہ محدود اور نئے امکانات سے عاری ہیں۔ البتہ جب سگنی فائر سگنیفائڈ سے رشتہ غیر وضعی استوار کرتا ہے تو مجاز سے نئی معنویت ابھرتی ہے جو جمالیاتی کیف وکم کو راہ دیتی ہے، کامنی یا شانتا جہاں تک اپنے اپنے متعینہ سگنیفائڈ کے ساتھ ہیں، یہ کلیشے ہیں۔ لیکن جیسے ہی یہ غیر متعینہ یا غیر وضعی سگنیفائڈ سے وابستہ ہوتی ہیں، نئے معانی اختیار کرتی ہیں، اور تازگی و نشاط کی راہ کھل جاتی ہے۔ واضح رہے کہ سگنی فائر وہیں ہے اور اپنی جگہ پر قائم ہے، جب کہ گردش میں سگنیفائڈ ہے، (رکھی رام یا بج ناتھ) یعنی معانی غیر وضعی سیال ہے، گردش میں ہے اور جگہ بدل لیتا ہے۔ اور اس کا یہ عدم استحکام یا گردش معانی کی تازگی اور ندرت کے نئے نئے امکانات کی نقیب ہے۔ غرضیکہ ادب و آرٹ مجاز کا کھیل ہیں، نت نئی حقیقت یا معنی کے خلق کرنے کا، نہ کہ لیک پر چلتے جانے کا۔ یہاں یہ اشارہ بھی خالی از لطف نہ ہوگا کہ ندرت کا جو نکتہ جنسی رشتے کی تہہ میں ہے یا ادب اور آرٹ کی جینیس میں ہے، وہی نکتہ کائنات کی تخلیق یا حیاتیات کا بھی سب سے بڑا رمز ہے اور زندگی کی بقا اور فروغ کا ضامن ہے، یعنی خلیے برابر شق ہو ہو کر اپنا مثنیٰ ڈھالتے رہتے ہیں جن میں DNA کے ہزاروں کوڈ خود کو بعینہٖ دُہراتے ہیں۔ اور یہ بات بمنزلہ قانون کے ہے۔ فطرت کا اصول ہے کہ یہ ہزاروں لاکھوں کوڈ جوں کے توں شق شدہ خلیے میں جاگزیں ہوتے جاتے ہیں، الا کسی ایک کوڈ کے جو ہزاروں لاکھوں میں فقط ایک مختلف ہو جاتا ہے، اور جس سے پیٹرن غیر وضعی ہو جاتا ہے۔ اس کو Mutation یعنی عمل تغیر کہتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں پیٹرنوں میں ایک غیر وضعی تغیر یعنی Mutation نہ ہو تو کرۂ ارض پر نسلوں اور شکلوں کے ان گنت امکانات ممکن ہی نہ ہو سکیں۔ گویا فطرت کا تنوع اور تازہ کاری غیر وضعی پیٹرن کی مرہون منت ہے۔ بالکل یہی معاملہ ادب اور آرٹ کا ہے۔ ادب اور آرٹ میں بھی تازہ کاری اور ندرت کا کھیل غیر وضعی رشتوں اور غیر وضعی معانی کا کھیل ہے۔ لیکن بلونت سنگھ کو اس سے کیا لینا دینا۔ اس نے تو ایک مزے کا متن قائم کر دیا، لیکن تخلیقی متن میں یہ گنجائش

ہمیشہ ہوتی ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ اس کی ساخت سے دوسرے معانی بھی پیدا ہو سکیں چنانچہ اس امر میں کس کو کلام ہو سکتا ہے کہ 'کٹھن ڈگریا' کو ادب اور آرٹ کے غیر وضعی رشتوں یا تازہ کاری یا جدت و ندرت کے امکانات کی تمثیل کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے، اور یہ قرأت پر لطف معنویت رکھتی ہے۔

---

اوپر ہم نے بلونت سنگھ کے افسانوی فن کی مختلف جہات پر حتی الامکان نظر ڈالنے کی کوشش کی۔ اردو افسانہ تنوع کے اعتبار سے ایک قوس قزح کی طرح ہے، جس کے رنگ ایک کے بعد ایک تنے ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ بلونت سنگھ کو ان کی زندگی میں بھی کوئی اہمیت نہ دی گئی، اور موت کے بعد تو فراموش ہی کر دیا گیا، لیکن اردو افسانوں کے رنگوں میں ایک رنگ بلونت سنگھ کا بھی ہے، جو خاصا خوشنما ہے اور دوسروں سے الگ بھی ہے، افسانوں کے افق پر اس وقت منٹو، بیدی، کرشن چندر اور عصمت چھائے ہوئے تھے، جس سے بلونت سنگھ کی مہک پھیلی تو لیکن اتنی نہ پھیلی جتنا اس کا حق تھا، اس میں کچھ تو خود بلونت سنگھ کی کم آمیزی کو بھی دخل تھا اور کچھ یہ بھی کہ بعد میں ان کی زیادہ تر کتابیں، ناول اور افسانے ہندی میں بھی شائع ہوتے رہے اور اردو نے اپنے ایک البیلے فنکار کو فراموش کر دیا۔ اوپر ہم نے درجہ بدرجہ بلونت سنگھ کے فن سے بحث کی۔ بادی النظر میں وہ ایک رومان نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ شق ایک میں ان کی فنکاری کے اس پہلو سے بحث کی گئی ہے۔ ان کی اسی نوع کی کہانیاں زیادہ مشہور بھی ہوئیں، جن میں غیر معمولی قدو قامت اور مردانہ خوبیوں کے حامل سکھ کردار سامنے آتے ہیں جو نہ صرف طاقت و بہادری میں بے مثال ہیں، یہ نیکی و ایثار و خیر اور انسانی شرف کے نقیب بھی ہیں۔ یہ گویا ثقافتی Alterego ہیں، یعنی نسلی علاقائی آرزوؤں یا امنگوں کی ترجمانی اور تحفظ کا 'تصوریہ' یا اجتماعی لاشعور میں پلنے والا آرکی نقش جو بطور ہیرو ایک عین یا مثال کی طرح کار فرما رہتا ہے، اور انسانی گروہوں یا قبیلوں کو ہمت و مردانگی کا معیار فراہم کرتا ہے۔ لیکن یہ پوری تصویر نہیں۔ اکثر و بیشتر یہ تمثیلی ہیرو اپنی تکذیب کرتے ہیں۔ یہ یا ان کے نمونے پر ڈھلے ہوئے کردار ان قدروں کو شکست کرتے ہیں جن کے تحفظ کی یہ ترجمانی کرتے ہیں۔

شق تین میں اس آویزش و تقلیب سے بحث کی گئی، اور دوسرا رخ سامنے لایا گیا کہ بلونت سنگھ کا فن فقط رومان نگاری کا فن نہیں، یہ شکست رومان کا سنگین منظر نامہ بھی پیش کرتا ہے، جہاں انسانی

شرف کو انسانی رذالت کاٹتی ہے۔ اور اس رخ سے دیکھیے تو بھی بعض ایسے کردار سامنے آتے ہیں جو افسانوی اور جمالیاتی طور پر نہایت اثر آفریں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی کھلتی ہے کہ بلونت سنگھ کے یہاں کردار فقط کردار نہیں یا واقعات فقط واقعات نہیں، بلکہ سب کچھ اس وسیع منظر نامے پر تشکیل پاتا ہے جس کو ثقافتی جغرافیہ کہنا چاہیے۔ اس میں قصبوں کی فضا اور مٹی کی بو باس تو ہے ہی، لیکن فقط کھیت کھلیان یا سرسوں کا پھول ہی نہیں، طور طریقے، رہن سہن، پوجا پاٹھ، شبد کیرتن، میلے ٹھیلے، تیج تہوار، گانا بجانا، رسمیں عقیدے، سبھی کچھ، جس سے پوری سائیکی اور ثقافت عبارت ہے۔ یہ کردار زندہ اس لیے لگتے ہیں کہ یہ اپنے ثقافتی خلقیہ میں سانس لیتے ہیں، اور یہ ثقافتی خلقیہ اور سائیکی ان میں سانس لیتی ہے۔ یعنی یہ سب فقط تناظر نہیں، بیانیہ کی بافت میں شامل ہے، اور بلونت سنگھ کے فن میں بطور جمالیاتی یا ادبی قدر کے اسی طرح رواں دواں ہے جیسے رگوں میں لہو۔ یہ کیفیت چونکہ دونوں نوع کی کہانیوں کے بیانیہ کا ناگزیر حصہ ہے۔ شق دو میں اس کی کچھ پرتوں کو پیش کیا گیا ہے کیونکہ بنیادی حیثیت سے یہ اُس اُفتادِ ذہنی یا تخلیقی حسیت کا حصہ ہے جو پورے بیانیہ میں جاری و ساری ہے۔

شق چار یا آخری حصے میں بعض گنی چنی شہری کہانیوں کو لیا گیا کہ بلونت سنگھ کا فن فقط اُن کہانیوں تک محدود نہیں جن کا ذکر پہلے کیا گیا۔ اس نے شہری کرداروں اور مسائل کی کہانیاں بھی اسی فنی ہنرمندی اور آگہی سے لکھی ہیں، لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ یہاں سامنے کے معمولی انسانوں سے انھوں نے یادگار کردار تراشے ہیں۔ بلونت سنگھ کی فنکاری کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے ان کی نگاہ میں رکھنا بھی ضروری تھا۔ آخر میں ان کہانیوں پر نظر ڈالی گئی جن کا حاوی محرک جنسی جذبہ ہے۔ یہ کہانیاں بھی کیفیت سے لبریز ہیں، اور ان میں 'دکھن ڈگریا' تو ہنرمندی کی ایک اور ہی سطح کو سامنے لاتی ہے۔ روایتی معنی سے ہٹ کر یا اخلاقی یا غیر اخلاقی تعبیر سے قطع نظر اس کو نسوانیت کی کہانی کے طور پر، یا ادب اور آرٹ میں ندرت یا تازہ کاری کی تمثیل کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے جہاں رسوم و قیود سے گریز یا انحراف ہی سے اظہار و اسالیب کی نئی نئی شکلوں کا ظہور ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کے متن کو بے دخل کر کے جسمانی نہیں، جمالیاتی کیف و نشاط کے متن کے طور پر بھی پڑھا اور پرکھا گیا ہے۔

ایسی پر لطف کہانیوں کا فنکار اردو افسانے کی تاریخ سے غائب نہیں ہو سکتا۔ راجندر سنگھ بیدی

نے تقسیم سے چند برس پہلے بلونت سنگھ کے پہلے افسانوی مجموعے پر لکھتے ہوئے کہا تھا: "بلونت سنگھ اپنے موضوع میں تنوع، تحریر میں شگفتگی اور ہر لحظہ ایک ایسا نیا پہلو پیش کرتے ہیں کہ پڑھ کر ہماری جمالیاتی حس کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔" یہ رائے ہر اعتبار سے صحیح ثابت ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ بلونت سنگھ کے ناولوں کی تعداد ان کے افسانوی مجموعوں سے زیادہ ہے۔ لیکن ان کے جوہر ان کی افسانہ نگاری ہی میں کھلتے ہیں۔ اپنے ناولوں میں وہ زیادہ کامیاب نہیں۔ ہمیں اوپیندر ناتھ اشک کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ "ان کے ناولوں میں خاصا ڈھیلا پن ہے، بہت کچھ ایسا ہے جو بنا ہوا، گھڑا ہوا اور حقیقت سے بعید ہے۔ لیکن ان کی کہانیاں اس خامی سے یکسر پاک ہیں۔" بہ حیثیت افسانہ نگار وہ کہیں زیادہ کامیاب ہیں۔ اگرچہ منٹو، بیدی، کرشن، اور قاسمی کے فوراً بعد کے معاصرین میں ہونے کی وجہ سے ان پر نگاہیں اس قدر نہ ٹھہریں، اور پھر قبل از وقت موت سے وہ نگاہوں سے جلد اوجھل بھی ہوگئے، تاہم سکھ سائیکی اور ثقافتی معنویت کی باز آفرینی کے اعتبار سے، نیز 'جگا' 'گرنتھی' "سورما سنگھ" "ویسلے ۳۸" "پہلا پتھر" "دیش بھگت" 'کالی تتری' یا 'کٹھن ڈگریا' کے خالق کی حیثیت سے اردو افسانے کی دنیا میں بلونت سنگھ کی جگہ محفوظ ہے۔ ان کی خاص خاص کہانیوں کی قبولیت اور معنویت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھے گی کم نہیں ہوگی۔ ایسا افسانہ نگار وقتی طور پر نظر انداز تو ہوسکتا ہے، وقت اسے ہمیشہ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

## بلوچ اور پشتون تاریخ پر کتابیں

**انور رومان** (تراجم) بلوچستان گزیٹر۔ بلوچ تاریخ۔ پٹھان رسم و رواج اور تاریخ افغانستان تاریخ کے آئینے میں۔ بلوچ۔ پاوندے۔ قدیم بلوچستان۔ تاریخ سیستان سفرنامہ بلوچستان اور سندھ۔ پٹھان اور بلوچ۔ افغانستان دارا سے امان اللہ تک۔ فارورڈ پالیسی

**میر گل خان نصیر** کوچ و بلوچ۔ تاریخ بلوچستان۔ تاریخ خوانین قلات۔ رزمیہ شاعری بلوچستان قدیم و جدید تاریخ کی روشنی میں۔ بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار۔ عشقیہ شاعری۔

**کامل القادری** مہمات بلوچستان۔ براہوی رسم و رواج۔ بلوچ قبائل۔

| لالہ ہتورام | طاہر بزنجو | بریگیڈیئر عثمان | مسعود بخاری | منیر مری |
|---|---|---|---|---|
| تاریخ بلوچستان | بابائے بلوچستان | بلوچستان رپورتاژ | بلوچستان کی سیاسی تحریکیں | مری بلوچ سیاسی کشمکش |

Afghanistan from Darius to Amanullah. Pashtoon. Gazetteers of Balochistan(2vol). The Notes on Baluch National Struggle. Jirga Laws. Tigers of Balochistan. Unexplored Balochistan. The Frontiers of Balochistan. Notes on Afghanistan and Balochistan. Ahmed Shah Durrani. Afghanistan.

### چند اہم کتابیں

بہشتی زیور۔ تحفہ خواتین۔ فلسفہ افلاطون۔ ساحر سارے سخن۔ کلیات اقبال۔ احمد شاہ دُرانی بلونت سنگھ کے افسانے۔ فلسفہ جبران۔ کلیات ڈیل کارنیگی۔ تین جنگجو سپہ سالار۔ تین مصنف عظیم افسانہ نگاروں کے لافانی افسانے۔ تین عظیم فاتح۔ تین ڈکٹیٹر۔